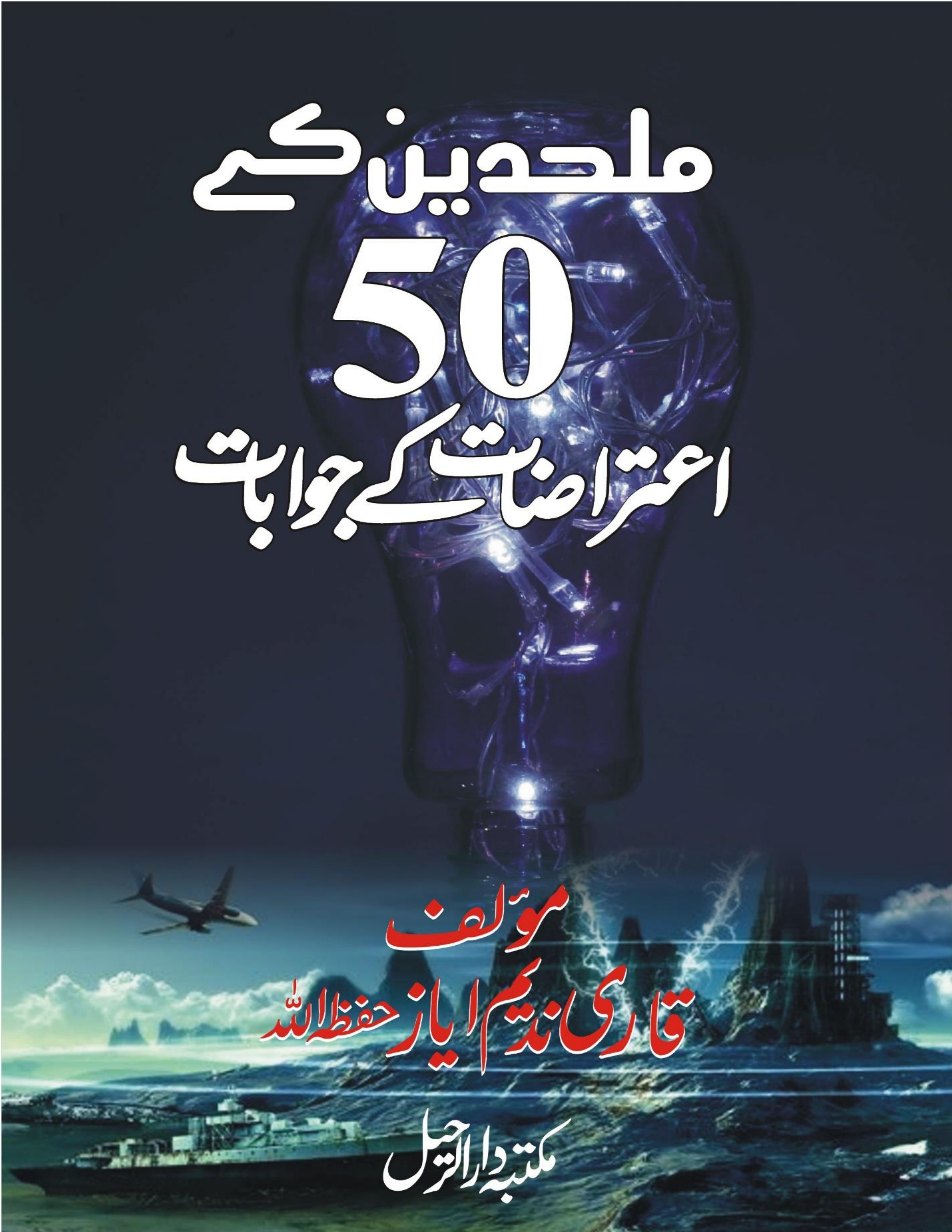

ملحدین کے
50
اعتراضات کے جوابات

مؤلف
قاری ندیم ایاز حفظہ اللہ

مکتبہ دارالرحیل

فہارس

مقدمہ 7

الحاد کی اقسام، اسباب، رد و علاج 10

اسلام دین فطرت ہے تو کیا موجودہ دور میں انسانی فطرت بدل گئی ہے؟ 20

مغرب میں الحاد کی ابتداء کیسے ہوئی؟ 33

مغربی دنیا میں الحاد کے بنیادی اسباب 36

الحاد کو اس قدر فروغ کیوں مل رہا ہے؟ 44

دور حاضر کا الحادی منظر نامہ 51

الحاد کی روک تھام اور بچاؤ کے لئے کرنے کے کام 64

ملحدین کے پچاس اعتراضات اور انکے جوابات 74

معجزے کی سائنسی تشریح 78

معجزہ اور علت و معلول 92

واقعہ معراج اور جدید ذہن کے اشکالات 95

حضرت آدم، عیسی وحوا کی پیدائش کس سائنسی اصول کے تحت ہوئی؟ 109

معجزات کی سائنسی افادیت 113

روح کی حقیقت وماہیت قرآن کی روشنی میں 133

روح کی حقیقت اور احادیث 143

رُوح کیا ہے؟ایک سائنسی نظر 152

روح یا کیمیائی تعاملات 170

روح کا وجود 176

کیا جنات حقیقت ہیں؟... 182

قرآن میں آسمان اور زمین کا ذکر اور جدید سائنسی اصطلاحات.................... 187

زمین وآسمان کی تخلیق چھے ایام میں یا آٹھ.................................. 191

کیا تخلیق سے پہلے زمین وآسمان آپس میں جڑے ہوئے تھے؟..................... 195

قرآن میں شہاب ثاقب کا تذکرہ اور اسکی حقیقت 203

سورج چاند گرہن اور ملحدین.. 207

آفتاب کے زیر عرش سجدہ کرنے کی روایت - تحقیقی جائزہ 212

کائنات محدود یا لا محدود؟ 223

تقدیر کیا ہے؟!! 227

انسان مجبور یا با اختیار؟ مثنوی مولانا روم 235

جب سب کچھ اللہ کی چاہت سے ہوتا ہے تو پھر بندے کو سزا کیوں؟ 239

جب اللہ کو ہر چیز کا علم تھا تو پھر ایسے لوگوں کو پیدا کیوں کیا جو جہنم میں جائیں گے؟ 242

اعتراض آیت 'اللہ جس کو گمراہ کردے اسکو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا' 248

تقدیر اور آزمائش کی بحث 250

آخرت— عقلی دلائل کی ضرورت 253

مسئلہ آخرت - عقلی استدلالات 258

موت کے بعد زندگی 265

خدا نے ہمیں پیدا ہی کیوں کیا؟ ہمارا امتحان لینے کا کیا مقصد؟ 270

کیا رحمن اور رحیم ہونے کا یہ تقاضا نہیں کہ پیدا ہی نہ کیا جاتا یا امتحان نہ لیا جاتا؟ 274

دنیا کی قلیل سی زندگی میں کفر و جرم اور بدلے میں اتنی طویل سزا؟ 277

محدود جرم کی ''لامحدود'' سزا دینا غیر عقلی بات ہے؟(اس اعتراض میں فوکس 'سزا کی لامحدودیت'' پر ہوتا ہے) 280

سزا کا مقصد اصلاح ہوتا ہے، آخرت کی سزا کا مقصد کیا ہے؟ 285

اچھے کام کرنے والے غیر مسلم کو آخرت میں سزا کیوں؟ 287

بیمار اور معذور لوگوں کو بوجہ کفر آخرت میں سزا؟ 288

جدت پسندوں کے ملحدین کیلیے عذر کے دلائل 290

اسٹیون ہاکنگ اور ایمان کے بغیر جنت؟ 295

ملحد کو بھی جنتی کہو ؟ 300

کیا خدا کو نہ مان سکنا ایک عذر ہو سکتا ہے؟ 305

منکر خدا کا انجام 308

کیا جنت میں جانے کیلیئے محمد ﷺ پر ایمان ضروری نہیں؟(اشکال آیت سورۃ البقرہ) 313

محمد ﷺ پر ایمان کو نجات کا واحد آپشن نا ماننا 320

ڈاکٹر روتھ فاو، جنت جہنم کی بحث اور مسلک اعتدال 331

قرآن کا تصور جنت - ایک غلط فہمی کا ازالہ 336

خدا اور اسکی جنت کا مخمصہ 339

اسلام میں حوروں کے فضائل کی غرض وغایت 344

شہید، 72 حورین اور ملحدین 352

حضرت ابراھیمؑ پر فلسفی کانٹ کے اعتراض کا جائزہ 366

مسئلہ قربانی اور غلام احمد پرویز صاحب کے اعتراضات - ایک جائزہ 371

کیا زمین مچھلی کی پیٹھ پر ہے؟ 394

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے " ملحدین کے پچاس اعتراضات کے جوابات " کے عنوان سے اہل علم کے کچھ موضوعات تلاش کر کے مرتب کر دیئے یقیناپڑھنے والوں کواس سے بڑافائدہ ہوگا۔ان شاءاللہ

یہ اس سلسلے میں تیسری تالیف ہے بعد میں اور تالیفات کا اضافہ کیا جائیگا۔آپ حضرات وخواتین ہم سے فیس بک پیج peaceofmind.na کے ذریعے رابطے میں رہئیے تاکہ نئ تالیف کے آنے پر بروقت مطلع ہو سکیں۔

مضامین نگار چونکہ بہت سے ہیں ضروری نہیں کہ ہم یاآپ ان سب سے یاانکی سب باتوں سے متفق ہوں جو بات دلیل کے مطابق ہوں وہ ہم قبول کریں گے مجموعی طور پہ اہل علم کی تحریروں میں خیر ہی غالب ہوتا ہے الحمدللہ۔

کتاب سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ فہرست پڑھئیے اور جو عنوان آپکو پسند آئے وہ مطالعہ کیجئے اور یقینااس فہرست میں کافی دلچسپ عنوانات ہیں۔

آپ حضرات اپنا مشورہ دینا چاہیں تو بلا جھجک رابطہ کریں لیکن خیال رہے کہ صرف میسیج پر ہی غور کیا جائیگا فون پہ بات کرنا ممکن نہیں کیونکہ وقت کی شدید قلت کا سامنا ہے۔

نوٹ: اس تالیف سے مقصد کسی قسم کی دنیوی نفع بالکل نہیں ہے اور نہ ہی یہ برائے فروخت ہے بلکہ بالکل مفت فراہم کی جارہی ہے۔

قاری ندیم ایاز

24 اگست 2021ء

مکتبہ دارالرحیل

www.peaceofmindna.com

00923172134743 whatsapp

peaceofmina.na facebook

الحاد کی اقسام، اسباب، رد و علاج

الحاد کو سمجھنے کی غرض سے ہم اسے کئی قسموں میں بانٹ سکتے ہیں، جیسا کہ علمی الحاد، نفسانی الحاد، نفسیاتی الحاد، معاشرتی الحاد، وغیرہ۔

علمی الحاد بہت ہی نادر ہے کہ جس میں کسی شخص کو علمی طور پر خدا کے وجود کے بارے میں شکوک وشبہات لاحق ہو جائیں۔ اور یہ لوگ دنیا میں گنے چنے ہیں جیسا کہ فلاسفہ اور نظریاتی سائنسدانوں کی جماعت۔ خدا کے بارے میں علمی وسوسہ پیدا ہونا تو عام ہے، جیسا کہ روایات میں ملتا ہے کہ صحابہ ؓ کو بھی وسوسہ پیدا ہو جاتا تھا اور اس وسوسے کے پیدا ہونے کو اللہ کے رسول ﷺ نے عین ایمان قرار دیا ہے۔ (سنن ابی داؤد، ابواب النوم، باب رد الوسوسۃ، المکتبۃ العصریۃ صیدا، بیروت 329/4)۔ لیکن دل میں شک کا گھر کر جانا تو یہ ایمان کے منافی ہے اور یہ عین الحاد ہے اور یہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس کا سارا شرف اسی کو جاتا ہے کہ جو اس خلجان آمیز شک کی آگ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا سبب بنتا ہے۔ اس کے سبب پر کچھ روشنی ہم آگے چل کر ڈالیں گے۔

نفسانی sensual الحاد ہمارے معاشروں میں بڑے پیمانے پر موجود ہے کہ جس میں ایک شخص کو خدا کے وجود کے بارے میں شکوک وشبہات علمی طور پر تو لاحق نہیں ہوتے، بلکہ وہ اپنی خواہش نفس کے سبب خدا کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرتا ہے۔ اس قسم کا ملحد عموماً اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہا

ہوتا ہے اور اپنی خواہش کو علم سمجھ رہا ہوتا ہے۔ دیسی ملحدوں کی بڑی تعداد ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہے۔ خواہش پرست انسان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں موجود ہر رکاوٹ کو ختم کرنا چاہتا ہے، لہٰذا جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ خدا، مذہب اور آخرت کے تصورات اس کی خواہشات کی تکمیل میں اس طرح رکاوٹ بنتے ہیں کہ اس کا ضمیر اسے کچوکے لگا لگا کر تنگ کرتا رہتا ہے تو وہ ضمیر کی اس ملامت سے بچنے کے لیے اپنے زبانی لعن طعن سے اپنے شعور کو اس بات پر قائل کرنے کی ناکام کوشش میں لگ جاتا ہے کہ کوئی خدا، سچا مذہب اور آخرت موجود نہیں ہے۔

نفسیاتی الحاد وہ ہے کہ جس کا سبب انسان کے نفسیاتی مسائل ہوں۔ ہمارے ایک دوست نے الحاد اور دہریت کی طرف مائل ہونے والے لوگوں سے یہ جاننے کی لیے انٹرویوز کیے کہ وہ کس وجہ سے دہریت کی طرف مائل ہوئے۔ اس سروے کے مطابق الحاد کی طرف مائل ہونے کا ایک بڑا سبب مذہبی لوگوں کے غلط رویے بھی ہیں کہ جن کے رد عمل میں بعض لوگ ملحد بن جاتے ہیں۔

علمی الحاد کا سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے فلسفہ، چاہے فلسفہ برائے فلسفہ ہو یا ''فلاسفی آف سائنس'' ہو، قدیم دور اور قرون وسطی middle ages میں الحاد کا سب سے بڑا سبب فلسفہ و منطق تھا، لہٰذا اُس دور میں فلسفہ و منطق کا رد وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ عصر حاضر میں الحاد کا سب سے بڑا سبب نظریاتی سائنس ہے۔ لہٰذا اس دور میں فلسفے کا رد بے معنی اور ''فلاسفی آف سائنس'' کا رد وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اسٹیون ہاکنگ، رچرڈ ڈاکنز اور کارل ساگاں کے دور میں کانٹ اور نطشے کو جواب دینا عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ ہم ذرا اس پر غور کر لیں کہ ہمارے ارد گرد کتنے ملحد ایسے ہیں جو ہمیں ارسطو کی منطق یا کانٹ کی عقل محض سے دلیل دیتے نظر آتے ہیں؟ دو چار بھی نہیں۔ آج کے ملحد وہ ہیں جن کی کل دلیل

بگ بینگ یا ارتقاء وغیرہ کے نظریات ہیں۔ آج اگر ایک ارب سے زائد کسی کتاب کے نسخے فروخت ہوتے ہیں تو وہ اسٹیون ہاکنگ کی کتاب ہے کہ جو اپنی آخری کتاب The Grand Design کے مقدمے میں یہ اعلانِ عام کر چکا ہے کہ فلسفہ مر چکا ہے اور اب ہم سائنسدانوں کے دور میں سانس لے رہے ہیں۔(The Grand Design: p.10)

الحاد کے رد کے بارے میں ایک بات تو یہ ہے کہ الحاد اصلاً ہماری تہذیب کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب سے درآمد شدہ ہے، لہٰذا الحاد کا رد مسلم تہذیبوں میں کوئی مستقل کام نہیں بلکہ ایک عارضی اور وقتی ضرورت ہے۔ آپ کو کوئی دیسی ملحد ایسا نہیں ملے گا کہ جس پر مغرب کا ٹھپہ نہ ہو۔ یہ لوگ اپنی سوچ سے ملحد نہیں بنے بلکہ الحاد ان میں باہر سے انڈیلا گیا ہے، چاہے فلاسفی آف سائنس کے مباحث کے مطالعے کے راستے، چاہے انگریزی ادب کے مطالعے کے راستے، چاہے ہالی وڈ کی فلموں اور موویوں کے راستے، چاہے فلسفہ اور سائنس کی درسی کتابوں کے ذریعے، چاہے معاشرے میں موجود الحاد سے متاثر افراد سے میل جول کے راستے، وغیرہ۔

ہمیں ذہنی اور نفسانی الحاد کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرنا چاہیے۔ ذہنی الحاد کا نفسیاتی جائزہ لیں تو اس بات کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ کثرت سے فلسفیانہ مباحث کا مطالعہ ہے۔ انسان کی ذہنی ساخت کچھ ایسی ہے کہ اگر سارا دن مرغیوں کے بارے میں پڑھے گا تو خواب میں بھی اس کو مرغیاں ہی نظر آئیں گی۔ تو اگر ایک شخص تسلسل سے خدا کے وجود کے بارے میں شکوک وشبہات پر مبنی لٹریچر کا مطالعہ کرے گا یا ٹیلی ویژن سیریز دیکھے گا تو اسے بیداری تو کیا، خواب میں بھی اعتراضات ہی سوجھیں گے۔ تو الحاد انسان کا فطری مسئلہ کبھی بھی نہیں رہا ہے، نہ علمی الحاد اور نہ نفسانی، سب خارجی اسباب کی وجہ سے ہے۔ آپ اس سبب کو تلاش

کر کے دور کر دیں، الحاد ختم ہو جائے گا۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے ہ وجود اور علم کے بارے میں سوالات کا سبب انسان کا فطری تجسس ہے۔ یہ تجسس بھی بڑا سمجھدار ہے کہ انہی کو پیدا ہوا کہ جو فلسفیانہ مباحث کا مطالعہ کر چکے اور فلسفیانہ مجالس میں زندگی کا ایک حصہ گزار چکے تھے، یہ کسی ڈھور ڈنگر چرانے والے دیہاتی کو پیدا نہیں ہوا۔ ایک خاص فلسفیانہ ماحول میں رہنے کے بعد آپ پر جب اس کے اثرات ظاہر ہوں اور آپ کچھ سوالات پر سوچنا شروع کر دیں تو آپ اسے فطرت قرار دے دیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

قرآن مجید الحاد کو علم کے مقابلے میں ظن و تخمین سے زیادہ مقام نہیں دیتا اور فلاسفی کل کی کل ظن و تخمین ہی ہے۔ کیا "فلاسفی آف سائنس" ظن و تخمین نہیں ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ۔ ترجمہ: "اور ان کا کہنا یہ ہے کہ زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہی ہے، ہم زندہ ہوتے ہیں اور مرتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ ہی مارتا ہے، حالانکہ انہیں اس بارے کچھ علم نہیں ہے، وہ صرف ظن و تخمین سے کام لیتے ہیں۔" (الجاثیہ 24)

پھر الحاد کے رد اور اس کے علاج میں بھی فرق ہے۔ الحاد کے رد سے لوگ مسلمان نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ملحدوں کا شر کم ہو جاتا ہے۔ الحاد کے علاج سے مراد یہ ہے کہ ہمارا مقصد ملحدوں کے لاجواب کرنے کی بجائے دین کی طرف راغب کرنا ہے اور علاج میں عقلی و منطقی دلیلیں کم ہی مفید ہوتی ہیں۔ الحاد کا اصل علاج قلبی اور اخلاقی ہے کہ جو نبیوں اور رسولوں کا طریق کار تھا، یعنی صحبت صالحین یا قرآن مجید کی صحبت اختیار کرنا، وغیرہ۔ قرآن مجید کی صحبت سے مراد قرآن مجید سے تعلق کا وہ درجہ کہ جس کے اہل کو حدیث میں "صاحبِ قرآن" کہا گیا ہے۔ یا ملحدوں کو اعلیٰ اخلاق سے قائل کرنا، وغیرہ۔

الہامی کتابوں اور رسولوں کی دعوت میں الحاد کے علاج کا طریقہ کار عقلی و منطقی نہیں بلکہ فطری و قلبی ہے۔ ہماری رائے میں اصولی بات یہی ہے کہ دل پہلے اپنے رب کی طرف جھکتا ہے، ذہن بعد میں اس سے اطمینان حاصل کرتا ہے۔ دل کے جھکنے کے بعد آپ کا ذہن خدا کے انکار کی دلیل کو اس کے وجود کی دلیل بنا کر دکھادے گا۔ ذہن کا کیا ہے، وہ تو کرائے کا ٹٹو ہے، کسی طرف بھی چل پڑے تو اس کے دلائل سمجھنا تو کجا ان کے انبار لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اگر محض عقل و منطق سے کسی کو خدا سمجھ میں آتا تو آدھے سے زیادہ فلسفی مسلمان ہوتے، لیکن نصف تو کجا ہمیں تو پچھلی اڑھائی ہزار سالہ تاریخ فلسفہ میں دو چار بھی نہیں ملتے۔ الہامی کتابوں اور رسولوں کا خدا تک پہنچانے کا طریقہ بہت مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا باہر سے تمہارے ذہن میں نہیں ڈالا جا سکتا، بلکہ تمہارے اندر سے اُگلوایا جائے گا، اور یہ سب صحبت سے ہی نصیب ہوتا ہے۔ اور جو لوگ معاشرے، مدرسے، مذہبی عناصر کے غلط رویوں کے ردِّ عمل میں ملحد بن جاتے ہیں تو ان کا علاج اسی صورت ممکن ہے کہ آپ ان سے دوستی کریں، انہیں دلاسہ دیں، ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں، اعلیٰ اخلاقیات کا مظاہرہ کریں، اور انہیں یہ واضح کریں کہ اسلام اور مسلمان میں بہت فرق ہے۔ اگر کچھ لوگ مذہبی حلیہ اختیار کر کے کسی ناروا حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے اور اس کا سبب ان کا مذہب ہرگز نہیں ہے۔

الحاد کا سبب بعض اوقات آزمائش بھی بتلایا جاتا ہے۔ ایک خاتون پر کوئی آزمائش آئی جو کہ چار سال جاری رہی اور وہ اس دوران اللہ سے اس کے ٹلنے کی دعا کرتی رہیں اور جب وہ آزمائش ختم نہ ہوئی تو انہوں نے بالآخر خدا کا ہی انکار کر دیا اور ملحدہ بن گئیں۔ پس جو لوگ کسی آزمائش کے سبب الحاد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تو انہیں یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ خدا کے انکار سے تمہاری آزمائش ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اور اگر

اس آزمائش کے ختم کرنے میں ہم سے کوئی تعاون بن پڑے تو لازماً کرنا چاہیے کہ ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ ملحدین کی دنیاوی مدد کی صورت میں خدا سے ان کا شکوہ وشکایت جاتی رہی اور وہ دوبارہ ایمان لے آئے۔ اس میں یہ بھی اہم ہے کہ عموماً آزمائش میں دعا نہ سننے کا الزام دے کر خدا کا انکار کر کے انسان بظاہر تو ملحد بن جاتا ہے لیکن اس کا دل اندر سے خدا کا قائل ہی رہتا ہے کہ اس کے انکار کی بنیاد یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ خدا منصف اور عادل نہیں ہے۔ تو وہ خدا کا انکار نہیں بلکہ اس خدا کا انکار کر رہا ہوتا ہے کہ جو اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اور جو خدا اس کے ذہن میں ہوتا ہے، وہ اس کی اپنی شخصیت کا عکس ہوتا ہے کہ جسے وہ خدا سمجھ لیتا ہے۔ خدا دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور دوسرا وہ کہ جسے انسان نے بنایا ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ اور جس خدا کو انسان اپنے تخیل اور تصور میں پیدا کرتا ہے، وہ دراصل اس کی اپنی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ (Alif Shafak , The Forty Rules of Love, USA: Penguin Books Ltd, 2010, p.27)

لٰہذا یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اس خدا کو مانیں کہ جس کا بیان کتاب وسنت میں موجود ہے، نہ کہ وہ جو کہ ہمارے تخیل اور تصور کی پیداوار ہے۔

راقم کی ایک ایسے ملحد سے بھی بحث ہوئی جو کہ دار العلوم کے فارغ التحصیل ہیں۔ ہم عموماً ایسے ملحدین کے اعتراضات کو علمی سمجھ کر انہیں علمی جواب دینا شروع کر دیتے ہیں جبکہ اس بارے میں سب سے پہلا کام جو ہونا چاہیے وہ یہ کہ اس ملحد سے دوستی کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کے مدرسے کی زندگی میں اس کے ساتھ کوئی جسمانی یا جنسی تشدد تو نہیں ہوا؟ مذہبی لوگ اس قسم کے اسباب پر کوئی بات کرنے سے اس لیے بھی گھبراتے ہیں کہ مذہبیوں کی بدنامی ہو گی۔ نہیں، یہ مذہبیوں کی بدنامی نہیں بلکہ اصلاح ہے۔ حضرت

مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کسی نے کہا کہ حضرت داڑھی والوں نے چوریاں شروع کر دی ہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ یوں نہ کہو بلکہ یوں کہو کہ چوروں نے داڑھی رکھ لی ہے۔ لہٰذا اگر کچھ بد فطرت لوگوں نے مذہبی بھیس اوڑھ لیا ہے تو ان کی نشاندہی مذہب پر نقد نہیں بلکہ مذہب کی خیر خواہی ہے۔

کچھ دن پہلے انجینئرنگ کے ایک طالب علم میرے پاس آئے اور بات کا آغاز اس طرح سے کیا کہ سر، میں مذہبی ہوں، میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے، میں نے مسجد میں چار سال اذان دی ہے، میں اب بھی مسجد سے ظہر کی نماز پڑھ کر آ رہا ہوں، لیکن مجھے کائنات کے بارے میں جاننے کا شوق ہوا تو میں نے ''کوسموس'' کے نام سے ایک ٹی وی سیریز دیکھی کہ جس نے خدا کے بارے میں کچھ تشویش میرے ذہن میں پیدا کر دی ہے۔ (کوسموس'' ایک ملحد سائنس دان کارل ساگاں کی تیار کردہ ایک ٹی وی سیریز ہے کہ جس میں کائنات کے آغاز سے لے کر آج تک کے بارے میں نظریاتی سائنس اور سائنس کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض اوقات ایک مخلص مؤمن بھی خدا کے بارے میں کسی شیطانی وسوسے کے سبب یا کسی ملحد کی مغالطہ آمیز گفتگو کے وجہ سے تشویش کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں ہمیں کچھ بہت ہی بنیادی باتیں کرنی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا کا خالق ہونا انسان کی فطرت میں خود خدا نے رکھ دیا ہے۔ (وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ‌ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ‌ ؕ قَالُوۡا بَلٰى‌ ۛۚ شَهِدۡنَا ‌ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ (173)(الاعراف) لہٰذا خدا کے بارے میں شبہہ پیدا ہونا آسانی سے ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے شیطان اور ملحد کو بہت زیادہ اور مسلسل محنت درکار ہے۔ زیادہ تر

ہوتا یہ ہے کہ ایک مخلص مؤمن اپنے مسئلے کا صحیح تجزیہ نہیں کر پاتا کہ جس تشویش کو وہ خدا کے بارے میں شک سمجھ رہا ہوتا ہے وہی دراصل اس کا ایمان ہوتا ہے۔

مثلاً بعض اوقات کائنات اور کوسمولوجی کے بارے میں سائنسدانوں کے نظریات پڑھ سن کر یہ تشویش لاحق ہو سکتی ہے کہ اس بارے میں مذہب اور قرآن مجید جو کچھ بیان کر رہا ہے، سائنس کا علم تو اس کی تائید نہیں کر رہا ہے۔ اب یہ بے چینی اس وجہ سے پیدا نہیں ہوتی کہ خدا کے وجود کے بارے میں شک ہو گیا ہے بلکہ اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ یہ سمجھ نہیں آ رہی ہوتی ہے کہ مذہب اور سائنس، کوسمولوجی کے حاضر علم اور قرآن مجید میں مطابقت کیسے پیدا کی جائے؟ اس کی تشویش کا سبب مذہب اور سائنس میں مطابقت پیدا کرنے کی خواہش رکھنا لیکن اس کی اہلیت نہ ہونا ہے، نہ کہ یہ کہ مؤمن کا دل ملحد کے دلائل سے اطمینان حاصل کر رہا ہے۔ یہ تو پہلی بات ہوئی کہ جس شخص کو خدا کے بارے میں کوئی تشویش لاحق ہو تو وہ پہلے اپنی تشویش کی نوعیت کا گہرائی میں تجزیہ کرے اور پھر علاج کی طرف متوجہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ خدا پر ایمان انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔ (حدیث: انّ اباھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ : مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ، فابواہ یھودانہ، وینصرانہ، او یمجّسانہ، کما تنتج البھیمۃ جمعاء، ھل تحسّون فیھا من جدعاء ثم یقول ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ: فطرت اللہ التی فطر النّاس علیھا، لا تبدیل لخلق اللہ، ذٰلک الدّین القیّم (الروم 30) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب اذا سلم الصبی فمات 95/2۔)

لہٰذا اس میں شک پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ملحد کی حکمت عملی پر غور کریں کہ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو شک میں مبتلا کرنے کے لیے ایک دنیا بناتے ہیں، خیالاتی دنیا (imaginary world)۔ جب آپ ان کی اس تصوراتی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں کہ جس کے بننے، بگڑنے اور قائم رہنے کے تمام اصول وضوابط بھی انہی کے ہوتے ہیں تو یہ دنیا بظاہر خوبصورت لیکن جھوٹی ہوتی ہے۔ آپ اس دنیا سے مسلسل تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کا یقین کرنے لگ جاتے ہیں حالانکہ وہ دنیا صرف آپ کے ذہن میں ہوتی ہے، خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ کمال سب سے پہلے قدیم دور میں سوفسطائیوں نے دکھایا، پھر قرونِ وسطیٰ میں وجودیوں نے اور اب عصر حاضر میں ملحد دکھا رہے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جب آپ الحاد اور دہریت پر مسلسل کتابیں پڑھتے ہیں یا ٹیلی ویژن سیریز دیکھتے ہیں تو آپ اس دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں اور یہاں سے ہی آپ کی تشویش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس تشویش کا آسان اور ابتدائی علاج یہی ہے کہ سب سے پہلے الحاد اور دہریت کا مسلسل مطالعہ یا شب و روز ان کی ٹیلی ویژن سیریز دیکھنا ترک کریں اور حقیقی دنیا میں واپس آنا شروع کریں۔ آپ چاہے اس دوران مذہب کا مطالعہ نہ بھی کریں، صرف آپ دہریت کا مطالعہ یا اس کی سیریز دیکھنا بند کر دیں تو چند دنوں میں آپ بھلے چنگے ہو جائیں گے، کیونکہ آپ ان کی بنائی ہوئی جھوٹی دنیا سے باہر نکل آئیں گے جو انہوں نے صرف اپنی چرب زبانی اور قوتِ فعالیت کے غیر معمولی استعمال سے آپ کے خیالات میں پیدا کر رکھی ہے، لہٰذا آپ کی توجہ ہٹی نہیں، آپ ان کے سحر سے نکل گئے اور ان کی بنائی ہوئی دنیا بھی غائب ہو گئی۔ انسان کس طرح جانتے بوجھتے جھوٹ کو بھی حقیقت سمجھ کر قبول کرنا شروع کر دیتا ہے، اس کا تھوڑا سا اندازہ کسی ایسے جھولے میں بیٹھ کر

ہو سکتا ہے کہ جو آپ کو حرکت کرنے والی کرسی، سامنے لگے پردہ اسکرین اور ساؤنڈ سسٹم کی مدد سے پانچ منٹ میں دیوار چین اور چاند کی سیر کرالاتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ الحاد اور دہریت کوئی علمی مسئلہ نہیں ہے کہ ہم اس کا علمی جواب تلاش کرنے لگ پڑیں۔ خدا کا اس سے بڑا احسان کیا ہے کہ اس نے اپنے وجود کی دلیل میرے اندر رکھ کر مجھے دنیا میں بھیجا ہے۔ خدا پر ایمان کوئی تصور تھوڑا ہی ہے کہ جسے ہم اپنے منطقی دلائل یا جامع ومانع تعریفوں سے مکمل کرلیں۔ خدا کو پالینا تو ایک واقعہ ہے جو کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ تو خدا کے بارے میں تشویش کا مؤثر ترین علاج خدا کا کلام ہے۔ خدا کے وجود کی دلیل بھی وجودی، حالی اور شعوری ہوتی ہے نہ کہ عقلی و منطقی اور فکری۔ ہم کسی تشویش کے لاحق ہونے کی صورت میں تفسیریں پڑھنے کا مشورہ نہیں دے رہے بلکہ یہ کہ فراغت کے لمحات میں، تنہائی میں، اکیلے میں، مکمل خاموشی میں، کسی مکی سورت کے دو چار رکوعوں کا لفظی ترجمہ اردو میں پڑھیں، اور پھر وہی سورت خوبصورت لب ولہجے میں قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کسی عربی قاری کی آواز میں اونچی آواز میں سنیں، آپ مخلص ہیں تو خدا کو پالینے کے لیے ایک دفعہ ہی ایسا کرلینا کافی ہے۔ اب آپ کو خدا کے وجود کے لیے کسی عقلی و منطقی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کی آنکھوں سے جاری ہونے والے آنسو خدا کے وجود کی دلیل بن کر گر رہے ہیں اور آپ کا دل خدا کی محبت میں لپک رہا ہے۔ (وَاِذَا سَمِعُوا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (83 المائدۃ(

تحریر ڈاکٹر زبیر

۲

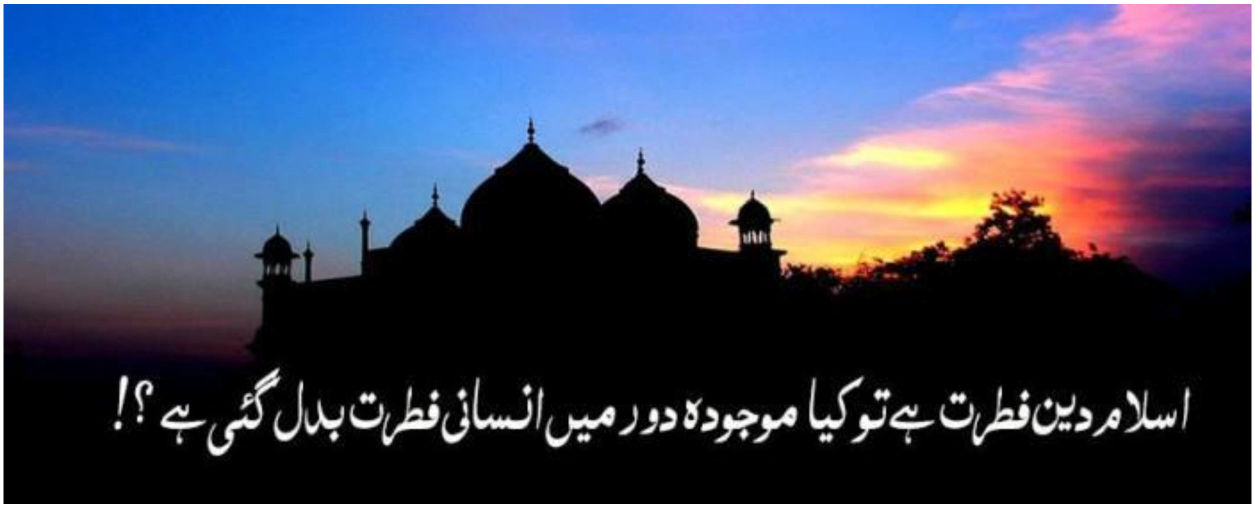

اسلام دین فطرت ہے تو کیا موجودہ دور میں انسانی فطرت بدل گئی ہے ؟

سوال: ہم نے یہ کتابوں میں پڑھا کہ اسلام ایک فطری مذہب ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور میں انسان کی جو فطرت ہے وہ اسلام سے ہٹ اور لوگ اسلام سے ہٹ گئے ہیں۔

جواب: دیکھئے! جس چیز کا نام انسان کی فطرت ہے وہ زمانے کے بدلنے سے بدلا نہیں کرتی وہ ہمیشہ ایک ہی ہے۔آپ کے ذہن میں جو اُلجھن ہے وہ دراصل فطرت کا صحیح مفہوم واضح نہ ہونے کی بناء پر ہے اس لئے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ''فطرت'' کسے کہتے ہیں؟ یہ دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں:

پیدائش، پیدا کرنا، اور انسان کی کسی چیز کے فطری ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو جو جو چیزیں اس کی سرشت میں اس طرح داخل فرمادیں کہ وہ کسی بھی حالت میں اس سے الگ نہ ہو سکیں وہ اس کے فطری اُمور ہیں اور اسلام کے فطری دین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے جتنے عقائد ہیں، جتنی تعلیمات ہیں جتنے احکام ہیں وہ سارے کے سارے انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور کوئی حکم بھی ایسا نہیں جو انسان کے فطری تقاضوں کی بالکلیہ نفی کرتا ہو۔ بلکہ اس کے تمام احکام میں انسانی فطرت کی پوری رعایت موجود ہے۔ مثلاً یہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اسے بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے وہ فطرتاً دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتا ہے اور خاندانی نظام سے مربوط رہ کر زندگی گزارنا اس کا فطری تقاضا ہے، چنانچہ اسلام نے جتنے احکام دیئے وہ اس کے ان فطری اُمور کو مد نظر رکھ کر دیئے اور کوئی حکم ایسا نہیں دیا جو اس کے فطری تقاضوں کو بالکلیہ دبا کر رکھ دے۔

اس کے برعکس عیسائیت کو دیکھئے کہ اس میں ''رہبانیت'' کو قرب خداوندی کا ذریعہ بتایا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک بیوی بچوں، گھر بار اور معاشی کاروبار کو چھوڑ کر جنگل میں نہ جا بیٹھو گے اس وقت تک خدا کی خوشنودی نہیں مل سکتی اس حکم پر انسان اس وقت تک عمل نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے فطری تقاضوں کو بالکل کچل کر نہ رکھ دے۔ اسلام نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔

سوال: مولانا! لیکن موجودہ دور کے انسان کی فطرت تو بظاہر اسلام کے بہت سے احکام سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

جواب: میں اسی بات کو واضح کرنا چاہتا ہوں اور ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی کہ فطرت تو زمانے کے بدلنے سے بدل ہی نہیں سکتی آپ کسی چیز کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ پہلے زمانے میں تو انسانی فطرت تھی، مگر آج نہیں رہی۔ کیونکہ انسانی طبیعت کا جو تقاضا زمانے کے بدلنے سے بدل جائے وہ اس کا فطری تقاضا ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ دراصل دو قسم کی غلط فہمیاں ہوتی ہیں جن سے انسان فطرت کو بدلا ہوا محسوس کرتا ہے، بعض اوقات تو وہ فطرت کے غلط معنی سمجھ کر اپنی بعض عادتوں کو فطرت قرار دے لیتا ہے، حالانکہ عادت اور فطرت میں بڑا فرق ہے، دوسرے بعض اوقات انسان کا فطری تقاضا تو ایک ہوتا ہے لیکن جب انسان اپنے ماحول سے یا فطرت کے خلاف متواتر عمل سے بری طرح متاثر ہو جاتا ہے تو اس کا وہ فطری تقاضا مغلوب ہو جاتا ہے اور اس کو یہ غلط فہمی لگ جاتی ہے کہ وہ فطرت کا تقاضا نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین (یعنی ماحول) اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی انسان پیدا ہوتے ہیں کسی جنگل میں چھوڑ دیا جائے اور وہ جانوروں ہی کی سی عادتیں سیکھ لے اور انہی کے طور طریق اپنا لے تو وہ انسانوں سے متنفر اور جانورں سے مانوس ہو جائے گا، اور تاریخ میں ایسے انسانوں کی مثالیں موجود ہیں کہ وہ جنگل کی زندگی کے اتنے عادی ہو گئے کہ انسانوں اور ان کی بستیوں سے بھاگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی فطرت بدل گئی اور بستی کے بجائے جنگل اور انسانوں کے بجائے جانوروں سے محبت ان کی فطرت بن گئی، بلکہ درحقیقت انسان ہونے کی حیثیت سے ان کی فطرت اب بھی وہی ہے البتہ ماحول کے متواتر اثرات نے فطرت کو مغلوب کر کے رکھ دیا۔

ایک اور مثال لیجئے! انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ رات کو سوئے اور صبح سویرے بیدار ہو، چنانچہ عام طور سے نومولود بچوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کسی تربیت کے بغیر صبح سویرے بیدار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ماحول سے عادت اس کے خلاف پڑی ہوئی ہو تو رفتہ رفتہ ان کی عادت بدل جاتی ہے اور فطری تقاضا مغلوب ہو جاتا ہے، وہ بھی دیر سے اُٹھنے لگتے ہیں۔

سوال: مولانا! یہاں ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ایک شخص کی باڈی کنڈیشن اس قسم کی ہو کہ وہ رات کو دو بجے سوئے اور دن کے آٹھ بجے اُٹھے، اب اس عمل کے دوران اس کی نماز لا محالہ قضا ہو گی، وہ کیا کرے؟

جواب: یہ سوال قدرے غیر متعلق ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی شخص کی باڈی کنڈیشن مستقل طور اس قسم کی ہو سکتی ہے ہاں اگر کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ معذور ہو اور اپنی تمام ممکنہ کوششوں کے باوجود وہ صبح کو سویرے نہیں اُٹھ سکتا تو جب تک یہ معذوری باقی ہے اسلام کا حکم یہ ہو گا کہ جب بھی بیدار ہو جائو اسی وقت نماز پڑھ لو، لیکن تمام حالات میں سویرے اُٹھنے کی عادت ڈالو۔

سوال: مگر مولانا سوال یہ تھا کہ ایک شخص کی فطرت ہی یہ ہو گئی کہ وہ دیر سے اُٹھے پھر اسے جلدی بیدار ہونے کا حکم دینا خلافِ فطرت کیوں نہیں ہوا؟

جواب: یہاں آپ پھر ''فطرت'' اور ''عادت'' کو خلط ملط کر رہے ہیں میں اس کو دوسری طرح واضح کر دوں۔ فطرت انسان کے ان تقاضوں کو کہتے ہیں جو بحیثیت نسل انسانی (Human Race) اس کی سرشت میں داخل ہوئی، یہ تقاضے تمام انسان میں یکساں ہوتے ہیں بدلتے نہیں۔ دوسری ایک چیز ہے جسے عادت کہتے ہیں اور جسے آپ انگریزی میں (Habit) کہتے ہیں وہ مختلف انسانوں کی مختلف ہو سکتی ہے

اور اس میں تبدیلی بھی ممکن ہے اور اسلام نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ وہ ہر انسان کی ہر عادت کے مطابق ہو گا لہٰذا جو شخص دیر سے اُٹھنے کا عادی ہے اگر وہ کسی ناگزیر مجبوری کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے تو اس کی عادت فطرت انسانی کے خلاف ہے جسے بدلنا چاہیے۔

سوال: مولانا! یہ بات تو سمجھ میں آگئی لیکن اب ایک سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام فطری دین ہے تو اس کے بعض احکام پر عمل کرنے میں دشواری کیوں معلوم ہوتی ہے؟

جواب: دیکھئے! کسی فطری کام کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوئی دشواری نہ ہو۔ مثال کے طور پر کمانا جو ہے وہ بھی انسان کی فطرت کا ایک تقاضا ہے کہ وہ اپنی مادی ضروریات کو حاصل کرے مگر اس مادی ضرورت کو حاصل کرنے کے لئے کچھ محنت کرنا پڑے گی، کچھ مشقت اُٹھانا پڑے گی۔ تو اس تکلیف اور مشقت کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ عمل فطرت کے خلاف ہے تو جو چیز فطرت کے مطابق ہوتی ہے خود اس کے حصول کے لئے بعض اوقات کچھ محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے تو اس کی پریکٹس کرنے میں متعلقہ دشواری بھی ہوتی ہے یہ دشواری فطرت کے خلاف نہیں، ہاں ایسی دشواری جو انسان کے لئے ناقابل برداشت ہو اور جس کو انسان اختیار نہ کر سکے اس کی طاقت سے باہر ہو تو اگر ایسی دشواری ہو تو کہا جائے گا کہ یہ اس کی فطرت کے خلاف دشواری ہے تو ایسی دشواری اسلام کے اندر دیکھنے میں نہیں آتی۔ اسلام نے جو احکام دیئے ہیں ان میں بعض اوقات تھوڑی بہت تکلیف بھی ہو گی، تھوڑی بہت محنت اور مشقت بھی برداشت کرنا پڑے گی۔ لیکن وہ محنت بذاتِ خود فطرت کا ایک جزء ہے اور اگر اس محنت کو انسان کی فطرت سے نکال دیا جائے تو انسان کچھ رہے گا ہی نہیں۔ البتہ محنت برداشت سے باہر نہیں ہوتی اور معمولی توجہ اور عادت ڈالنے سے آسان ہو جاتی ہے اس کے علاوہ غلطی کرنا بھی انسان کی

فطرت میں ہے چنانچہ اسلام نے اس کی رعایت کی ہے کہ جب غلطی ہو جائے توبہ کرلو کوئی گرفت نہ ہو گی۔

سوال: ایک چیز ہے مولانا صاحب! اگر آپ نے جو تعلیم حاصل کی ریسرچ کیا اور خود بھی عمل کیا، اسلام کو فطری مذہب کے لحاظ سے پرکھا۔ اگر آپ کے فطرے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے اور باقی تمام مذاہب کو سامنے رکھا جائے تو کیا آپ کے لحاظ سے جو چیزیں فطرت کے عین مطابق ہیں وہ چیزیں دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتیں اگر پائی جاتی ہیں تو وہ بھی فطری مذہب ہوئے۔

جواب: یہ بڑا اچھا سوال آپ نے کیا۔ اصل میں فطری مذہب ہونے کا مطلب میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ اس کا کوئی حکم ایسا نہ ہو اس کا کوئی عقیدہ ایسا نہ ہو جو انسان کی فطری تقاضوں کے خلاف ہو اور انسان کے فطری تقاضوں کو ختم کرتا ہو۔ اب اگر فرض کیجئے کہ کوئی مذہب اپنایا جاتا ہے کہ جس کے بعض احکام ایسے ہیں جو انسان کی فطرت کے مطابق ہیں لیکن بعض احکام ایسے ہیں جو انسان کی فطرت کے خلاف ہیں تو پھر اس مذہب کو فطری نہیں کہا جائے گا مثال کے طور پر عیسائیت کے لے لیجئے کہ اس کے بہت سے احکام ایسے ہیں جو انسان کی فطرت کے مطابق ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کا ہر حکم انسان کی فطرت کے خلاف ہے لیکن بعض احکام ایسے ہیں جو فطرت کے خلاف ہیں مثلاً یہی کہ جتنا دنیا سے کٹ کر رہو گے جنگل میں جا کر بیٹھ جائو، کھانا کمانا چھوڑ دو، رہبانیت اختیار کر و تو اس کے بغیر خدا کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔ تو یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ (قطع کلامی معاف) عیسائی مذہب تو ویسے بھی ابھی نامکمل ہے۔ کیوں کہ انھوں نے دوسری دفعہ تشریف لانا ہے اس لیے ابھی تک مکمل نہیں ہوا؟

جواب: اس کے علاوہ یہ کہ انسان کا یہ فطری حق ہے کہ جس بات پر وہ عقیدہ رکھے وہ عقل کے خلاف نہیں ہونا چاہیے لیکن عیسائیت آپ دیکھیں کہ ان کا سب سے بنیادی عقیدہ یہ ہے تین ایک کا اس پر اگر کہا جائے کہ عقل سے سمجھا جائے کہ تین اور ایک کیسے ایک ہو سکتے ہیں تین تو تین اور ایک تو ایک ہے تو وہ اس کا جواب نہیں دیتے کہ یہ ایک سربستہ راز ہے خدائی راز ہے اس کے اندر ہمیں سوچنے کی گنجایش نہیں عقل کا دروازہ وہاں پر بند ہے میں یہ نہیں کہتا کہ انسان کو اپنی زندگی کے ہر معاملے میں عقل سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ میں اس کے بہت خلاف ہوں کہ ہر انسان کو ہر معاملہ میں عقل سے رہنمائی مل سکتی ہے لیکن یہ کہ اس کے جو بنیادی عقائد ہیں جس کے اوپر اس کی زندگی کی عمارت کھڑی ہو گی ان بنیادی عقائد کے بارے میں اس کا فطری حق ہیکہ وہ اپنی عقل سے اس کو صحیح سمجھے اور اس کو عقل کے مطابق ثابت کر سکے۔

سوال: ایک چیز ہے مولانا صاحب آپ نے یہ جو کہا کہ عقل کی رہنمائی کوئی ضروری نہیں کہ ہر معاملہ میں ملے تو اگر عقل کی رہنمائی نہیں مل سکتی تو معلوم ہوا کہ وہ غیر فطری چیز ہے۔ کیوں کہ عقل اور فطرت میرے خیال سے دونوں لازم وملزم چیز ہیں۔

جواب: نہیں یہ بہت اچھا سوال ہے میں اس کو ذرا تفصیل سے بیان کروں گا اور اس کو ذرا سمجھنے کی ضرورت ہے اور بہت ٹھنڈے دل سے کہ عقل اور فطرت دونوں ایک نہیں ہیں دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ بلکہ انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں عقل کی پیروی نہ کرے ہر معاملے میں عقل کے پیچھے نہ پڑے یہ بات آپ کو شاید ہی معلوم ہو۔ مگر میں اس کی تشریح کرتا ہوں۔ دیکھئے ان کے پاس علم کے جتنے بھی ذرایع ہیں وہ مختلف قسم کے ہیں۔ مثلاً ایک علم کا ذریعہ جو اس خمسہ میں پانچ حواس آنکھ سیکان ہے ناک ہے ہاتھ ہے وغیرہ اس کے ذریعہ ہم معلوم کر لیتے ہیں آنکھ سے دیکھ کر کان سے سن کر ناک سے سونگھ

کر ہاتھ سے چھو کر معلوم کرلی۔ حواس خمسہ کا ایک مخصوص دایرہ ہے اور اس میں ہر ایک کی تقسیم کار ہے۔ اور ہر ایک کے کام بھی دوسرے سے مختلف ہیں۔ آنکھ دیکھ سکتی ہے سن نہیں سکتی۔ کان سن سکتا ہے دیکھ نہیں سکتا۔ ہاتھ چھو سکتا ہے مگر اس سے چل نہیں سکتے۔ تو ان حواس کے مخصوص دائرے ہیں کہ جس کے اندر وہ کام کرتے ہیں۔ اس دائرے سے باہر وہ کام نہیں کرتے۔ پھر ان حواس خمسہ مجموعہ کا بھی ایک دائرہ ہے کہ اس سے آگے چل کر وہ خواس خمسہ کام نہیں دیں گے مثلاً یہ کہ اب میں آنکھ سے دیوار تک دیکھ سکتا ہوں دیوار کے پار میں ان حواس خمسہ کام نہیں لے سکتا۔ لیکن ان حواس خمسہ کے دائرے سے آگے کیے ہمیں ایک ذریعہ علم دیا گیا۔ اور وہ ہے عقل کہ جب ہمیں یہ دروازہ نظر آرہا ہے تو لازم ہماری عقل یہ رہنمائی کرے گی کہ اس دیوار کے ادھر کوئی جگہ موجود ہے کوئی زمین ہے کوئی کمرہ ہے کوئی صحن ہے اگرچہ ہم حواس سے وہ چیز معلوم نہیں کر سکتے۔ تو جہاں حواس خمسہ کا دائرہ ختم ہوتا ہے وہاں سے عقل کا دائر شروع ہوتا ہے۔

سوال: نہیں مولانا صاحب! ایک بات سنیں آپ نے ابھی کہا کہ ہمیں کسی چیز کو سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت نہیں۔

جواب: نہیں میں نے یہ بھی نہیں کہا۔ میں اپنی پوری بات واضح کر دوں پھر آپ کہیں یعنی میں نے یہ عرض نہیں کیا کہ انسان کو سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت نہیں۔ نہ میں نے یہ کہا کہ حواس خمسہ کی ان سب میں سے کوئی بات نہیں ہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ علم جو انسان کو حاصل ہوتا ہے علم نہ صرف حواس خمسہ سے حاصل ہوتا ہے نہ صرف عقل سے حاصل ہو سکتا ہے یعنی اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرلے جتنا بھی علم مجھے حاصل ہو گا وہ سارا عقل کی بنیاد پر ہو گا۔ تو وہ بھی غلط ہے اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ جتنا بھی علم مجھے

حاصل ہو گا وہ صرف حواس خمسہ کی بناء پر حاصل ہو گا۔ تو یہ بھی غلط ہے بلکہ علم کے مختلف ذرائع انسان کے پاس ہیں۔ ایک ذریعہ حواس خمسہ ہیں کچھ باتیں ہمیں حواس خمسہ سے حاصل ہوتیہیں لیکن یہ حواس خمسہ سے جو باتیں حاصل ہوتی ہیں ان کا ایک محدود دائرہ ہے اس کے اندر وہ ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ اور ہمیں علم بخشتے ہیں۔ اس دائرے سے باہر جا کر حواس خمسہ ہمیں کام نہیں دیتے وہاں ہمیں ضرورت پڑتی ہے عقل کی۔ جہاں حواس خمسہ ختم ہو جاتے ہیں وہاں ہمیں عقل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ہم عقل سے بہت سی چیزیں معلوم کرتے ہیں۔ جو حواس خمسہ سے نہیں معلوم کر سکتے تو عقل اس جگہ پر کام دیتی ہے جہاں حواس خمسہ کام کرتا چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اب عقل کے ذریعہ آپ حواس خمسہ کی چیزیں معلوم کرنا چاہیں تو یہ نہیں ہو سکتا۔

سوال: یہ بات واضح نہ ہو سکی؟

جواب: مثلاً میں بتاؤں! یہ شربت ہے یہ سرخ رنگ کا ہے یہ علم ہمیں حاصل ہوا تو کس چیز سے حاصل ہوا آنکھ کے ذریعہ شربت کی سرخی کا علم ہوا۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ آنکھ تو کر لو بند اور اب عقل سے بتاؤ کہ اس کا رنگ سرخ ہے یا سبز ہے، آنکھ تو بند کر لیں اور صرف عقل سے اس کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو کبھی معلوم نہیں ہو سکتا۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز کا علم عقل سے نہیں ہو سکتا بلکہ سب سے قریب ترین ذریعہ حواس ہے اس کے بعد دوسرا ذریعہ انسان کے پاس عقل ہے۔ جہاں عقل اور حواس خمسہ میں تضاد ہو جائے کہ حواس خمسہ ایک بات کہہ رہے ہیں اور عقل دوسری بات تو اس وقت آپ کیا کریں گے؟

سوال: یہ غیر فطری عمل ہے۔

جواب: تو ظاہر ہے کہ عقل نے جو نتیجہ نکالا وہ صحیح نہیں کیوں کہ حواس خمسہ جو علم دے رہے ہیں۔ وہ زیادہ یقینی ہے تو جہاں پر عقلوں میں لوگوں کے درمیان تفاوت ہو جاتا ہے کہ ایک شخص نے ایک نتیجہ نکالا اور دوسرے نے دوسرا نتیجہ تو اب جس نتیجہ کی حواس خمسہ تائید کرتے ہوں گے اس کو قبول کر لیا جائے گا۔ اور جس کی مخالفت کرتے ہوں گے اس کو ردّ کر دیا جائے گا، لیکن حواس خمسہ کی رہنمائی جس طرح محدود ہے اسی طرح عقل کی رہنمائی بھی محدود ہے کہ وہ بھی ایک جگہ پر جا کر رک جاتی ہے۔ اور اس کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں دائرہ شروع ہوتا ہے وحی کا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کا۔ جو کہ انبیاء کرام کے ذریعہ دی جاتی ہے تو یہ دائرہ جو شروع ہوتا ہے وہاں سے جہاں سے عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے اور عقل کی پرواز ختم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نری اور صرف عقل کی بنیاد پر اس چیز کا ادراک نہیں کر سکتے۔ وہ ہمیں وحی کے ذریعہ بتائی جاتی ہے۔

سوال: اگر وہ حکم عقل کی سوچ کی بناء پر واضح ہو مگر وحی کا حکم اس سے بالکل متضاد ہو۔ اس وقت کیا کریں گے؟

جواب: وہ وحی نہیں ہو گی بلکہ کچھ اور ہو گا جس طرح میں نے بتایا کہ حواس خمسہ کے خلاف عقل کہہ رہی ہو تو آپ عقل کو چھوڑ دیں گے۔ کہیں گے کہ یہ عقل کا تقاضہ نہیں ہے۔ غلط نتیجہ نکالا۔ اسی طرح کوئی وحی کے نام سے ایسی بات پیش کرتا ہے جو عقل کے خلاف ہے تو عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے کہا جائے گا کہ وہ وحی ہے ہی نہیں وہ تو کچھ اور ہو گا جیسے کہ ابھی میں نے پہلے عرض کیا کہ تین ایک اور ایک تین گویا

معمہ ہے کہ کہا جائے کہ تین کو ایک مان لیا اور ایک کو تین ماننے کھلی ہوئی عقل کے خلاف ہے کوئی بھی عقل قبول نہیں کر سکتی۔ اس لیے کوئی یہ کہے کہ یہ وحی ہے تو وہ غلط کہتا ہے۔

لیکن ایک بات یاد رکھیے اور وہ یہ کہ وحی عقل کے خلاف تو نہیں ہو سکتی مگر ایسی چیزوں پر مشتمل ہو سکتی ہے جو عقل کی پرواز سے باہر ہو وہ دو چیزوں میں فرق ہوتا ہے۔ ایک تو ہوتا ہے عقل کے خلاف ہونا اور ایک ہوتا ہے ماورائے عقل۔ دراصل دونوں میں خلط ملط کرنے سے ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوتی ہے، عقل کے خلاف اس چیز کو کہیں گے کہ اس کے ماننے سے کوئی عقلی محال لازم آجائے اور عقل اس کے باطل ہونے پر دلیل دیتی ہو۔ اس کو خلاف عقل کہتے ہیں انگریزی میں Impossible کہتے ہیں اور ایک ہوتا ہے، ماورائے عقل یعنی عقل کے پاس اس کے باطل کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، لیکن اس کو ثابت کرنے کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کو اس کی نظیر نہیں ملتی، اس لیے اس کو وہ اجنبی چیز محسوس ہوتی ہے اور حیرت انگیز بات لگتی ہے جسے آپ Improbable کہہ سکتے ہیں، چوں کہ عقل کو اس بات پر تجربہ نہیں ہوتا۔ اس واسطہ اس کو عجیب سے معلوم ہوتی ہے، اس لیے نہ اس کے پاس اس کے اثبات کا ذریعہ تو دونوں میں بہت فرق ہے Impossible الگ اور Improbable الگ۔ اب یہ ہوتا ہے کہ وحی کی طرف سے کوئی ایسی بات تو نہیں کہہ جا سکتی جو کہ Impossible ہو یعنی عقل کی دلیل کے خلاف لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ وحی مبین کوئی ایسی بات ہو جو کہ Improbable یعنی عقل کی پرواز سے اوپر ہو اور وہ بالکل عین فطری بات ہے جس طرح پر کہ میں نے کہا کہ حواس خمسہ کے دائرہ کے بعد عقل کا دائرہ شروع ہوتا ہے کہ جس چیز کا حواس خمسہ ادراک نہیں کر سکتے، عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے تو اسی طرح جس چیز کا عقل ادراک نہیں کر سکتی، اور اس کا دائرہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، وہاں عقل سے نہیں پہنچا

جاسکتا ہے اور وحی اس کا علم عطا کرتی ہے، اگرچہ وہ بعض اوقات اچنبھی معلوم ہوتی ہے، بعض اوقات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات اجنبی سی لگتی ہے۔

مثال کے طور پر وحی نے ہمیں بتایا کہ اوپر آسمان ہے اب ہمارے حواس خمسہ تو آسمان کو نہیں دیکھتے اور عقل اس تک نہیں پہنچتی، ہمیں جو نظر آرہا ہے یہ تو آسمان نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ حد نگاہ ہے جو ہمیں نیلا نیلا نظر آتا ہے تو اس واسطے موجودہ بہت سے سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ آسمان ہے ہی نہیں جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ آسمان کا وجود نہیں ہے تو یہ بات نہیں ہے کہ آسمان کے نہ ہونے کے وجود پر کوئی دلیل قائم ہو گئی ہے کہ یعنی دلیل ان کو مل گئی ہے جس کی بناء پر وہ ثابت نہیں ہوا یا یہ کہ اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم کر دی ہو، ایسا نہیں ہوا تو اس واسطے اگر وحی یہ کہتی ہے کہ آسمان ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہمیں نظر نہیں آرہا، نہ آنکھوں سے نظر آتا ہے، نہ ہماری عقل کہتی ہے کہ یہ کوئی ضروری چیز ہے کہ آسمان ہو، لیکن ساتھ ہی عقل کے اعتبار سے وہ کوئی دلیل بھی ایسی قائم نہیں کر سکتے جس کی بناء پر یہ کہا جائے کہ آسمان موجود نہیں ہو سکتا، ممکن نہیں اور آسمان کا وجود Impossible ہے آسمان کا وجود نہیں ہے۔ ہاں یہ کہ ہماری اپروچ (پہنچ) وہاں نہیں ہو سکتی، ہو سکتا ہے کہ بعد میں اپروچ ہو جائے یہاں پر اس قسم کی کوئی بات ہے تو وہ حواس خمسہ یا عقل کے ماوراء کوئی بات ہے، لیکن عقل اس کے عدم وجود پر کوئی دلیل نہ پیش کر سکی۔

مفتی تقی عثمانی

۳

مغرب میں الحاد کی ابتداء کیسے ہوئی؟

اسلام کی پوری تاریخ کے اندر، اسلام کو ان دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو یورپ کو انکے غلط عقیدے کی وجہ سے کرنا پڑیں۔ بہت اہم مشکلات میں سے ایک مذہب اور سائنس کے درمیان خوفناک اختلافات تھے۔ مذہب اس بے رحمی کیساتھ سائنس سے جا ٹکرایا کہ کلیسا نے بہت سے سائنسدانوں کو زندہ جلا دیا اس بنا پر کہ وہ انکی کتاب کے خلاف چل رہے تھے۔

اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے پورے یورپ میں ایک ہلچل مچا دی۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے مفادات کلیسا سے وابستہ تھے، سب کے سب کلیسا سے نفرت کرنے لگے اور نفرت و عداوت کے اس جوش میں بد قسمتی سے انھوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہ و بالا کر دینے کا تہیہ کر لیا... چنانچہ غصے میں آ کر وہ ہدایتِ الٰہی کے باغی ہو گئے۔

گویااہلِ کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کش مکش شروع ہوئی، جس میں چڑاور ضد سے بہک کر 'تبدیلی' کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے۔اوراس طویل کش مکش کے بعد مغرب میں تہذیب الحاد (Secular) کا دور دورہ شروع ہوا۔

اس تحریک کے علم برداروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو اس بنیاد پر کھڑا کیا کہ دنیا میں جو کچھ ہے، وہ صرف مادہ ہے۔ نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور اور فکر سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ تہذیبِ جدید کے معماروں نے اسی فلسفے کو سامنے رکھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی۔ ہر تحریک جس کا آغاز اس مفروضے پر کیا گیا کہ کوئی خدا نہیں، کوئی الہامی ہدایت نہیں، کوئی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق نہیں، کوئی حشر نہیں اور کوئی جواب دہی نہیں، ترقی پسند تحریک کہلائی۔اس طرح یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق واجتماع، علم وادب، حکومت وسیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں الحاد اس پر پوری طرح غالب آگیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہوا اور ابتدا میں تو اس کی رفتار بہت سُست تھی لیکن آہستہ آہستہ اس طوفان نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوسری طرف اسلام کی تاریخ میں آپکو ایسا کچھ نہیں ملتا۔اسلام نے ہمیشہ سائنسی تحقیقات کیلئے دروازے کھلے رکھے ہیں اور دانشورانہ سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ سائنسدان عموماً بہت سے خلفاء کے دربار اور اسمبلیوں میں خصوصی مہمان ہوتے اور انکی سرپرستی میں شاہی تحائف اور مراعات کا ایک منصفانہ حصہ وصول کرتے۔

مسلم دنیا کی اپنی طویل تاریخ میں کبھی بھی سائنسدانوں کو اس ظلم و ستم، پابندیوں اور جانچ-پڑتال کا سامنا نہیں کرنا پڑا جیسا کہ یورپ میں انکے ساتھ ہوا۔ چرچ نے مذہب کے نام پر لوگوں کیساتھ جو برا برتاؤ کیا،

انکے مال کا ایک بڑا حصہ ان سے چھین لینا، انکی دانشورانہ زندگیوں کو محدود کر دیا، مفکروں اور سائنسدانوں کو زندہ جلا دیا، اسلام کو کبھی ان خرابیوں سے نہیں گزرنا پڑا۔ اسکے بر عکس، مسلمان تاریخ میں سائنس اور مذہب کے درمیان دوستی دیکھنے کو ملتی ہے کہ پہلی وحی ہی ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تمہیں پیدا کیا'' ہے۔ سائنس اسلام ہی کے دئے گئے ثمرات میں سے ایک ہے۔

آج کی سائنس اللہ کے حکم؛ پڑھنے، سیکھنے سکھانے اور غور و فکر، بجا لانے کا ہی نتیجہ ہے۔ وہ لوگ جو سیکولرزم کو مسلم دنیا میں لانے کے خواہاں ہیں، اسلامی دنیا کی مذہبی تاریخ اور یورپ کی مذہبی تاریخ کے اس بڑے فرق کو نظرانداز کرتے ہیں جہاں سے سیکولرزم نے جنم لیا۔

مستفاد:

شیخ سلمان بن فہد العودہ کی ایک انگریزی تحریر سے اقتباس

انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام'، عبد الحمید ایم اے،

۴

مغربی دنیامیں الحاد کے بنیادی اسباب

عصر حاضر میں الحاد کا دقت نظر سے تجزیاتی و تحلیلی مطالعہ کرنے کی بہت ضرورت ہے،اس سلسلے میں ملحدین کے پھیلائے ہوئے جزوی شبہات و اعتراضات (جو اگرچہ بذات خود ایک اہم کام ہے) کی بجائے الحاد کی اساسیات اور اس کے متنوع اسباب پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔یعنی سب سے پہلے یہ بات کہ وہ کونسے اسباب ہیں جن کی بناپر ایک شخص یا گروہ الحاد اختیار کرتا ہے۔الحاد کے اسباب ایک تو جغرافیہ بدلنے سے بدل جاتے ہیں، مغربی دنیا میں الحاد میں مبتلاء ہونے کے اسباب الگ ہیں جبکہ اسلامی دنیا میں اسلام کو چھوڑ کر الحاد اپنانے کی وجوہات بالکل علیحدہ ہیں۔اس کے علاوہ خود شخصیات کی علمی،ذہنی،نفسیاتی اور عقلی سطح کے اعتبار سے بھی الحاد کے مختلف اسباب بن جاتے ہیں۔اسی طرح الحاد کی اساسیات کا تجزیہ بھی ضروری ہے،کہ وہ کونسے بنیادی امور و دعاوی ہیں، جن پر ملحدین کی دعوت الحاد کھڑی ہے،ان امور کا ماخذ و مصدر کیا ہے، نیز الحاد کی ان ''ایمانیات'' کے بارے میں معاصر جملہ ملحدین کا نقطہ نظر ایک ہے یاالگ الگ۔

اس وقت پوری دنیا میں نت نئے نظریات وافکار کا ماخذ و منبع ''خطہ مغرب'' ہے،اور فکر و نظر کے حوالے سے مغرب وہ شجرہ خبیثہ ہے، جس کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔(''مغربی دوست''اس پر چیں بہ جبیں نہ ہوں، مغرب کی انسانیت بخش ایجادات کا ہمیں بھی اقرار ہے،البتہ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ان ایجادات پر لگنے والے سرمایہ کے لیے''سونے کی کس کس چڑیا''کو شکار کیا گیا). ''جدید الحاد''(دنیا میں دہریوں کا وجود ہر معاشرے میں کچھ نہ کچھ رہا ہے ،پر یہاں معاصر نظریہ الحاد کی بات ہورہی ہے) بھی مغرب کی دین ہے،اور وہاں سے یہ نظریہ پوری دنیا میں کاپی کیا گیا۔اس لیے ہم اولین مغربی دنیا میں الحاد کے پھیلنے کے بنیادی اسباب وعلل پر مختصرا بات کریں گے ۔اس سے بقیہ دنیا خصوصا اسلامی دنیا میں الحاد کی وجوہ جاننے میں معاونت ملے گی۔

مغربی الحاد کا اگر تجزیہ کیا جائے تواس کے تین بڑے سبب سامنے آتے ہیں:

ا۔ مغرب میں عیسایئت کی بطور مذہب کے شکست کے بعد جدید فلسفیانہ افکار جدیدیت،مابعد جدیدیت اور سوشل سائنسز کی کھوکھ سے الحاد نے جنم لیا۔ان ملحدین کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے۔اسلام کی پوری تاریخ کے اندر، اسلام کو ان دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو یورپ کو انکے غلط عقیدے کی وجہ سے کرنا پڑیں۔ بہت اہم مشکلات میں سے ایک مذہب اور سائنس کے درمیان خوفناک اختلافات تھے۔ مذہب اس بے رحمی کیساتھ سائنس سے جا ٹکرایا کہ کلیسا نے بہت سے سائنسدانوں کو زندہ جلادیا اس بنا پر کہ وہ انکی کتاب کے خلاف چل رہے تھے۔اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے پورے یورپ میں ایک ہلچل مچادی۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے مفادات کلیسا سے وابستہ تھے، سب کے سب کلیسا سے

نفرت کرنے لگے اور نفرت وعداوت کے اس جوش میں بد قسمتی سے انھوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہ و بالا کر دینے کا تہیہ کر لیا... چنانچہ غصے میں آکر وہ ہدایتِ الٰہی کے باغی ہو گئے۔

گویا اہلِ کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کش مکش شروع ہوئی، جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر 'تبدیلی' کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے۔ اور اس طویل کش مکش کے بعد مغرب میں تہذیب الحاد (Secular) کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس تحریک کے علم برداروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو اس بنیاد پر کھڑا کیا کہ دنیا میں جو کچھ ہے، وہ صرف مادہ ہے۔ نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور اور فکر سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ تہذیبِ جدید کے معماروں نے اسی فلسفے کو سامنے رکھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی۔ ہر تحریک جس کا آغاز اس مفروضے پر کیا گیا کہ کوئی خدا نہیں، کوئی الہامی ہدایت نہیں، کوئی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق نہیں، کوئی حشر نہیں اور کوئی جواب دہی نہیں، ترقی پسند تحریک کہلائی۔ اس طرح یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم وادب، حکومت و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں الحاد اس پر پوری طرح غالب آگیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہوا اور ابتدا میں تو اس کی رفتار بہت سُست تھی لیکن آہستہ آہستہ اس طوفان نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ (شیخ سلمان بن فہد العودہ)

مغرب میں صدیوں مذہب کو حکمرانی حاصل تھی، لیکن اس حکمرانی نے انہیں اس دور کے پسماندہ ترین قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا، اسی لیے خود مغرب اپنے اس دور کو "dark ages" یعنی "تاریک زمانہ" کہتا ہے۔ سولہویں صدی سے جب مذہب سے آزادی کی تحریک "اصلاح مذہب" کی شکل میں

شروع ہوئی، جو آہستہ آہستہ مذہب کے کلی انخلا پر منتج ہوئی، اس وقت سے مغرب ترقی کی شاہراہ پر چڑھ گیا ،اور اب تک تسلسل کے ساتھ روز بروز آگے بڑھ رہا ہے۔اس پورے تاریخی عمل سے مغربی اہل علم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہب ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔اور یوں مذہب و خدا دنیا کا کلی انکار سامنے آیا۔اس راستے پر چل کر جو لوگ الحاد کا شکار ہوئے، ان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو انہوں نے عیسائیت کی شکست کو ''مذہب'' کی شکست کے مترادف سمجھا، حالانکہ کسی خاص مذہب کی ناکامی کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مذہب نام کی ہر قسم ناکام ہو گئی۔دوسرا دنیا کے دیگر مذاہب خصوصا اسلام کا گہرا مطالعہ اور اسلام کی ہزار سال کی تاریخ سے مکمل واقفیت نہیں تھی۔اور اگر کوئی واقفیت تھی بھی، تو مستشرقین کے واسطے سے تھی ،اور مستشرقین کا ''اسلامی سرمایہ'' اسلام کی بجائے اینٹی اسلام کو اپنے پہلو میں لیے ہوئے ہے، اس لیے محض عیسائیت کی شکست سے انہوں نے یہ سمجھا کہ اب مذہب اور خدا کا دور ختم ہو گیا۔

اس الحاد کے شکار لوگوں نے جب بھی بالغ نظری سے اسلام کا مطالعہ کیا، تو انہوں نے اسلام کو گلے لگایا۔آج جو مغربی دنیا میں اسلام جوق در جوق پھیل رہا ہے، ان میں سے بڑی تعداد ''سابق ملحدین'' کی ہیں۔کہ جب ان کے سامنے اسلام کی صحیح شکل سامنے آئی، تو بلا جھجک اسے قبول کیا۔یاد رہے کہ عموما لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ''عیسائی مذہب کے پیروکار'' نے اسلام قبول کیا، حالانکہ وہاں کے صحیح ''مذہبی آدمی'' کو اسلام سے اتنی ہی نفرت ہے، جیسے کہ ایک کٹر اور بنیاد پرست مسلمان کو عیسایئت سے۔۔۔مغرب میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا سبب وہاں کا ''الحاد'' ہی ہے۔آج بھی اگر مغرب کے ایک ''ملحد'' کے سامنے سنجیدہ ،شستہ، علمی و عقلی انداز سے اسلام کو پیش کیا جائے، تو وہ اسے فورا قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔پر مسئلہ یہ

ہے کہ آج کی علمی زبان اور اصطلاحات میں اسلام کو مغربی دنیا کے سامنے کتنا پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے، امت مسلمہ کے تمام طبقات کا المیہ، جملہ مکاتب فکر کا المیہ۔۔

2۔ مغربی دنیا میں الحاد کے پھیلنے کا دوسرا بڑا سبب علوم فلسفہ سے حد سے زیادہ اعتناء اور وسیع پیمانے پر فلسفیانہ افکار کی بازگشت ہے۔ کلیسا سے آزادی حاصل کرتے ہی مغربی اداروں میں ''علمی سیلاب'' آیا اور خاص طور پر ''اندلس مرحوم'' کے اسلامی علمی ذخیرے کی مغربی زبانوں میں منتقلی اس کا سبب بنی، اندلس کے ''مکتب ابن رشد'' کا سارا فلسفیانہ لٹریچر مغربی دنیا میں پھیلا۔ اس کے علاوہ خود بھی مغربی دنیا میں متنوع علوم خصوصا فلسفیانہ علوم سے شغف کی ایک فضا پیدا ہوئی، اور فلسفے کی ایک خاصیت ہے کہ یہ حاضر ومحسوس کا گرویدہ اور ''غائب ومستور'' سے بیگانہ کرتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے بڑے اور ٹھیٹھ فلاسفہ کے افکار کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو بہت کم خوش قسمت ایسے ملیں گے، جن کے افکار میں ''الحادی جراثیم'' نہ ہوں، اسلام کے زمانہ عروج میں ''تہافت الفلسفہ'' جیسی کاوشوں کا سبب یہی ''جراثیم'' ہی بنے۔ خالص فلسفیوں کو ایک طرف رکھ دیں، اصولی و دینی علوم کے ماہرین میں سے جس نے فلسفہ کو زیادہ پڑھا، وہاں بھی اس کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس کی مثال ہماری تاریخ میں ''اعتزال کا مکتب'' ہے۔۔ حق شاید ان دونوں کے درمیان ہے کہ نہ تو علوم عقلیہ پر کلیسا کی طرح مکمل پابندی سے مسئلہ حل ہو گا اور نہ جدید ذہن کی طرح اساسیات مذہب کو بھی تشکیک کی بھٹی سے گزارنے سے فائدہ ہو گا۔۔ ماضی میں ماتریدی مکتب عقل ونقل کے حسین امتزاج کے حوالے سے بہترین مثال ہے۔

اس قسم کے شکار ملحدین کا حل ''غزالی کی روش'' ہے۔ان ملحدین کا فلسفہ پر ایمان اسی وقت متزلزل ہو گا جب کوئی ''غزالی وقت''فلسفہ کے محل پر ''تہافت الفلسفہ'' کے مجنیقوں سے ''سنگ باری'' کرے گا۔ اس لیے ہمارے راسخ العقیدہ لوگوں کو فلسفہ مغرب سے واقفیت حاصل کرنا ہو گی ۔ اس حوالے سے ''انصاری سکول آف تھاٹ''(ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب اوران کے تلامذہ ومتوسلین سید خالد جامعی ،عبد الوہاب سوری، علی محمد رضوی، مولانا ظفر اقبال اور زاہد مغل صاحب) یہ کام کر سکتا ہے، اگران کی توجہ ''اسلامی مفکرین کی ٹھوکروں کی نشاندہی''(جو بذات خود ایک اہم کام ہے) سے ذرا آگے بڑھ کر براہ راست مغربی فلسفہ کی ''نارسائی'' پر مرکوز ہو جائے۔اس سلسلے مین مغرب کی ریاستی قوت کا غیر معمولی جبر بھی ایک چیلنج ہے۔جب تک یہ ختم نہیں ہوتا، محض فکری کام اس ساری مہم کا ایک جز ہو گا۔یونانی فکر کی طرف سے ہمیں کوئی تہذیبی چیلنج نہیں تھاجب کہ آج اس تہذیبی چلینچ کے ریلے میں ہر خاص وعام بہ رہا ہے، حتی کے ہم میں سے بہت سے وہ لوگ بھی ''مغربی'' ہیں جو ''مشرقی'' کہلاتے ہیں اور یہ مزاجی سانچے کسی فلسفے نے نہیں بنائے بلکہ تہذیبی بالادستی نے بنائے ہیں۔

3۔مغربی دنیا میں الحاد کا تیسرا سبب چند دہائیوں سے نہایت تیزی سے مقبول ہوتا'' فلسفہ مابعد جدیدیت'' ہے۔مابعد جدیدیت کا فلسفہ ''جدیدیت'' کے رد عمل کے طور پر وجود میں آیا۔ جدیدیت انسان کے کبر جبکہ مابعد جدیدیت اس پر ڈھٹائی کا اظہار ہے۔جدیدیت میں انسان کو یہ غرور ہو چلا تھا کہ میں حقیقت وغیرہ خود اپنے بل بوتے پر تلاش کرلوں گا۔مابعد جدیدیت نے عاجزی کا اظہار کرکے یہ نہیں کہا کہ ہم حقیقت نھیں جان سکتے (جس سے چلو نبی کی گنجائش پیدا ہو جائے) بلکہ وہ یہ کہتی ہے کہ یہ

حقیقت، سچ، اقدار وغیرہ سب ٹوپی ڈرامہ ہے، ایسا کچھ ہے ہی نھیں۔ یہ سرکشی سے بھی آگے کی ڈھٹائی ہے۔

مابعد جدیدیت کی تعریف ایک فلسفی لیوٹارڈ کے الفاظ میں ''مابعد جدیدیت عظیم بیانات پر عدم یقین'' ہے۔مابعد جدیدیت کے علمبرادروں کے نزدیک اس دنیا میں اصول ، نظریات ،روایات ،اقدار،افکار ،آدرشوں اور سچائی و حقیقت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے،اور نہ ہی دنیا میں آفاقی سچائی اور حقیقت مطلقہ کا کوئی وجود ہے،یہ سب چیزیں اضافی ہیں،اضافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سچائی، حقیقت اور حق و خیر کا تعلق محض انفرادی پسند وناپسند کے ساتھ ہے۔ہر شخص کی سچائی،ہر شخص کا خیر اور ہر شخص کا حق الگ الگ ہے۔اس لئے آفاقی سچائی کا تصور محض ایک دعوی اور دیومالائی داستان ہے۔مابعد جدیدیت کے فلسفے کا اثر یہ ہے کہ آج کے انسان کی دلچسپی محض اپنے احساسات، جذبات اور عملی مسائل کے ساتھ محدود ہو کر رہ گئی ہے،آج کے انسان کے نزدیک زندگی کی تمام بحثیں مسئلہ اور حل کا نام ہیں،افکار، نظریات اور آیئڈیالوجی کے مباحث محض نظری ہیں۔جن کا عملی زندگی کی تشکیل اور مسائل کے حل میں کوئی کردار نہیں ہیں ۔آج کے انسان کے نزدیک اصول، نظریات،اقدار ،روایات وافکار ماضی کی باتیں ہیں۔اس لئے بعض مفکرین نے موجودہ دور کو ''عدم نظریہ کا عہد'' کہا ہے۔جبکہ مذہب (خواہ جو بھی ہو) کی بنیاد ہی مخصوص نظریات، خاص افکار، متعین آدرشوں اور محدود خیالات وتصورات پر ہوتی ہے۔اس لیے مسئلہ اور حل کے خوگر آج کے انسان کے نزدیک مذہب کے عقائد و نظریات ''دیومالائی داستانیں''ہیں۔مابعد جدیدیت کا فلسفہ بعض وجوہ سے تحریک تنویر، تحریک رومانیت اور مغرب سے پھوٹنے والی پچھلی دو صدیوں کی دیگر فلسفیانہ تحریکوں کی بنیاد پر قائم ''جدیدیت'' سے زیادہ خطرناک ہے۔مابعد جدیدیت کا اثر صرف مذہب پر

نہیں پڑا،ادب ، ثقافت ، صحافت ، سیاست حتیٰ کے تعلیم تک پر اس کے اثرات پڑے۔آج اگر ریٹنگ کے چکر میں ہمارے ٹی وی چینل اقدار ، روایات ،اخلاق بلکہ بسا اوقات ملکی قانون کو پامال کرتے ہیں، ہمارے سیاستدان ''چڑھتے سورج کے پجاری''بن گئے ہیں،اور سال میں دو دو پارٹیاں بدلتے ہیں، ہمارے صحافی و کالم نگار ایک سال میں بسا اوقات تمام اخباروں کا چکر کاٹ کر واپس پہلے اخبار تک پہنچ جاتے ہیں، ہمارے ہاں تعلیم کی ''خرید و فروخت ''کا بازار گرم ہے،اور حالت یہ ہوگئی ہے کہ معاشرہ ایک دیانت دار صحافی ، کھرے سیاستدان، نظریاتی کالم نگار اور ایک مخلص ٹیچر و پروفیسر کو اس حوالے سے ''احمق '' سمجھتا ہے کہ اس نے اصولوں ، نظریات اور ذہن میں موجود خیالات و تصورات کی بنا پر مال ،دولت اور عزت کو ٹھکرایا ۔آج بھی اچھے خاصے پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کا ذہن یہ ہے کہ معاشرے کا کامیاب فرد وہی ہے، جس نے دو چار روپیہ کمایا،ایکا اچھی سی کوٹھی کھڑی کی،اونچے عہدوں تک پہنچ گیا،اور زندگی میں لذت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کیے،تو وہ ''کامیاب '' شخص ہے،خواہ اس کے لیے اس نے نظریات،اصولوں اور اپنے رسوم و روایات کو مکمل طور پر ہی ذبح کیوں نہ کیا ہو۔یہ سب فلسفہ مابعد جدیدیت کا تباہ کن اثرات ہیں ۔

استفادہ تحریر: سمیع اللہ سعدی

۵

الحاد کو اس قدر فروغ کیوں مل رہا ہے؟

چونکہ الحاد سے مراد انکارِ خدا ہے، اس لیے اس کے فروغ کا روحانی زندگی کی موت و انحطاط کے ساتھ گہرا تعلق ہے، تاہم اس کے پھیلنے کے اس کے سوا اور بھی اسباب ہیں۔ فکری سطح پر الحاد خدا کے وجود سے انکار اور اسے قبول نہ کرنے سے عبارت ہے۔ نظری طور پر یہ مادر پدر آزادی کا نام ہے اور عملی طور پر یہ اباحیت کا علمبردار ہے۔ فکری سطح پر الحاد کے پھیلنے کا سبب نوجوان نسل کی تربیت میں غفلت اور علمی اداروں میں غلط پالیسیوں کی عملداری ہے، علاوہ ازیں اسے بعض دیگر اقدامات سے بھی تیزی اور تقویت ملی ہے۔

الحاد کو سب سے زیادہ فروغ ایسے معاشرے میں ملتا ہے، جہاں (دینی) جہالت کی حکمرانی ہوتی ہے اور روحانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ روحانی اور قلبی تربیت سے محروم عوام جلد یا بدیر الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں اور عنایت خداوندی کے بغیر اپنے آپ کو الحاد کے چنگل سے نہیں نکال سکتے۔ جب امت مسلمہ بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے افراد کی ایمانی ضروریات پوری کرنے کا خصوصی اہتمام نہیں کرتی اور

انہیں جہالت کی تاریکی میں بے یار و مدد گار چھوڑ دیتی ہے تو ایسے افراد کسی بھی قسم کے افکار کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں الحاد کا اظہار ایمان کے بنیادی اصولوں کے بارے میں لاپروائی برتنے اور عدم اہتمام کا اظہار کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ آزادئ فکر کا لبادہ اوڑھے ہوئے یہ طرز عمل جیسے ہی انکارِ خدا اور الحاد کے حق میں کوئی چھوٹی سی نشانی پاتا ہے، الحاد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگرچہ الحاد کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات غفلت، لاپروائی اور غلط اندازہ الحاد کے پیدا ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں بہت سے لوگ اس قسم کے اسباب کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

لیکن دوسری طرف خوش قسمتی سے بعض ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جو ہمارے فکر و احساس کو مجروح کرنے والے اس قسم کے سوالات کا جواب دے کر ہماری روحانی بیماریوں کا علاج کرتی ہیں۔ آج مشرق و مغرب میں مختلف زبانوں میں فطرت اور اسباب کے حقیقی چہرے سے پردہ اٹھانے والی سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

جہاں ہمیں اپنے ہاں بعض مغرب زدہ لوگوں کی لکھی ہوئی گمراہ کن کتابوں پر تعجب ہوتا ہے، وہیں یہ بات باعث اطمینان بھی ہے کہ مغرب میں ''ہم خدا پر ایمان کیوں رکھتے ہیں؟'' جس کی تصنیف میں متعدد مغربی سائنسدانوں نے حصہ لیا ہے، ایسی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو اِن مغرب زدہ لوگوں کے اعتراضات کا جواب فراہم کرتی ہیں۔ (گزشتہ دنوں ہمارے پیج سے مشہور مسلم فلسفی حمزہ اینڈرئیس کی

کتاب ڈیوائن رئیلٹی کا ترجمہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اسکے علاوہ بہت سے عیسائی سائنسدانوں کی اس موضوع پر نادر تحقیقات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔)

علمی حلقوں میں اس موضوع پر اس قدر وضاحت کے پائے جانے کے بعد اب الحاد کو محض نفسیاتی بگاڑ، ہٹ دھرمی، بغیر دلائل کے تسلیم کیا جانے والا فکر اور بچگانہ خیال سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے بعض نوجوان زمانے بھر سے مسترد شدہ بعض افکار کے منفی اثرات سے پوری طرح محفوظ نہیں ہیں، بلکہ انہیں علمی حقائق سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صحیح علمی اور روحانی تربیت نہیں پائی۔

یہی وجہ ہے کہ صحیح علوم کی اشاعت کے لیے علمی اور تربیتی تیاری وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی معاشرے کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنے گی۔ شاید سالہا سال سے معاشرہ جن مصائب کا شکار ہے، ان کی بنیادی وجہ یہی غفلت و کوتاہی ہے، کیونکہ ہم تعلیم کے عشق سے سرشار، علم و روح اور دل و دماغ کے جامع اور دونوں اعتبار سے ممتاز مرشدوں سے محروم ہیں۔ ہم حقیقی مرشدوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس اہم ترین بنیادی انسانی فریضے کی ادائیگی کی ذمہ داری اٹھائیں گے اور ہمیں ان مصائب سے نجات دلائیں گے، جن میں ہم ایک زمانے سے مبتلا ہیں، تب جدید نسل کے افکار و خیالات اور احساسات میں ٹھہراؤ پیدا ہوگا، وہ غلط افکار کے سیلاب میں بہنے اور تذبذب کا شکار ہونے سے محفوظ رہے گی اور الحاد کے خلاف اس کے ہاتھ میں ہتھیار آئے گا۔

حاصل یہ کہ فکری الحاد جہالت، تجزیہ و تحلیل کی صلاحیت سے محرومی اور روحانی و قلبی تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے، کیونکہ انسان جس چیز سے آشنا ہوتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور جس چیز سے ناواقف ہوتا ہے

اس سے عداوت رکھتا ہے۔ ہمیں کتب خانوں میں رکھی کتابوں پر ایک نظر ڈالنی چاہیے اور ان افکار و شخصیات کا جائزہ لینا چاہیے، جنہیں یہ کتابیں پیش کرتی ہیں، تب ہمیں پتا چلے گا کہ گلیوں میں پھرتے بچے اپنے لباس میں "ریڈ انڈینز" اور "زورو(Zorro)"سے اور نوجوان "ڈان جان Don) " (Juonسے کیوں مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ جس حقیقت کی ہم وضاحت کرنا چاہتے ہیں یہ اس کی صرف دو ایک مثالیں ہیں۔ اگر ہم اپنے معاشرے کو معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے تباہ کرنے والے دیگر عناصر کا جائزہ لیں تو صورت حال کی ہولناکی سے سارا جسم کانپ اٹھتا ہے۔ ہمارے ہم وطن ایک عرصے سے ان لوگوں کے پیچھے چل رہے ہیں، جن سے انہیں محبت ہے اور جنہیں ان کے سامنے آئیڈیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، لیکن جنہیں وہ نہیں جانتے ان سے نہ صرف وہ نامانوس ہیں، بلکہ وہ ان کے بارے میں معاندانہ جذبات رکھتے ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان امور کے بارے میں سوچیں، جنہیں ہمیں ان کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ ہماری یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ہم انہیں فارغ اور بے مہار نہ چھوڑیں، بلکہ ان کی روشنی کے راستے کی طرف راہنمائی کریں۔

نوجوان نسل کے الحاد کی طرف مائل ہونے اور انکار خدا کے فروغ پانے کا دوسرا سبب نوجوانوں کی فطرت ہے۔ یہ بات تیس چالیس سال پہلے کے (ملک) ترکی کے لحاظ سے درست ہے، کیونکہ اس دور میں نوجوان نسل دینی تعلیم کے بغیر پروان چڑھی تھی۔ ان نوجوانوں کی لامتناہی خواہشات مادر پدر آزادی چاہتی ہیں۔ اس قسم کے غیر معتدل رجحانات الحاد سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کہتے ہیں: "ہم معمولی سی فوری لذت کی خاطر مستقبل میں آنے والی بہت سی تکالیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔" اس طرح

وہ اپنے لیے دردناک انجام کا سامان فراہم کرتے ہیں اور شیطان کی پیش کردہ موہومہ لذات سے دھوکا کھا کر الحاد کے جال میں ایسے پھنستے ہیں، جیسے آگ کے گرد گردش کرتے پتنگے اس میں جا گرتے ہیں۔

جس قدر جہالت اور روحانی و قلبی انحطاط بڑھتا ہے، اسی قدر جسمانی لذتیں آسانی سے روحانی جذبات پر قابو پا لیتی ہیں اور جس طرح ڈاکٹر ''فوسٹس (Dr Faustus) ''نے اپنی روح شیطان کے سپرد کر دی تھی، اسی طرح نوجوان اپنے دل شیطان کو دے بیٹھتے ہیں۔ جب روح مردہ، دل تہی دامن اور عقل پراگندہ ہو جاتی ہے تو الحاد کی راہ ہموار ہو جاتی ہے، جبکہ دوسری طرف عقیدہ، احساسِ ذمہ داری اور تہذیب و تربیت سے آراستہ دل و جان نوجوانوں کی بیداری کی ضمانت فراہم کرتے ہیں، بصورتِ دیگر جس معاشرے میں شیطان کو دلوں پر کنٹرول حاصل ہو جائے، وہ معاشرہ ایک بے بنیاد بات سے دوسری بے بنیاد بات کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے، اپنے ہی منبر و محراب کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، ہر نئے فلسفے کو نجات دہندہ سمجھ کر اس کے پیچھے چل پڑتا ہے اور اس سے فکری غذا حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس کی آغوش میں ڈال دیتا ہے۔ جب وہ صبح بیدار ہوتا ہے تو بدامنی اور افراتفری پھیلا دیتا ہے، دوپہر کے وقت سوشلزم کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہو جاتا ہے، شام ڈھلے ''فلسفہ وجودیت ''کا احیا کرتا ہے اور رات کو ہٹلر کے گن گاتا ہے، لیکن اسے اپنی روح کے سوتوں، اپنی قوم کے برگ و بار، تہذیب و ثقافت اور روح کی طرف دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

جس نسل کا فکری بگاڑ اس حد تک پہنچ چکا ہو، اس کے لیے خواہشات و لذات کے چنگل سے آزاد ہونا مشکل ہوتا ہے اور اس کے ذہن اور فکر کو صحیح رخ پر ڈالنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے، لہٰذا نئی نسل میں درست انداز سے سوچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے آج تک ہماری بقا اور معاشرے کے لیے بنیادی

حیثیت رکھنے والے افکار کی اصطلاحات کو منظم انداز میں اس تک پہنچانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، بصورت دیگر ہم جسمانی لذتوں میں ڈوبے رہیں گے اور ہماری حالت وہی ہو گی، جو شاعر محمد عاکف نے بیان کی ہے:

''اگر وہ کہیں کہ معاشرہ مردہ جذبات کے ساتھ اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتا ہے تو ان کی تصدیق نہ کرنا۔ مجھے کوئی ایک ایسا معاشرہ تو دکھاؤ جو مردہ جذبات کے ساتھ قائم رہ سکا ہوا۔''

الحاد کے فروغ کا ایک اور سبب اباحی (سیکولر) فکر ہے، جس میں ہر چیز کو مباح اور قابل استفادہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ فکر موقع ولذت پرستی پر مبنی ہے۔ آج اس فکر کو ایک منظم فکری اور فلسفیانہ قالب میں ڈھالنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ فکر سب سے پہلے فرائیڈ کے ''نظریہ لبیڈو (Libido)'' کا لبادہ اوڑھ کر آئی اور مسلمانوں کی شرم وحیا کے مفہوم کو بگاڑ دیا۔ اس کے بعد جان پال سارتر اور البیر کامیو (Albert Camus) کے وجودی فلسفے نے ہمارے ہاں زور پکڑا اور شرم وحیا کی عمارت کو مسمار کر کے رہے سہے اثرات کو بھی مٹا دیا۔

انسانیت کے لیے باعث ننگ وعار اس فلسفے میں انسانیت کی حیثیت ردی کی سی ہے، لیکن اس کے باوجود اسے انسان کا حقیقی رُخ ظاہر کرنے والے فلسفے کی حیثیت سے نئی نسل کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یورپ اور اس کی تقلید کرنے والے ممالک کے نوجوان اس فلسفے کی طرف ایسے دوڑے جیسے انہیں ہپناٹائیزڈ (Hypnotized) کر دیا گیا ہو۔ انسانیت یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ اشتراکی فلسفے کے نتیجے میں فرد کی جو قدر ومنزلت کم ہوئی ہے، وجودی فلسفہ اسے اس کی کھوئی ہوئی قدر ومنزلت واپس دلائے گا، جس کے

نتیجے میں انسانیت کا درخت از سر نو پھلنے پھولنے لگے گا، لیکن ہائے افسوس! انسانیت نہ جان سکی کہ وہ ایک بار پھر دھوکے کا شکار ہو گئی ہے۔

چونکہ ایمان باللہ اور حلال و حرام کے مفاہیم اس قدر بگڑی ہوئی نسل کے لذت پرستانہ فلسفے کے ساتھ میل نہیں کھاتے، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حشاشین کے سربراہ حسن الصباح کی پرفریب جنت میں رہنے کی خواہش مند یہ نسل اپنے آپ کو الحاد کی آغوش میں دے دیتی ہے۔ ہم نے یہ خیالات مستقبل کے صاحب بصیرت منتظمین، مرشدین اور اساتذہ کے غور و فکر کے لیے بیان کیے ہیں، تاکہ وہ الحاد کے سیلاب پر بند باندھ سکیں، تاہم ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ بے راہ روی اور گمراہی کے صرف یہی اسباب ہیں، نیز الحاد کی روک تھام کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر بھی ان میں محصور نہیں۔ ہماری آرزو ہے کہ امت مسلمہ دور حاضر میں خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر رشد و ہدایت کی طرف لوٹ آئے۔

تحریر فتح اللہ گولن

٦

دور حاضر کاالحادی منظر نامہ

مغربی الحادی فکر نے ہماری عوام بلکہ پوری اقوام دنیاپر یلغار کی۔ ہمارے نوجوانوں کے سینوں کوان کے خالق کے خلاف آلودہ اور پراگندہ کیا۔ دینِ اسلام کے مخالف ان کے دلوں کو کینہ سے بھر دیا۔ انہیں ان کی نرم و ملائم فطرت سے بیگانہ کر دیا۔ اسلام، مسلمان اور قرآن کریم کے ساتھ ملحدوں کی شدید عداوت کی وجہ سے تمام مادہ پرست گروہوں اور ان کے ہم نوادوستوں نے ہمارے عقیدہ کو عبث اور بیکار قرار دیناشروع کر دیا ۔اس سب کے پیچھے ان کا اصل ہدف اس دینِ حنیف کے ارکان میں ارتعاش وضعف پیدا کرنا، اسے بد نما و بد شکل قرار دینااور اس کے نشاناتِ راہ کو مسخ کرنا' ہے۔ یہ ملحدین اور بے دین اپنے مقصد وہدف کو پانے کے لیے مختلف طریقوں کو بطور منہج اپناتے ہیں۔ کبھی مکر وفریب کے لبادہ میں، کبھی دھوکہ وتدلیس کے پردہ میں اور بیشتر تو یہ لالچ اور دھمکی کے ساتھ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہوتاہے وہ ان ملحدوں کے تابع بن جاتے ہیں۔ دراصل یہی لوگ مغربی تہذیب اور

اس کی بے حقیقت اور دھوکہ باز چمک دمک سے حیران و ششدر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ الحاد زندگی میں امرِ واقع بن گیا ہے جسے ٹی وی چینلز پھیلاتے ہیں اور انٹرنیٹ کے صفحات فروغ دیتے ہیں؛ اسی لیے براہِ راست اس کی حقیقت کو عیاں کرنا، اس سے برتاؤ اور علاج کے طریقوں پر خصوصی توجہ کی اشد ضرورت ہے۔

☆الحاد کا مطلب

دراصل الحاد(Atheism) درست راستے سے ہٹ کر ظلم، جور اور جدال کی جانب میلان کا نام ہے ۔مثلا عربی میں لحدَ، اَلحدَ، اِلحادًا کے الفاظ اس شخص کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جو ظلم، زیادتی اور جدال کے جانب جائے۔ ملحدین(Atheists) سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کائنات کے خالق اور ربّ کا انکار کیا۔ جو اس کائنات میں تصرف کرنے والا ہے؛ جس کے علم اور حکمت سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے؛ جس کے ارادہ و قدرت کے ساتھ اس کائنات کے واقعات و حادثات پیش آتے ہیں۔ ملحدین سمجھتے ہیں: کہ کائنات یا اس کا مادہ ازلی ہے؛ کائنات کے تغیرات امرِ اتفاقی کے تحت طے پاتے ہیں یا مادہ کی طبیعت اور اس کے قوانین کے تقاضوں کے تحت پورے ہوتے ہیں؛ زندگی اور زندگی کے تابع فکر و شعور ایسی سب چیزیں مادہ کی ذاتی ترقی کا نتیجہ ہیں۔) ا(

☆معاصر الحاد کی تاریخ، ابتداء وارتقاء

درحقیقت کوئی متعین تاریخ نہیں ملتی جس سے الحاد و بے دینی کی اساس کے بارے میں معلوم ہو سکے کہ اس کی ابتداء فلاں تاریخ سے ہوئی۔ یہ تاریخ میں دیگر امور کے روبرو اپنے طور پر نمودار ہو جانے والا ایک طفیلی فتنہ ہے۔ جس کی کوئی پائیدار جڑیں اور اساسیات نہیں پائی جاتیں حتی کہ نہ قدیم یونانی سوفسطائیوں کے ہاں؛

نہ ابیقور کے ہاں اور نہ والٹیر کے ہاں۔ الحاد ایک مستقل فلسفہ کی طرح ہے۔ جس کی پوری تاریخ میں کوئی بنیاد نہیں ملتی۔ اس لیے یونانی مؤرّخ کہتا ہے: ”تاریخ میں قلعے، محلات اور درس گاہوں کے بغیر شہروں کے وجود پائے گئے ہیں مگر تاریخ میں عبادت گاہوں سے خالی شہر کبھی نہیں پائے گئے۔“

ہمارے جدید زمانہ میں معاصر الحاد کے ظہور کے لیے متعین تاریخ مکمل ضبط کے ساتھ بتانا' مشکل ہے۔ لیکن مغربی مؤرخین میں سے اغلب بتاتے ہیں کہ معاصر الحاد کی ابتداء 1789ء میں باسٹل قلعہ کی قید ڈھانے کے بعد انقلابِ فرانس کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔ البتہ یہ الحاد عالمی سطح پر بالفعل 1917ء کے انقلاب کے پیچھے پیچھے نمودار ہوا' جب روس میں قانون سازی کے لیے بلاشفہ (اکثریت) کو پہنچ حاصل ہوگئی۔ لیکن معمولی انصاف کے ساتھ ہی یہ بات ہم پر عیاں ہو جاتی ہے کہ بلاشفہ (اکثریت) بھی عملاً ملحدین ہی تھے جنھوں نے دین سے چو مکھی لڑائی لڑی۔ یکم جنوری 1956ء کو ٹائم اخبار کے نشر کردہ پرچہ میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ سویت یونین میں 1917ء میں گرجا گھروں کی تعداد 46ہزار تھی۔ جبکہ یہ تعداد 1956ء تک کم ہو کر 4ہزار رہ گئی۔ ہاں البتہ کمیونسٹ بلاشفہ (اکثریت) کا الحاد جتنا سیاسی تھا اتنا علمی، فلسفیانہ اور فکری نہ تھا۔ کیونکہ مارکس کے نظریہ کے مطابق دین ایک بالائی عمارت کا نام ہے۔ جس میں فکر ، معاشرت، سیاست، رسوم ورواج اور اخلاقی اقدار موجود ہوتے ہیں۔ جبکہ مارکسی معاشرہ کے لیے معیشت واقتصاد ایک نچلی عمارت ہوتی ہے۔ تمام بالائی عمارتیں دراصل اس نچلی عمارت کا عکس ہوتی ہیں۔ نچلی عمارت کے بغیر اکیلی بالائی عمارت کبھی وجود نہیں رکھتی۔ مارکس کی مراد یہ ہے کہ دین ایک عارضی عامل اور باعث ہے۔ جو آئندہ مرحلہ میں مکمل طور پر زائل ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ مارکس کے لوگوں کی ادارت میں اقتصادی عامل باقی رہ جائیگا۔ اس لیے پوری دنیا میں ملحدین کی تعداد کے اکثر اعداد وشمار بالکل بکواس اور سطحی

ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی مملکت جب اشتراکی حکومت ہونے کا اعلان کرتی ہے، تو گراف کے جداول میں اس مملکت کے شہریوں کی تعداد دین کے خانہ سے بے دینی اور الحاد کی طرف خود بخود تبدیل ہو جاتی ہے یہی چیز ہے جس کی جانب صاموئیل نے اشارہ کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب (صدام الحضارات) ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' کے صفحہ 108 پر لکھتا ہے: ''پوری دنیا کے ملحدین میں سے تقریباً 92 فیصد چینی بنتے ہیں۔ کیونکہ جب کمیونزم چین میں آیا تو پوری دنیا میں اہلِ دین کے لیے کیے گئے اعداد و شمار کے سروے میں تمام غیر سامی اصحابِ ادیان ملحدوں اور لادینوں کی جانب خود بخود منتقل ہو گئے۔'' یہ ایک جبری اور نامناسب تبدیلی و منتقلی ہے (۲)۔

☆ حالیہ الحاد و بے دینی کے اسباب

1۔ یورپی گرجا اور تحریف شدہ عیسائیت کی دینداری: جس نے خرافات کو پھیلایا اور تجرباتی علم اور سائنسی ایجادات سے جنگ مول لی۔

2۔ سرمایہ دارانہ معیشت کی یلغار: جس نے اخلاقِ حسنہ کا جنازہ نکالا اور حرص، طمع، مفاد پرستی اور استعمار کو رواج دیا۔

3۔ اشتراکی فکر کی ترویج: جو بزعمِ خویش فقراء، محروموں اور مظلوموں کے دفاع کی دعویدار رہے لیکن اس نے اِن پسے ہوئے طبقہ کو مزید محرومی اور فقر میں مبتلا کر دیا۔ (۳)

۴۔ دورِ جدید کی زندگی اور تہذیبِ نو کے چکا چوند مظاہر: مادی سائنس نے انسان کے لیے پر تعیش اور آسائشات سے لبریز زندگی کے دروازے کھول دیے۔ کار، ہوائی جہاز اور ریلوے ایسی لگژری سواریاں؛

مواصلات، راحت وسکون کے وسائل؛ پُر فخر مشروبات اور کھانے؛ بیش قیمت ملبوسات؛ زندگی میں لذات کے حصول کے لیے عجیب وغریب تنوع اور شہوات اور اشتیاق انگیز اشیاء کے لیے دوڑ ودھوپ۔ ایسی تمام چیزوں نے انسان پر زندگی سے تمتع کے کچھ ایسے رنگ عیاں کیے جن سے انسان ناآشنا تھا۔ شہوات اور لذات میں انسان کا انہماک بڑھ گیا۔ جبکہ دین انسان کو بالعموم اسراف سے روکتا ہے اور اسے اعتدال ومیانہ روی کا حکم دیتا ہے۔ دین' شراب، زنا اور عریانی ایسی اشیاء کو حرام قرار دیتا ہے کیونکہ جو لوگ دین کے اس راز سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ دین کی جانب سے یہ پابندیاں ان کی آزادی پر قدغن ہیں اور ان شہوات ولذات کی راہ کا پتھر۔ یہ چیز لوگوں کے لیے دین سے مزید دوری کا باعث ہے اور آخرت کی یاد دھانی کرانے والوں، آگ سے ڈرانے والوں اور جنت کا شوق دلانے والوں سے کراہت کا سبب ہے۔ نتیجۃً دینی عقائد سے اجنبیت وغرابت بڑھ گئی ہے اور الحاد وزندقہ کے افکار فروغ پا گئے ہیں۔

5۔الحاد کو مادی قوت کا تعاون: جس چیز نے انسان کو اللہ عزّ وجلّ کے ساتھ کامل الحاد کی جانب بڑھنے پر دلیر اور بہادر کر دیا' وہ ہے الحاد کو مادی قوت کا تعاون حاصل ہونا اس کا باعث یہ تھا کہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ یورپ' گرجا کے افکار اور عقائد کو ترک کرنے کے بعد ہی مادی قوتوں کی جانب پیش قدمی کر سکا اور اسرارِ زندگی کو عیاں کر سکا۔ روس جیسی ریاست الحادی مملکت ہونے کے اعلان کے بعد ہی مملکت عظمی بن سکی۔ مزید لوگوں نے یہ غور کیا کہ جب تک مملکتیں دین سے جڑی رہتی ہیں' وہ قوت، صنعت اور ٹیکنالوجی میں پسماندہ رہتی ہیں۔ لہذا لوگ یہ گمان کر بیٹھے کہ کہ الحاد' قوت اور علم کا ذریعہ ہے۔

۔یورپی یلغار کے مقابل عالم اسلامی کی ہزیمت: یورپ کے لیے مادی قوت پر قدرت، آلاتِ صنعت کا استعمال اور فیکٹریوں کی تعمیر وترقی ممکن نہ تھی۔ حتی کہ اس نے اپنی فیکٹری کی مصنوعات کو فروخت کرنے

اور صنعت و حرفت کے لیے ضروری خام مواد کے حصول کی خاطر اپنی منڈیوں سے ماوراء دیگر ممالک کا رخ کیا۔ فیکٹریوں کے لیے خام مال کے متلاشی یہ ممالک اپنی مطلوبہ چیزوں کو کم ترین بلکہ در حقیقت بلا قیمت پانے کے خواہاں تھے اسی لیے ان ممالک نے اپنی زائد عسکری قوت کو استعمال کیا۔ جبکہ اِدھر عالمِ اسلام پسماندگی، فقر عسکری ضعف اور سیاسی کمزوری میں انتھاء کو پہنچ چکا تھا۔ اسی وجہ سے عالمِ اسلام یورپی استعماری یلغار کے سامنے زیادہ دیر تاب نہ لا سکا۔ اس عسکری ہزیمت کا جس میں یورپی معرکہ کے مقابل مسلمان مبتلا تھے مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کرنے میں بہت بڑا اثر ہے اور یورپی استعمار کے لائے ہوئے الحادی ریلے اور بہائو کے سامنے عقائدِ اسلامیہ کا بند نہ باندھ سکنے میں بے حد بڑا کردار ہے۔ مسلمان عوام یورپی استعمار کی تقلید کرنے، اس کے اخلاق و عادات کی مشابہت کرنے اور اس کے الحادی عقیدہ میں شامل ہونے لگے یہ گمان کرکے کہ اہل یورپ دین کا انکار کرکے ہی قوت کو پہنچ پائے ہیں۔ یہ ایک نئ غلطی تھی اور عالمی الحادی فنا منا و فتنہ میں حصہ دار ایک دوسرا سبب تھا۔)۴(

☆الحاد و بے دینی کی اشاعت و ترویج اور اسکے ذرائع

ا۔الحاد کی دعوت کے لیے میڈیا کا استعمال:

اس کام کے لیے کئ شکلیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ چند اہم ترین صورتیں یہ ہیں:

1۔تالیفات و کتب مثلاً: وھم الِالٰہ (معبود کا وہم/ دی گاڈ ڈیلوین) مصنف: رچرڈ ڈیوکنز، نھایۃ الِایمان (ایمان کا اختتام/اینڈ آف فیتھ) مصنف: سام ہارس۔ اللہ لیس عظیماً (اللہ عظیم نہیں/گاڈ از ناٹ گریٹ) مصنف: کریستوفر ہیتشنز وغیرہ

2۔ٹی وی اور ریڈیو کے پروگرامز: مثلاً: رچرڈ ڈیوکنز کا ڈاکومنٹری فلموں کا سلسلہ جوکہ ''شر کی کلی اساسیات '' کے عنوان سے نشر ہوا۔کچھ تکنیکی وفنی طریقہ سے ملحدین ان فلموں میں بھی داخل ہوئے اور بہت سے الحادی ولادینی پیغامات کو پاس کرانے کے ذمہ دار بنے۔ جس کی مثالیں ویڈیو اور گانوں کے کلپس ہیں۔ مشہور ترین گانوں میں سے جان لینن کا ''تخیّل خیال'' والا گانا، ''عزیزی الرب پیارے خدا'' والا گانا اور '' أنالست خائفًا میں خائف نہیں'' والا گانا۔

3۔عالمی الحادی ادارے: مثلاً: ملحدین کا بین الاقوامی باہمی تعاون واتحاد (Atheist Alliance International) ملحدین کی کمیٹی (Atheist Nexus) ادارہ رچرڈ ڈیوکنز برائے فروغِ عقل و سائنس (Richard Dawkins Foundation for Reason and Science)

بین الاقوامی اتحاد انسانی واخلاقی توجہ کے لیے بین الاقوامی کمیٹی برائے بے دین وملحدین

4۔انٹرنیٹ پر الحادی ویب سائٹس

مثلاً:

Friendlyatheit.com – Ffrf.org

Reddit.com/r/atheism

شبکۃ الملحدین العرب (عرب بے دینوں کا نیٹ ورک)، قناۃ الملحدین بالعربی (عربی میں ملحدین کا چینل)، شبکۃ الِالحاد العربی (عربی الحاد کا نیٹ ورک)، مزید یہ کہ فیس بک اور ٹویٹر پر عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملحدین کے بعض صفحات پر فعّال ممبر موجود ہیں۔

مواصلات اور خصوصاً سوشل میڈیا کے انقلابات سے قبل ملحدوں اور لادینوں نے کسی ایسے دن کا خواب ہی نہ دیکھا تھا۔ جس میں وہ اپنے خیالات و افکار کو جرأت کے ساتھ بیان کرنے کی طاقت رکھیں گے۔ ان ملحدین کے پاس متروکہ ٹوٹے پھوٹے تجزیات کو 'حریت' سے تعبیر کرنے کے لیے مکالماتی ویب سائٹس (جینے کے لیے) سانس لینے کا واحد راستہ تھیں۔ اب ان کی کوشش کے ذریعے فیس بک اور دیگر مواصلاتی ویب سائٹس کی وساطت سے ملحدین کا باہمی نظم و نسق قائم ہو گیا ہے۔ فیس بک پر عرب لادین صفحات (Pages) اور مجموعوں (Groups) کا شمار یا ان کے پیروکاروں (Followers) کا شمار بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ شاید کم از کم بھی ان کی تعداد لاکھوں میں پہنچ چکی ہے۔ یہ صفحات اپنی افکار کو پیش کرنے اور ان کی ترویج میں مختلف نوعیت کے ہیں۔ کچھ ناقدانہ طنز آمیز ہیں۔ جبکہ کچھ دیگر صفحات علمی فکری منصوبہ بندی کے حامل ہیں۔ جو اپنے عمومی پیروکاروں کے لیے ثقافت اور کلچر کی ترویج اور روشن خیالی (Enlightenment) کو ہدف بناتے ہیں۔

۲۔ ادیان کی جنگ میں دہشت گردی کا بطورِ آلہ استعمال

۳۔ دینِ اسلام پر تند و تیز یلغار

۴۔ تجربی و طبیعی علوم کی بابت شدید ترین غلو(۵)

۵۔ تمام شعائرِ دینی کا مذاق۔ ملحدین کا ان اصحابِ شعائر کو پسماندگی، رجعیّت اور قدامت پرستی کا طعنہ دینا۔ دینداری یا مظاہرِ دین کے ساتھ زندگی کو آراستہ کی جانب بلانے والی کسی دعوت سے ملحدین کی جنگ

٦۔ صیہونیت (Zionism) اور فری میسن (Freemasonry) تحریک کے ساتھ ملحدین کا بے حد مضبوط تعاون اور یہودیوں اور صیہونیوں کے لیے ان کی بے انتہاء مدح وستائش)٦(

☆معاصر الحاد کے منفی اور برے اثرات

موجودہ الحاد نے انسان کے رویوں اور مختلف اقوام کے اخلاق پر بہت واضح اثرات چھوڑے ہیں۔ ہم ذیل میں انہیں اجمالی طور پر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ا۔ بے چینی اور ذہنی خلفشاری:

الحاد سب سے پہلا اثر جو لوگوں کے نفوس میں چھوڑتا ہے' وہ ہے قلق، حیرانی، اضطراب، نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ اور مستقبل کا خوف۔

۲۔ انانیت اور خود غرضی:

ذہنی قلق اور خوف کا حتمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی توجہ فقط اپنے آپ پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسروں کی فکر چھوڑ کر انسان فقط اپنی مخصوص مصالح کے حصول تک محدود ہو کر رہ جائے' یہی انانیت اور خود غرضی ہے۔ جبکہ دین انسان کو اپنی ذات سے ہٹ کر رضائے الٰہی کی خاطر دوسروں سے نیکی اور احسان کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کی بجائے فقط اپنی ذات کی فکر کا رویہ پروان چڑھ چکا ہے۔ اسی لیے الحاد اور

بے دینی کے ظلمت سے اٹے ہوئے زمانوں میں لوگوں نے دوسروں کی پرواہ کرنا' چھوڑ دیا۔ آہستہ آہستہ فقراء و مساکین سے توجہ کم ہوئی پھر اہلِ خانہ و اقراء سے توجہ کم ہوئی پھر والدین سے توجہ کم ہوئی اور بالآخر بیوی بچوں سے بھی توجہ جاتی رہی۔

۳۔ مجرم بننے پر دبائو:

کیونکہ الحاد ضمیرِ انسانی کی تربیت نہیں کرتا اور نہ اسے اس زمین میں اپنے تصرفات واعمال پر نگہبان کسی قادر و قوی معبود کا خوف دلاتا ہے' اسی لیے ملحد سخت دل اور احساس سے عاری ہو کر نشوونما پاتا ہے۔ ڈانٹنے اور منع کرنے والی کوئی ہستی تو ہے نہیں' جو اسے ظلم سے روکے اور اسے احسان و شفقت کا حکم دے۔

۴۔ خاندانی نظام کا انہدام:

الحاد میں انسان کی اجتماعی زندگی کو توڑ پھوڑ دینے والے اثرات بھی موجود ہیں۔ اللہ عزّ و جلّ سے دوری کا فقط یہی نتیجہ نہیں کہ نفسِ انسانی اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے بلکہ اس کے لازمی نتائج میں سے انسانی معاشرے کا اجڑ جانا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا' بھی ہے۔ وہ اس طرح سے کہ انسانی معاشرہ اس وقت تک صالح اور سلیم نہیں ہو سکتا جب تک اس معاشرے کی اکائیاں صالح اور سلیم نہ ہو جائیں۔ جب یہ اکائیاں ہی بگڑ جائیں' تو اس کے تابع خاندانوں کی وجہ سے اجتماعی نظام بھی بگڑ جاتا ہے۔ اس لیے الحاد کے نتائج میں سے ایک خطرناک نتیجہ خاندانی نظام کا انہدام و اختتام بھی ہے۔

۵۔ معاشروں کا فساد اور اجاڑ:

خاندان، معاشرتی عمارت کی پہلی اکائی یا خلیہ ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کے فساد کی وجہ سے مکمل نظام ہی فساد زدہ ہو جائے۔ کیونکہ خاندان انسان کے لیے نگہداشت کا پہلا مرکز ہے۔ جب انسان فساد کا شکار ہو جائے، تو اس عمارت کی تعمیر میں کام آنے والی اینٹیں ہی فساد زدہ ہو گئیں۔

۶۔سیاسی سطح پر مجرم بننا:

شاید الحاد کے سب سے بڑے آثار عالمی سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے نظام میں نمودار ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ مادیت پرست الحادی اخلاق، انسان کے دل کو سخت اور انانیت پسند بنا دیتے ہیں۔ جو انسان کو اس جانب دھکیلتا ہے کہ وہ عالمی سیاسی تعلقات میں بھی اسی انانیت کا مظاہرہ کرے۔ اسی خاطر ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے استعماری ممالک کمزور اقوام کو غلامی میں جکڑنے، ان کے مصالح و فوائد کو ہتھیانے اور ان کے انقلابات کو دبانے_ ایسے گھٹیا ترین وسائل کی جانب بے بس اور مجبور ہو جاتے ہیں۔) ۷(

۷۔الحاد کے سوشل اور سماجی نتائج

ملحدوں کے معاشرہ کو آپ ایسے خیال کیجیے کہ جو نہ کسی حلال کو حلال جانتا ہے اور نہ کسی حرام کو حرام۔ تو ہلاکت خیز چیزوں میں سے جو آپ چاہیں، وہ آپ اس معاشرہ میں بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ بے دین ان ہلاکت خیز اشیاء سے کسی صورت اجتناب نہیں کرتا۔ جب تک کہ اسے کسی انجامِ بد میں مبتلا ہو جانے کا خوف نہیں ہو جاتا۔

*معاصر الحادی تحریک کے مسلمانوں پر اثرات

شروع سے پوری دنیا کے اکثر و بیشتر مسلمان اپنے دین، ایمان بالغیب اور جنت و جہنم پر ایمان سے جڑے ہوئے ہیں اور شرعی عبادات پر قائم و دائم ہیں۔ وللہ الحمد۔ مگر الحاد و بے دینی کی لہر مسلمانوں کی زندگی کے بیشتر جوانب خصوصاً معاملات، اخلاق اور تعلقاتِ عامہ پر حاوی ہو رہی ہے۔ اور دشمنوں کی جانب سے بھی مسلمانوں کے دین، عقیدہ اور قوتوں کے بارے میں شک پیدا کرنے کے لیے بڑی بڑی کوششیں کی جارہی ہیں۔

آج مسلمان معاشرے اپنے مسلمات و ثوابت پر طعن و تشنیع کے مسلسل حملوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ وہ اس چیز کا بھی مقابلہ کر رہے ہیں کہ انہیں اپنے مستقبل کی تعمیر سے غافل رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بلکہ ان مسلم معاشروں کو اس چیز کا بھی سامنا ہے کہ انہیں شناخت، فکر اور فلسفیانہ تصادم کی مشکلات میں ہی الجھا کر رکھا جائے۔ یہ سب کچھ اسلام کے 'فرزندان' کے ہاتھوں داخلی سطح پر اسلام کو گرا دینے کے نظریہ کی خاطر مسلسل کیا جارہا ہے۔

آج مسلمانوں کے نوجوانوں میں جس قدر فکری شبہات اور بوہیمی (مطلق آزادانہ) خواہشات پھیلائی جارہی ہیں' یہ اعدائے اسلام کی جانب سے کوئی نئی بات ہے نہ اجنبی۔ بلکہ حق و باطل کے معرکہ میں یہ الٰہی سنت ہے اور ربانی طریقہ۔ لیکن ایک چیز نئی ہے جسے اِس الحادی حملہ نے اوڑھ رکھا ہے۔ یعنی بے دینی کا یہ حملہ جدیدیت (Modrenism) کے لبادہ میں ہے اور ٹیکنالوجی، مال و دولت اور میڈیا کے وسائل سے لیس اور مسلح ہے۔

عربی تحریر: ایمان بنت ابراہیم الرشید ترجمہ: محمد عدنان

حواشی و حوالہ جات

)۱(دیکھیے: کواشف زیوف المذاھب المعاصرۃ مصنف: عبدالرحمن المیدانی ص ۴۳۳

)۲ (العودۃ الی الایمان مصنف: ھیثم طلعت ص ۱۲:۱۱

)۳ (دیکھیے: الالحاد اسبابہ وعلاجہ مصنف: ابو سعید الجزائری

)۴(دیکھیے: الالحاد اسباب ھٰذہ الظاھرۃ وطرق علاجھا مصنف: عبدالرحمن عبدالخالق

)۵(دیکھیے: ملیشیا الِالحاد مصنف: عبداللہ العجیری، خلاصہ) ۸۳-۲۱(

)۶(دیکھیے: ظاھرۃ الالحاد ما حقیقتھا فی مجتمعاتنا العربیۃ والاسلامیۃ

۷

الحاد کی روک تھام اور بچاؤ کے لئے کرنے کے کام

مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ کثیر رجالِ کار اور علمائے صدق نے مسلمانوں کے 'فرزندان' کی جانب سے جھگڑوں سے لبریز اِن پے در پے حملوں کا خوب مقابلہ شروع کیا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگیاں اسلام کی نصرت کے لیے خرچ کر دیں اور دعوت، مکالمہ، تنقید اور ملحدوں کے شبہات کا لبادہ چاک کرنے کے ذریعے اِن 'فرزندانِ مسلمین' کی جانب سے اِس الحادی گھٹا کے خاتمہ کے لیے اپنے اوقاتِ کار نذر کر رہے ہیں۔

دورِ حاضر میں الحادی فتنہ سے بچاؤ کیلئے مجوزہ حکمتِ عملی:

پہلا قاعدہ: اسلام کے اصولوں پر یقین کو تقویت دینے کے چند وسائل:

ا۔ اللہ عزوجل کی کائناتی آیات اور نشانیوں پر تفکر کی عبادت کا احیاء اور فروغ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب میں اس بات کی خوب وضاحت ہے کہ تفکر اور بڑے بڑے حقائق کے ادراک کے مابین بڑا گہرا تعلق اور ربط ہے۔ عباد الرحمان کی نشانیوں کے متعلق فرمان باری تعالیٰ ہے: ''جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی پہلوؤں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پرودگار تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا۔ تو پاک ہے۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔'' (آل عمران 3:191)

عبادتِ تفکر کے احیاء کے چند وسائل: وڈیو اور قابلِ مطالعہ ایسے مواد کی نشر واشاعت جو تفکر و تامل کے میدان کی ضروریات پوری کر سکے۔

اس میدان میں لکھی گئی مباحث یا وڈیو مواد میں سب سے اچھی تصدیر پر مقابلہ جات کی داغ بیل۔

۲۔ مخصوص کتب پر بالا ہتمام توجہ: ایسی کتب کو خصوصی توجہ دی جائے جن میں اصولِ اسلام کی صحت کے دلائل کو بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میدان میں قدیم وجدید دور کے علماء نے کتب تحریر فرمائی ہیں ۔ ہمیں متقدمین میں بہتیرے علماء کرام ملتے ہیں جنہوں نے ''اعجاز القرآن'' کی بابت لکھا۔ مثلاً خطابیؒ، رمانیؒ، باقلانیؒ، جرجانیؒ وغیرہ۔ البتہ اس حوالے سے دورِ حاضر کی کچھ کتب یہ ہیں:

کتاب النبأ العظیم اور کتاب مدخل الی القرآن الکریم از محمد عبداللہ دراز

کتاب براھین وأدلّۃ ایمانیۃ از عبدالرحمن حسن حبنکۃ المیدانی

کتاب نبوّۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (من الشک الی الیقین) از فاضل السامرانی

کتاب الأدلّۃ العقلیۃ النقلیۃ علیٰ أصول الاعتقاد از سعود العریفی

کتاب کامل الصورۃ از أحمد یوسف السید

۳۔ دعوت، تعلیم اور عمل میں قلوب کی عبادت کا اہتمام: بلا شبہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ عز وجل کی جانب انابت کرنے، اسی پر توکل کرنے اور اسی کے سامنے خشوع کرنے والے تھے۔ لہذا جب قوم اللہ تبارک وتعالیٰ کی بابت آپ علیہ السلام سے جھگڑی، آپؑ نے قوم سے کہا:

''آپ نے فرمایا کہ کیا تم اللہ کے معاملے میں مجھ سے حجت کرتے ہو حالانکہ کہ اس نے مجھے طریقہ بتلایا ہے ''(الانعام ۶:۸۰)

۴۔ نومسلموں کے قصوں کی نشر واشاعت: اس میں کچھ شک نہیں کہ ایمانی راحت کے حصول میں اِن قصوں کی بے حد تاثیر ہے۔ خصوصاً اس وقت جب آپ ان نومسلموں کی خصوصیات کے تنوع اور علاقوں کے فرق کو بغور دیکھتے ہیں۔

دوسرا قاعدہ: ناقدانہ عقل کی افزائش: اعتراضات وشکوک وشبہات کی منطقی وعقلی جانچ پرکھ کو رواج دینا۔

تیسرا قاعدہ: شرعی اصولوں کا استحکام: عقیدہ، فقہ، اصول فقہ، اصطلاحاتِ حدیث، زبان اور علومِ قرآن وغیرہ وغیرہ ایسے سب شرعی علوم کی تعلیم سے یہ چیز حاصل ہو سکتی ہے۔

چوتھا قاعدہ: استدلال، معرفت اور موقفات کے لیے مصادر (Sources) کی حد بندی اور تعین

پانچواں قاعدہ: شبہات پر بات چیت کے لیے ماہرانہ صلاحیت سے عاری (Non-specialist) لوگوں سے احتیاط

چھٹا قاعدہ: ردِّ شبہات کی محتاط تعلیم: شبہات اور اشکالات کی تردید میں لکھی گئی کتب کی چند شروط کے تحت محتاط تعلیم دینی چاہیے۔ یہ شروط ہیں:

1۔ یہ کہ شبہات تازہ اور عام پھیلے ہوئے ہوں اور یہ کتب سرِ عام پیش آمدہ خطرات کی متعلق ہوں۔

2۔ یہ کہ کتب کا اسلوبِ نگارش کچھ اس طرح ہو کہ شبہہ کو بیان کرنے میں وہ مجمل ہو۔ لیکن شبہہ کی تردید میں وہ تفصیلی گفتگو کرے۔ کیونکہ بعض لکھاری شبہہ کو پیش کرنے میں تفصیل برتتے ہیں اور اس شبہہ کے حوالہ جات اور اصولوں تک کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ اسلوب خصوصی لوگوں کے لیے مناسب ہے۔

لیکن ہم سرِ دست عمومی طبقہ کی حفاظت اور بچاؤ کی بابت گفتگو کر رہے ہیں۔ ان عمومی لوگوں کو تفصیل در تفصیل کے ساتھ شبہات پڑھوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

3۔ یہ کہ شبہہ کی تردید محکم اور مضبوط ہو۔ جو ماہرانہ صلاحیتوں کے حامل لوگوں سے ہی ملنا، متوقع ہوتی ہے۔ حالیہ شبہات کی تردید کے میدان میں کچھ مناسب کتب درج ذیل ہیں جن کو شبہات سے تحفظ کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے:

کتاب السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی از مصطفی السباعی

کتاب کامل الصورۃ (دونوں جزء)

ساتواں قاعدہ: فکری اور پر اثر ہونے کے اعتبار سے مفید اجتماعی پروگرامز کی حوصلہ افزائی اور تقویت

آٹھواں قاعدہ: دعا اور آہ و زاری) ٦(

نواں قاعدہ: دعوتی منصوبہ جات کے لیے مالی معاونت: باطل شبہات و اشکالات کی تردید میں لکھی گئی کتب اور عقیدہ کی کتب کی طباعت اور سٹیلائٹ چینلز پر علمی پروگرامز کی تقویت کے ضمن میں دعوتی منصوبہ جا ت کے لیے مالی معاونت خصوصی توجہ کا مرکز رہے۔ یہ کتب اور پروگرامز عظمتِ الٰہی کے حامل ہوں اور محاسنِ اسلام اور توحیدِ ربوبیت پر خصوصی روشنی ڈالیں۔

دسواں قاعدہ: شبہات کی تردید کی باقاعدہ تعلیم اور ٹریننگ: شبہات کی تردید اور اللہ کے دین کے دفاع پر اپنے نوجوانوں کی خصوصی ٹریننگ اور مشق کرائی جائے۔ یہ چیز نوجوانوں کو عقیدہ کی صحیح کتب کی تعلیم دے

کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ لازمی کتب کی خریدی نہیں کر سکتے، کتب کی فراہمی کی خاطر ان کے لیے لائبریریوں کے قیام کو عمل میں لایا جائے۔

گیارھواں قاعدہ: علمائے امت کی خصوصی ذمہ داری: اہل علم اور علمائے امت نوجوان بچوں اور بچیوں کو ہولناک خطرات سے متنبہ کریں۔ دنیا کے زوال اور دنیا پر عدمِ انحصار کی یاد دہانی اصحابِ تربیت کا شغل ہونا چاہیے۔ یہاں تک وہ اپنا کردار ادا کر دیں اور توحید و ایمان کا پیغام پہنچادیں۔) ۷(

☆شبہات میں گھر جانے کے بعد بچاؤ کے قواعد

1۔ پہلا قاعدہ: ناقدانہ سوچ و فکر کا استعمال اور معلومات و افکار کو بروئے کار لانے میں علمی ثقاہت و پختگی: یہ ضروری ہے کہ کسی قابلِ نظر اور لائقِ مناقشہ قیمتی معلومات کو استعمال میں نہ لایا جائے۔ جب تک کہ اس میں علمی توثیق کا ادنیٰ ترین درجہ میسر نہ آجائے۔

2۔ دوسرا قاعدہ: ماہرانہ صلاحیتوں کے حاملین سے سوال اور استفادہ

3 تیسرا قاعدہ: مشکل مسئلہ کی تردید کے بارے میں سابقہ کاموں اور جہود کی جانب مراجعت

4 چوتھا قاعدہ: متشابہ کو محکم پر پیش کرنا: بلاشبہ محکم و متشابہ کا مسئلہ قرآن فہمی کے اہم منہجی امور میں سے ہے۔ یہی مسئلہ راسخین فی العلم اور بھٹکنے والوں کے مابین فرق کرنے والا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرما چکے ہیں: ''وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے تجھ پر کتاب اُتاری جس میں واضح مضبوط آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور

بعض متشابہ آیتیں ہیں۔ پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے" (آل عمران ۳:۷)

امام ابن کثیرؒ اس آیت کے معنی کا خلاصہ قیمتی اور واضح کلام میں یوں پیش کرتے ہیں: "اللہ عزوجل نے قرآن کریم کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ {اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ} ہے۔ یعنی اپنی دلالت میں ایسے واضح دلائل کہ کسی ایک شخص کو ان کی بابت التباس نہیں۔ اسی قرآن کی کچھ دیگر آیات ہیں جن کی دلالت کی بابت کثیر یا چند لوگوں کو کچھ اشتباہ ہو جاتا ہے۔ جس شخص نے قرآن کے متشابہ حصہ کو واضح حصہ کی جانب پیش کر دیا اور اپنے ہاں قرآن کے محکم کو متشابہ پر حاکم بنا دیا' وہ ہدایت پا گیا۔ جس نے بر عکس کیا تو وہ بر عکس نتیجہ پائے گا۔ اسی لیے اللہ عزوجل نے {هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ} کے لفظ ارشاد فرمائے ہیں۔ یعنی یہ قرآن کا اصل ہیں جن کی جانب اشتباہ کے وقت رجوع کیا جائے۔ {وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ} یعنی ایسی آیات جن کی دلالت اور مفہوم محکم کی موافقت کا احتمال رکھتی ہیں۔ البتہ کبھی کبھی یہ آیات اپنے الفاظ اور ترکیب کی حیثیت سے کسی دوسری شے کا احتمال رکھتی ہیں لیکن مراد کے حیثیت سے یہ قطعا کسی دوسری شے کا احتمال نہیں رکھتی ہیں "۔

مثلاً: ایک عیسائی آکر کہتا ہے: تمہارا قرآن کریم متعدد معبودوں کی خبر دیتا ہے۔ جس کی دلیل اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ "ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں" (النحل: ۹)

اس آیت میں وجہ دلالت یہ الفاظ و کلمات ہیں: اِنَّا(ہم)، نَحْنُ (ہم)، نا(ہم)اور حَافِظُونَ میں جمع کی واؤ۔ یہ سب کلمات جمع پر دلالت کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سب ضمائر(Pronouns) جیسے جمع کا مفہوم دیتی ہیں، ویسے ہی یہ تعظیم کا مفہوم دیتی ہیں۔ جیسا کہ بادشاہ اپنے بارے میں تعظیم کے طور پر جمع کے کلمات بولتے ہیں۔ لیکن جب ہم قرآن کریم میں محکم اور بیّن حکم کو دیکھتے ہیں تو وہ توحید ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے :

''اور نہ کہو کہ اللہ تین ہیں اس سے باز آجائو کہ تمہارے لئے بہتری ہے، اللہ عبادت کے لائق تو صرف ایک ہی ہے اور وہ اس سے پاک ہے (النساء: 171)

آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے'' (الاخلاص:۱)

متشابہہ کو محکم واضح آیات پر پیش کرنے سے جھگڑا اور فساد باطل ہو گیا۔

5 پانچواں قاعدہ: ایسے شبہہ سے توقف جس کا جواب جانا پہچانا اور معروف نہ ہو۔

6 چھٹا قاعدہ: لادینی فکر یا جسے جھوٹ کے طور پر قرآنی فکر وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے، اس کی جانب منتقلی کے منفی نتائج سے آگہی اور واقفیت

7 ساتواں قاعدہ: شبہات اور وسوسات سے نمٹنے میں فرق: بلاشبہ وسوسات، شبہات سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ شبہات کا جواب حاصل کر لینے سے شبہات کا علاج ہو جاتا ہے۔ جب جواب محکم اور مضبوط ہو، تو شبہات زائل اور نابود ہو جاتے ہیں۔ البتہ وسوسات کا حل جواب میں نہیں ہوتا ہے۔ یہ جواب سے ختم

نہیں ہوتے۔ اگرچہ سو مرتبہ جواب کا تکرار کر لیا جائے۔ ان کا حل فقط یہ ہے کہ ان سے اعراض کر کے رہا جائے۔

شبہہ کے علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ شبہہ کا منبع و مصدر اکثر و بیشتر محدود ہوتا ہے۔ یا تو کوئی وڈیو کلپ ہوتا ہے یا کتاب یا کوئی دوست وغیرہ۔ جبکہ وسوسات میں اصول یہ ہے کہ یہ انسانی خیالات کے ذریعے آتے ہیں۔ جن کو انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر اوقاتِ عبادت میں آتے ہیں۔

شبہات میں مبتلا لوگوں سے مکالمہ کے قواعد

——پہلا قاعدہ—مکالمہ سے قبل مقابل مکالمہ کرنے والے کے مذہب کا استیعاب اور اس کے میسر آڈیوز و وڈیوز مواد کا جائزہ

——دوسرا قاعدہ—مکالمہ میں مشترکہ نکتہ پر اتفاق

——تیسرا قاعدہ— محلِ نزاع نکتہ کی لکھت

بعض مباحثوں میں مکالمہ کرنے والوں کو کچھ وقت کے بعد جا کر ادراک ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے نکتہ پر بات کرتے رہے جس پر وہ متفق تھے اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو غلط سمجھتے رہے۔ انٹرنیٹ کے بیشتر نیٹ ورکس پر یہ بہتیرا ہوتا ہے کہ دلی کینہ کے باعث فضا بے حد پراگندا رہتی ہے۔ لہذا دونوں مکالمہ کرنے والوں کے لیے یہ نہایت اچھا ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کی بات بحسن وخوبی سمجھیں، محلِ نزاع نکتہ کو متعین کریں اور واضح ہدف کی جانب گامزن رہیں۔

——چوتھا قاعدہ—فریق مخالف کے کلام میں خوب دقتِ نظری اور ناقدانہ جائزہ نیز کلام میں درج اشکالات کی گہری خبر گیری

——پانچواں قاعدہ—صرف دفاع پر ہی اکتفاء نہ کیا جائے۔

——چھٹا قاعدہ-- باطل مقدمات کو تسلیم نہ کیا جائے۔ باطل مقدمات یا مبادیات کو تسلیم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ فریقِ مخالف بہت جلد آپ پر باطل نتائج لازم ٹھہرا لے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم باطل مقدمات کو ابتداء سے ہی قبول نہ کریں۔اس طرح سے دراصل آپ نے صاحبِ شبہہ کا راستہ ہی اُدھیڑ اور اُکھیڑ دیا ہے۔ مثلاً بعض ملحدین بحث و مباحثے میں (آپ کو پھانسنے کے لیے) سیڑھی چڑھاتے ہوئے یہ کہتے ہیں: ہر موجود شے کا کوئی نہ کوئی موجِد (بنانے والا) ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے ؟ اگر آپ کہہ دیتے ہیں: ہاں، کیوں نہیں، ایسے ہی ہے۔ تو وہ آپ سے کہے گا: اللہ موجود ہے لہذا اس کا موجد کون ہے ؟ حالانکہ اس بابت درست طریقہ یہ ہے کہ آپ بنیادی طور پر قاعدہ اور مقدمہ کو تسلیم نہ کریں۔ کیونکہ یہ مقدمہ درست ہی نہیں ہے۔ صحیح مقدمہ اس بابت یوں ہے: ہر حادث (فنا ہونے والی شے) کا کوئی نہ کوئی محدث (بانی) ہے۔ البتہ اللہ عزوجل حادث نہیں ہے۔ لہذا اللہ عزوجل کے احداث، خلق اور ایجاد کا سوال ہی ختم ہو گیا۔

——ساتواں قاعدہ——اگر آپ دعویدار ہیں تو دلیل آپ کے ذمہ ہے۔اور اگر کہیں سے نقل کر کے پیش کر رہے ہیں، تو اس نقل کی صحت کی ذمہ داری آپ پر ہے۔

——آٹھواں قاعدہ-- نصوص شرعی سے اخذ شدہ استدلال کی خبرداری اور متعلقہ باب کی جمیع نصوص کے احاطہ کی ضرورت پر ہوشمندی

حواشی وحوالہ جات:

(1) دیکھیے: ملاذا الملحدین واللادینیین العرب از عادل قلقیلی

(2) دیکھیے الالحاد فی العالم العربی: لماذا تخلی البعض عن الدین؟ (قسم المتابعة الاعلامیة۔بی بی سی) از أحمد نور

(3) دیکھیے الالحاد (اسبابہ، طبائعہ، مفاسدہ، اسباب ظھورہ، علاجہ) از محمد الحضر حسین

(4) دیکھیے الالحاد (اسبابہ وعلاجہ) از ابو سعید الجزائری

(5) دیکھیے الالحاد (اسبابہ، طبائعہ، مفاسدہ، اسباب ظھورہ، علاجہ) از محمد الحضر حسین

(6) دیکھیے: باسغات از أحمد السید

(7) دیکھیے: منظمات عالمیة تنشر الالحاد بیننا از قاری عبد الباسط

عربی تحریر: ایمان بنت ابراہیم الرشید ترجمہ: محمد عدنان

۸

ملحدین کے پچاس اعتراضات اور انکے جوابات

1

جدید عقلیت نے کسی بھی چیز کے درست ہونے کا معیار یہ رکھا ہے کہ وہ انسانی عقل میں آجائے اور اسکا تجربہ بھی ممکن ہو۔اس لاجک کے تحت مذہبی عقائد کو بھی ہدف تنقید بنایا گیا ہے چنانچہ جہاں عقیدہ توحید، رسالت، آخرت پر عقلی سوالات اٹھائے گئے ہیں وہاں اس زد میں انبیاء کے معجزات بھی آئے ہیں۔ جدید ذہن انکی عقلی و سائنسی توجیہہ کا مطالبہ رکھتا ہے۔اسکو جانتے ہوئے بھی کہ سائنس کچھ ڈائمنشنز، مشاہدات و تجربات تک محدود ہے، ہر حتمی سچائی، راز اور علم سے واقف نہیں ،کئی مسلم نوجوان ان عقائد کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہوگئے اور کچھ مخلص مسلمانوں نے جواب دینے میں ناکامی کی وجہ سے دین کی بنیادوں پر ہی انتہائی قسم کے سمجھوتے کر لئے۔۔ ہم عقائد کی سائنسی تفاسیر کے حق میں نہیں لیکن جدید

مسلم ذہن کی اس تشکیک کو دیکھتے ہوئے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ان معاملات کی ایسی معقول و ممکن سائنسی توجیہہ و تشریح پیش کردی جائے جس سے انکے خلاف عقل ہونے کے دعوے کی حقیقت واضح ہو جائے۔

☆☆☆

معجزہ وہ خلاف عادت چیز ہے جو سوال اور دعویٰ (نبوت) کے بعد ظاہر ہو جو ہر حیثیت سے محال نہ ہو اور لوگ باوجود کوشش اور تدبیر کے اس قسم کے معاملات میں پوری فہیم و بصیرت رکھتے ہوئے بھی اس کے مقابلہ سے عاجز ہوں۔ معجزہ کے ذریعہ چونکہ ایسا واقعہ ظہور میں آتا ہے جو قوانین فطرت کی عام روش سے ہٹا ہوا ہوتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مدعی نبوت رب العالمین کا نمائندہ ہے جس نے اس کی صداقت ثابت کرنے کے لئے اپنی براہ راست مداخلت سے وہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے اگرچہ رسول کی سیرت، اخلاق، طبعی سلامت روی اور رسول کا سنایا ہوا پیغام خود سے دلیل ہوتا تھا لیکن ہر ذہن اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوتا تھا اس لئے رسول کے ذریعے کوئی ایسا خرق عادت واقعہ پیش کیا جاتا جو کہ معلوم فطری قوانین کے مطابق ناممکن ہوتا۔ یہ خرق عادت واقعات خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے پیش نہیں کئے گئے، بلکہ اصلاً رسول کو رسول ہونے کی دلیل کے طور پر اور ضمناً رسول کی تعلیمات کے حق ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کئے گئے۔

سائنس کے مزعومہ دریافت کردہ قوانین سے مرعوبیت کی بنا پر ہمارے ہاں ایسے مفسرین قرآن نے بھی جنم لیا جنھوں نے قرآن کو معلوم سائنسی قوانین کے مطابق ثابت کرنے کے جوش میں یا تو معجزات کا سرے سے انکار ہی کر دیا اور یا پھر انکی ایسی بے سروپا تاویلات کیں کہ وہ معجزہ ہی نہ رہے۔ سائنسی معلومات

و قوانین کی بنیاد پر معجزات کا انکار کرنے والے شخص کی ذہنی کیفیت اس ایلین کی سی ہے جو کہیں سے ہماری زمین پر آگیا ہے اور ٹریفک سگنل کے سامنے کھڑا مشاہدہ کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ لال رنگ کی بتی جلنے پر گاڑیاں رک جاتی ہے اور سبز بتی پر چلنے لگتی ہے۔ فرض کریں متعدد دفعہ یہی مشاہدہ کرنے پر اسکے ذہن میں یہ مفروضہ جنم لیتا ہے کہ 'لال رنگ کی بتی گاڑی رکنے کا سبب ہے اور سبز رنگ کی بتی انکی حرکت کا سبب'۔ اپنے مفروضے کی مزید تحقیق کیلئے وہ شہر بھر کے سگنلز کا چکر لگاتا ہے اور ہر جگہ واقعات کی اسی ترتیب کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ اپنے درج بالا مفروضے کو دنیا کا اٹل قانون مان لیتا ہے۔ اب فرض کریں سڑک پر اسکی ملاقات ہماری دنیا کے کسی شخص (آپ) سے ہوتی ہے اور وہ آپ کو دنیا کے بارے میں اپنے دریافت کردہ قانون سے آگاہ کرتا ہے، یعنی 'لال بتی ہمیشہ گاڑی روک دے گی اور سبز بتی اسے چلا دے گی'۔ آپ مسکرا کر اسے کہتے ہیں کہ جناب لال اور سبز میں ایسا کچھ نہیں ہے جو گاڑیوں کو روکتا یا چلاتا ہے، بلکہ ان رنگوں میں یہ معنی و تاثیر ہم انسانوں نے خود رکھے ہیں، جب تک ہم چاہتے ہیں یہ ترتیب نظر آتی رہتی ہے اور جب ہم نہیں چاہتے تو ہم اسے معطل کر دیتے ہیں، جیسے کہ ایمبولنس کو ہم نے اس قانون سے مستثنٰی کر رکھا ہے۔ مگر وہ ایلین اپنی تحقیق پر بضد رہتا ہے، آپ کی بات پر یقین نہیں کرتا بلکہ الٹا آپ کو جاہل اور نادان سمجھنے لگتا ہے اور دعوی کرتا ہے کہ 'دنیا کے قانون فطرت کے مطابق ہو ہی نہیں سکتا کہ ایمبولینس لال بتی پر نہ رکے'۔

یہی حالت ہر اس شخص کی ہے جو سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر دریافت شدہ روابط کو حتمی سمجھتے ہوئے معجزات کا انکار کرتا ہے۔ خدا کا نبی کہتا ہے کہ یہ اشیاء بذات خود موثر نہیں بلکہ انکی یہ بظاہر دکھائی دینے والی تاثیر اور معنی حکم خداوندی کی بنا پر ہیں، جب تک وہ چاہتا ہے یہ ربط تمہیں دکھائی دیتا ہے اور جب اسکا اذن نہ ہو تو یہ

روابط معطل ہو جاتے ہیں۔ مگر سائنس کا مارا ہوا نادان انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے بارے میں اپنے دریافت کردہ ربط کو اٹل جانتے ہوئے نبی کا تمسخر اڑاتا ہے۔

ڈاکٹر زاہد مغل

2

معجزے کی سائنسی تشریح

جب سے انسانوں کی ایک بڑی آبادی نے اس مادی دنیا کو سمجھنے پر زور دیا اور اس کو اپنے فوائد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو مذاہب پر بہت سارے نئے اعتراضات کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی لے کر حاضر ہوا۔ اس کے نتیجے میں کچھ مسلمانوں کو جوابات دینے میں کچھ زیادہ ہی دقتیں پیش آئیں اور کچھ مخلص مسلمانوں نے تو جواب دینے میں ناکامی کی وجہ سے دین کی بنیادوں پر ہی انتہائی قسم کے سمجھوتے کر لئے۔ اس کی اصل وجہ مسلمانوں کا ان جدید علوم کی حقیقت سے نابلد ہونا اور خود اعتمادی کی شدید کمی تھی جبکہ سائنسی علوم کو پیش کرنے والے اپنی علمیت پر بہت پر اعتماد تھے۔ اگرچہ بعد کے ادوار میں شکوک و شبہات کا بخوبی جواب دے دیا گیا لیکن ہمارا ایک طبقہ ابھی بھی شکوک و شبہات میں ہی جی رہا ہے۔

چونکہ باطل ایک ہی حالت میں نہیں رہتا، بھیس بدل بدل کر اور مختلف وسائل کو استعمال کر کے آتا ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ جو پرانے سوالات نئی نسل کے سامنے بالکل نئے انداز میں سوشیل میڈیا کے ذریعے سے سامنے آرہے ہیں ان کا اسی طرح جواب دیا جائے۔

تو سوال یہ ہے کہ آیا معجزات کا صادر ہونا سائنس سے مطابقت رکھتا ہے؟

اس بارے میں پہلے تو معجزات و کرامات اور سائنس کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے۔

کلام پاک میں انبیاء کے معجزات کے جو واقعات پیش کئے گئے ہیں ان کو وسیع تر معنوں میں دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اول یہ کہ جب رسول اپنی نبوت کا دعوی پیش کرتے تھے تو یہ ایک بہت بڑا دعوی ہوتا تھا۔ ایک انسان جب یہ دعوی کرے کہ میں رب العالمین کا نمائندہ ہوں اور اس کی طرف سے اس کے احکامات سنانے جارہا ہوں تو یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ رسول کے اس دعوے کی دلیل کیا ہے۔ اس کے لئے اگرچہ رسول کی سیرت، اخلاق، طبعی سلامت روی اور رسول کا سنایا ہوا پیغام خود سے دلیل ہوتا تھا لیکن ہر ذہن اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوتا تھا اس لئے رسول کے ذریعے کوئی ایسا خرق عادت واقعہ پیش کیا جاتا جو کہ معلوم فطری قوانین کے مطابق ناممکن ہوتا۔ لیکن اس بات کا فیصلہ کہ آیا ایسا کوئی خرق عادت واقعہ پیش کرنا ضروری ہے یا نہیں اس کا فیصلہ رب العالمین خود کرتا تھا۔ اور اس واقعہ کا اصل فاعل اللہ ہی ہوتا تھا۔ مثلاً عیسی، صالح اور موسی علیہم السلام سے متعلق قرآن پاک میں ایسے واقعات کا ذکر ہے، لیکن نوح، ہود، لوط علیہم السلام کے معاملے میں ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات سمجھنے کی ہے کہ یہ خرق عادت واقعات خدا کے

وجود کو ثابت کرنے کے لئے پیش نہیں کئے گئے، بلکہ اصلاً رسول کو رسول ہونے کی دلیل کے طور پر اور ضمناً رسول کی تعلیمات کے حق ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کئے گئے۔ یہاں پر یہ واضح ہو کہ کسی نبی نے یہ دعوی نہیں کیا کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے خرق عادت کام کرکے دکھا سکتا ہے۔

دوسری قسم کے معجزات وہ ہیں جو کہ اللہ کی طرف سے کسی نبی کی مدد و نصرت کے لئے پیش آئے۔اس مدد میں نبی کو تعلیم دینا، نبی کے دل میں اطمینان و سکینت کا پیدا کرنا، نبی کو دشمنوں کی دشمنی سے بچانا یا نبی کی کسی خاص ضرورت کو خرق عادت طریقے سے پورا کرنا وغیرہ بھی شامل ہیں (مثلاً واقعہ معراج، بدر و ثور میں نصرت)۔ اس قسم کا معجزہ بھی کسی انسان کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ وہ جب چاہے اس کو پبلک مقامات پر یا لیبارٹری میں اس کا مظاہرہ کرکے دکھائے۔

کچھ معجزات ان دونوں قسموں پر محیط ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا ٹھنڈا ہونا۔

کرامات ان خرق عادت چیزوں کو کہا جاتا ہے جو کہ کسی غیر نبی کے ذریعے سے پیش آئے۔ چونکہ کسی غیر نبی کے لئے پہلی قسم کی خرق عادت چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے کرامات کی شکل میں صرف دوسری قسم باقی رہ جاتی ہے۔

جدید سائنس علمیت کی ایک شاخ ہے جو کہ مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے۔ کسی چیز کے سائنس ہونے کے لئے ضروری ہے کہ علم کی بنیاد مشاہدات اور تجربات پر ہو۔ اور ان مشاہدات اور تجربات کا صرف ایک بار ہونا کافی نہیں ہے بلکہ بقدر ضرورت اس کو دہرانا بھی ضروری ہے۔ اور مزید یہ کہ ان مشاہدات اور تجربات سے جو علمی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اس کی بنیاد پر آگے کی پیشن گوئی بھی ممکن ہو۔ علم و تحقیق میں

سہولت کے لئے سائنس کچھ بنیادی اصول بھی طئے کرتا ہے۔ مثلاً یہ دعوی کہ مادہ اور قوت نہ پیدا کی جاسکتی ہے اور ختم کی جاسکتی ہے۔اس کائنات کے اندر جو بھی مادہ اور قوت ہے وہی چیز اپنی شکلیں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ سائنس کا یہ بھی دعوی ہے کہ کائنات ایک بند نظام(Closed system) ہے۔یعنی سائنس کا دعوی ہے کہ اس کائنات کے اندر جو بھی ہوتا ہے اس کی علت اسی کائنات کے اندر موجود ہے۔ واضح ہو کہ یہ دونوں نکات یعنی مادہ اور قوت کا کائنات کے اندر محدود ہونا اور کائنات کا ایک بند نظام ہونا، وہ بنیادی مفروضات ہیں جن پر سائنسی کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

سائنس کے یہ دونوں اصول سائنسی تحقیق کیلئے بہت بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر سائنسی تحقیق کے لئے پہلے ہی سے یہ اصول نہ گھڑے ہوتے تو اتنی سائنسی ترقی ممکن نہ ہوتی۔ اگر انسان ہر واقعے کو کائنات سے باہر کی کسی باارادہ ہستی سے منسوب کرتا تو پھر وہ قواعد اور قوانین جن کے تحت کائنات چلتی ہے کا دریافت کیا جانا انتہائی مشکل ہوتا۔ پھر انسان کسی قانون کی دریافت کے بجائے اس بیرونی قوت کے ارادے کو معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ سائنسی تحقیق میں تجربہ ومشاہدہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس لئے سائنس کا بہت بڑا حصہ استقرائی منطق پر مبنی ہے۔ یعنی سائنسدان ایک نتیجے کو اخذ کرنے کیلئے مختلف تجربات کر کے اس کو دہراتے ہیں اور جب تمام تجربات اس نتیجے کی تائید کرتے ہیں تو اس نتیجے کی توثیق کر دیتے ہیں کہ ہمیشہ اس تجربے کا لازمی طور پر یہی نتیجہ نکلے گا۔

اس طرز تحقیق میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ محدود تجربے کو بنیاد بنا کر لا محدود نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

اس طرز تحقیق کے ساتھ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک نتیجے کی وجہ معلوم ہوئے بغیر صرف تجربے کی بنیاد پر اس نتیجے کو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مثلاً جب نیوٹن نے یہ دیکھا کہ درخت سے سیب ہمیشہ نیچے گرتا ہے، اونچائی پر چڑھنے کے لئے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ سیارے سورج کے گرد گھومتے ہوئے اپنے مدار سے باہر نہیں نکل پاتے اگرچہ عام طور پر چیزیں خط مستقیم میں ہی سفر کرتی ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مادہ اپنی کمیت کے مطابق دوسرے مادے کو کھینچتا ہے۔ اس کھینچنے کی خصوصیت کو کشش ثقل کہتے ہیں۔ اور اسی بنیاد پر ہم علم ریاضی کے فارمولے کو استعمال کرتے ہوئے کسی جسم کی حرکت کے بارے میں پہلے ہی سے بتا سکتے ہیں اس کی حرکت کیسی ہو گی۔ لیکن اس تحقیق سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مادہ کیوں دوسرے مادے کو کھینچتا ہے۔

بہت سارے معاملات ایسے ہیں جو کہ ہمارے شعور سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، لیکن ہم اوپر بیان کئے گئے سائنسی علوم کے دائرے میں اس کی تشریح نہیں کر پاتے۔ مثلاً یہ سوال کہ کائنات ہمیشہ سے وجود رکھتی ہے یا کسی محدود وقت سے پہلے بنی، کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں، انسانی شعور کی کیا حقیقت ہے؟ آیا یہ ہمارے حیاتیاتی دماغ کا ہی حصہ ہے یا اس سے خارج میں کوئی چیز۔ اس طرح کے معاملے میں اپنی عقل کو استعمال کر کے غور و فکر کیا جاتا ہے اور استخراجی منطق کو استعمال کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے مشاہدے اور تجربے کا بہت محدود ہونا ہے۔ اس کو معقولات کہتے ہیں۔

علم فلسفہ کی ایک بنیادی بحث یہ ہے کہ علم کا منبع تجربات ہیں یا معقولات۔ ہم فی الحال اس بحث میں نہیں پڑتے، لیکن یہاں پر اس بات کی وضاحت کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ سائنسی علوم کی کچھ حدود ہیں۔ سائنس فی نفسہ تمام علوم کا احاطہ نہیں کرتی۔

چونکہ سائنس اوپر بیان کردہ کچھ بنیادی مفروضات رکھتا ہے اس لئے ہم کبھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ سائنسی دریافت سے جو علم حاصل ہوا وہ حتمی ہے۔

چونکہ سائنس محدود تجربات سے لاحدود نتائج اخذ کرتی ہے اس کی وجہ سے ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اگر حالات یا دیئے گئے پیرامیٹر میں کوئی جوہری تبدیلی آگئی تو نتیجہ ہمارے علم کے مطابق ہی نکلے گا یا نہیں۔

چونکہ سائنس کسی نتیجہ کی وجہ بتانے سے قاصر ہے اس لئے ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ جو چیز سائنس کے نزدیک آج حتمی کل بھی حتمی ہی رہے گی۔ سائنس کسی ظاہرے کی وجہ بتاتی ہے تو پھر اس کے جواب میں ایک اور ''کیوں'' چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جب اس نئے کیوں کا جواب ملتا ہے تو اس کے پیچھے ایک اور کیوں ضرور ہوتا ہے۔

سائنس کی غیر یقینیت کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ نیوٹین نے اپنے تجربات کی بناء پر کشش ثقل (Newton's law of gravitation) دریافت کیا۔ اسی طرح نیوٹن نے حرکیات کے تین مشہور کلیے (Newton's laws of motion) دریافت کئے۔ جس کی وجہ سے نیوٹن کو دنیا کا سب سے عظیم تر سائنسدان مانا جاتا ہے۔

لیکن جب تکنالوجی میں زیادہ ترقی ہونے کی وجہ سے درست ترین پیمائش کے نئے طریقے ایجاد ہوئے تو پتہ چلا کہ نیوٹن کے کلیات سے اخذ ہونے والے نتائج میں واضح طور پر غلطی موجود ہے جو کہ نئے پیمائش کے طریقوں سے دیکھی جاسکتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں آئن سٹاین نے دو نظریات پیش کئے جنہیں Special theory of relativityاور General theory of relativity کا نام دیاجاتاہے۔عام نظریہ اضافت یا General theory of relativity کے مطابق جہاں پر بھی مادہ ہوتاہے وہاں پر خلامادے کی طرف ٹیڑھاہو جاتاہے۔اس طرح ویسے تو ایک جسم body خلا میں سیدھ میں ہی جارہاہوتاہے لیکن چونکہ خلاہی ٹیڑھاہو گیاہے اس لئے وہ مادے کی طرف جھک جاتاہے۔

اسی طرح حرکیاتی تحقیق کرتے ہوئے پتہ چلاکہ جب کوئی جسم body بہت زیادہ رفتار سے حرکت کرتی ہے تو نیوٹن کا دیا گیا فارمولا فیل ہو جاتاہے۔آئن سٹائن نے تحقیق کرکے بتایاکہ body کی رفتار روشنی کی رفتار سے جتنی زیادہ قریب ہو گی نیوٹن کے فارمولے میں اتنی زیادہ غلطی ہو جائے گی۔اس کے حل کے لئے آئن سٹائن نے نئی تحقیق پیش کی جسے خاص نظریہ اضافت کہاجاتاہے۔اس نظریے کے مطابق کسی جسم کی رفتار کی بنیاد پر فاصلہ اور وقت سکڑ کر چھوٹے ہو جاتے ہیں۔اسی نظریے کاایک نتیجہ یہ ہے کہ وقت بھی خلاکاایک بعد (Dimension) ہے۔یعنی جس طرح لمبائی چوڑائی اور اونچائی خلاکے ابعاد ہیں اسی طرح وقت بھی خلاکاہی ایک حصہ ہے۔اسی نظریے کاایک دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلاکہ مادہ اور قوت ایک ہی چیز کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ مادے کو قوت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور قوت کو مادے میں۔ اسی نظریے کو بنیاد بناکر ایٹمی تحقیق کی گئی اور یورینیم نامی مادے کو جزوی طور پر قوت میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس کو ایٹم بم اور نیوکلیر ریکٹر میں استعال کیاجاتاہے۔

ان دونوں نظریات نے سائنسی دنیامیں ایک بڑاانقلاب برپا کردیا جس کی وجہ سے انسان وجود، وقت، خلااور مادے کو بالکل ہی دوسرے انداز میں دیکھنے کے قابل بن گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بھی جان لیں کہ آئنسٹائن کے ہی دور میں نظریہ اضافت سے آگے بڑھ کر ایک تھیوری ایجاد ہوئی جسے کوانٹم تھیوری Quantum Theory کہتے ہیں۔اس نے مزید کچھ گتھیاں سلجھائیں تومزید کچھ الجھنیں پیدا کیں۔ قوانٹم فزکس دراصل مادے اور قوت کے بنیادی ذرات سے متعلق نئ تحقیق تھی۔اب تک سائنس کا نظریہ تھا کہ کائنات میں موجود ہر چیز ایک لگے بندھے قاعدے کے مطابق چلتی ہےاور اگر ہمیں ان قواعد کا علم ہو تو ہر ذرے کی حرکت یا رویے کے بارے میں بالکل صحیح پیشن گوئی کی جاسکتی ہے۔ لیکن کوانٹم فزکس نے ثابت کیا کہ انتہائی بنیادی ذرات کی سطح پر مادے کا رویہ بے ترتیب اور غیر متعین (Random) ہوتا ہے۔ہاں ان ذرات کے مجموعی رویے یا حرکت کے اوسط کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

آئن سٹائن کے عام نظریہ اضافت اور قوانٹم تھیوری میں تناقض ہے اور اب تک اس تناقض کو دور کرنے کی راہ نہیں نکل سکی۔ اس تناقض کو دور کرنے کے لئے سائنسدانوں کی تجویز یہ ہے کہ خلا کے چار ابعاد (Dimensions) کو ماننے کے بجائے مزید ابعاد کو مانا جائے جن کا ادراک انسان کا شعور نہیں کرسکتا۔

اوپر بیان کردہ کشش ثقل کی مثال سے کچھ باتیں واضح ہوتی ہے۔

چیزوں کا نیچے گرنا عام مشاہدے کی چیز ہے جس سے ہر کوئی واقف ہے۔ جب اشیاء اور قوانین فطرت کے بارے میں انسان متجسس ہوا تو اس وقت کی معلومات کے پیش نظر کشش ثقل کا نظریہ تیار ہوا اور تقریباً تین صدیوں تک اس کو قابل قبول سمجھا گیا۔

لیکن جب نئی معلومات اور پیمائش کے آلے تیار ہوئے تو جو نظریہ تین صدیوں تک قابل قبول تھا اس کی غلطی واضح ہو گئی۔

اس کے بعد نئے نظریے کی تدوین ہوئی جو کہ ریاضیاتی حساب سے تو بالکل صحیح ہے لیکن کونٹم فزکس کا نظریہ اس نظریہ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ان دونوں نظریات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہ نظریہ پیش کا گیا کہ خلا کے چار سے زیادہ ابعاد (Dimensions) ہیں۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بالکل ہی صحیح ہیں کہ سائنس کی کوئی بھی تحقیق حتمی نہیں ہے۔ جب تک نئی دریافتیں اور نئی معلومات حاصل ہوتی رہیں گی سائنس اپنے نظریات بدلتی رہے گی۔ ہم کبھی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں گے کہ ہم یہ دعوی کر سکیں کہ سائنس نے کسی بھی قانون کی مکمل حقیقت دریافت کر لی۔

سائنس کی دریافتوں میں تضاد اور خلا موجود ہوتے ہیں اور سائنس دان ان تضادات میں مطابقت پیدا کرنے کی تگ ودو میں مصروف رہتے ہیں۔

چونکہ موجودہ دور کی محیر العقول دریافتوں کی نظیریں تاریخ انسانی میں نہیں ملتی اس لئے کچھ سائنس گرد اس سائنسی ترقی سے شدید متاثر ہو کر یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اس دور میں معقولات غیر ضروری چیز ہیں اور

سائنسی طریقہ ہر قسم کی علمی ضرورت کو کفایت کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان محیر العقول دریافتوں کے باوجود یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سائنس کی ہر نئی دریافت قانون فطرت کی ایک پرت کو کھول دیتی ہے اور اس کے نیچے ایک اور پرت ہوتی ہے جو اس بھی زیادہ دبیز ہوتی ہے۔ اس لئے انسانی علوم سے معقولات کو ختم کر کے سائنس کو معقولات کی جگہ دینا ایک بے کار کی کوشش ہے۔ سائنس نے چاہے جتنی ترقی کر لی ہو، ابھی معقولات کا متبادل بننے کا دعوی بہت جلد ہے۔ اس لئے سائنس کا دائرہ اپنی حدود میں ہی رہے گا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سائنسی ترقی نے ہمارے رہن سہن اور انداز فکر میں بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔ لیکن یہ دعوی کہ سائنس کسی بھی چیز کی مکمل حقیقت معلوم کر سکتی ہے ایک بے بنیاد دعوی ہے۔ سائنس آگہی کا ایک آلہ (Tool) ہے جس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

اب آتے ہیں معجزے کی سائنسی توجیہہ پر۔ اس بارے میں دو ممکنہ مؤقف ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ جو بھی معجزے ہوئے وہ قانون فطرت کے مطابق ہی ہوئے۔ لیکن چونکہ ہم ابھی قانون فطرت سے مکمل واقفیت نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کا دعوی کرتے ہیں اس لئے ان معجزات اور معلوم قوانین فطرت کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہاں پر یہ واضح ہو کہ معجزات کے قوانین فطرت کے مطابق ہونے سے معجزے کی اصل حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ مثلاً اگر کوئی کل کو یہ ثابت کرے کہ موسی علیہ السلام کے لئے دریا میں راستہ بنانے کی سائنسی توجیہہ ممکن ہے پھر بھی ان راستوں کے بننے اور عین موسی علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ عین اسی وقت دریا کے پاس پہونچنے کی ٹائمنگ کی توجیہہ صرف ارادہ خداوندی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ حسن اتفاق بہر حال اخلاقی ہی ہے نہ کہ سائنسی۔

اس بارے میں دوسرا موٴقف یہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ اللہ کے حکم سے کائنات کا ذرہ ذرہ ایک لگے بندھے سائنسی قانون کے مطابق چل رہا ہے، اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی مخلوقات اللہ کے حکم سے ان قوانین سے انحراف نہیں کر سکتی۔ یہ ماننا کہ تمام مخلوقات قوانین فطرت کے مطابق ہی چلتی ہے اور اس سے انحراف نہیں کرتی، سائنس کا ایک مفروضہ ہے جس کے بغیر سائنس ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ لیکن یہ دعوی کے یہ کلی وبدیہی حقیقت ہے ایک لغو ترین دعوی ہے۔

اس لئے معجزات کی سائنسی توجیہہ دینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ جب سائنس یہ دعوی کرنے کے قابل ہو جائے کہ اس نے کائنات کی تمام حقیقتوں کو دریافت کے لیا تب سامنے آئے۔ ہم پھر بات کر لیتے ہیں۔

اوپر یہ واضح ہو چکا ہے کہ دونوں قسم کے معجزات میں صاحب معجزہ یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ وہ جب چاہے اپنی مرضی سے معجزے دہرا سکتا ہے۔ اس لئے معجزے تجرباتی سائنس کے دائرے میں نہیں آتے۔

اس تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائنس کی بنیاد پر معجزے پر اعتراض کرنے والے بنیادی طور پر دو غلطیوں پر اصرار کرتے ہیں۔

اول یہ کہ وہ سائنسی دریافتوں کو حتمی سمجھتے ہیں اور دوم یہ کہ وہ تمام علوم کو نیچرل سائنس کے دائرے کے اندر سمجھتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ پہلے موٴقف کو ماننے کی صورت میں یہ بات غیر ثابت شدہ ہو جاتی ہے کہ سائنس اور معجزے میں تناقض موجود ہے۔ اور دوسرے موٴقف کو ماننے کی صورت میں اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ

معجزے اور سائنس میں مطابقت پیدا کی جائے۔ کسی چیز میں اندرونی تضاد ہونا ایک علیحدہ بات ہے اور کسی چیز کا سائنس کے مطابق نہ ہونا ایک الگ بات۔

اس سطح پر جا کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معجزے کو دوبارہ تجربہ کر کے دہرایا نہ جائے تو پھر معجزے کے ماننے کے کیا معنی ہیں۔ اول تو یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ معجزے کو ماننا کوئی اسلام کی بنیادی دعوت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے معجزے کا مشاہدہ کیا ان کے لئے معجزہ نبی کی نبوت کی دلیل ہے۔ لیکن خاتم الانبیاء کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہم یہ دعوت نہیں دیتے کہ چونکہ نبی نے شق القمر کا معجزہ کیا ہے یا نبی ﷺ نے معراج کا سفر کیا ہے اس لئے انہیں نبی مانا جائے۔ آج کے دور میں معجزے پر ایمان کی حیثیت ایک عقیدے کی بحث ہے نہ کہ نبوت کی دلیل۔ ہم معجزے کو اس لئے مانتے ہیں کیوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ فطری قوانین جن کی تگ و دو سائنس کرتا ہے وہ اللہ کے ہی بنائے ہوئے ہیں اور اللہ چاہے تو جب چاہیں انہیں تبدیل کر دے۔ یہاں پر واضح ہو کہ کچھ لوگ سائنسی قانون کو سنت اللہ قرار دے کر یہ دعوی کرتے ہیں کہ اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ کلام پاک میں سنت اللہ کسی اور ہی چیز کو کہا گیا ہے اس لئے اس بارے میں کسی قسم کی الجھن کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ سنت اللہ وہی کچھ ہے جس کو اللہ اپنی سنت قرار دے۔

آج کے دور میں ہم اسلام کی دعوت قرآن کی بنیاد پر دیتے ہیں جو کہ خود نبی کا ایک زندہ معجزہ ہے اور آج بھی قابل مشاہدہ ہے۔ یہ قرآن انسان کی منطقی، جمالیاتی، اخلاقی اور کلامی حس سے اپیل کرتا ہے۔ جو لوگ ہدایت کے لئے حسی معجزات کا تقاضا کرتے ہیں تو در اصل ایمان بالغیب کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جس چیز پر ایمان لانا ہے اس کے لئے معقول دلیل نہیں بالکل مشاہدہ ضروری ہے۔ قرآن

کے بالکل ہی ابتداء میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ہدایت کے لئے شرط ایمان بالغیب ہے۔ معجزے کے ذریعے مشاہدے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس کے بعد مہلت ختم ہو جاتی ہے۔اس لئے اللہ کی حکمت یہی رہی کہ اب انسان اپنے شعور، جمالیاتی اور اخلاقی حس کی بنیاد پر ایمان لے آئے۔

ہماری اس بحث سے کچھ نتائج واضح ہو جاتے ہیں۔

ا۔ فی زمانہ ہماری دعوت کی بنیاد حسی معجزات نہیں بلکہ انسانی شعور سے اپیل کی بنیاد پر ہے۔آج کے دور میں معجزات کی حقیقت ایک عقیدے کے طور پر ہے نہ کی دعوت کی بنیاد کے طور پر۔ معجزے صرف وقتی طور پر غیب کے پردے کو ہٹانے کے لئے تھے۔ہدایت کے لئے ایمان بالغیب ہی شرط ہے۔

۲۔ کسی چیز کا مشاہدہ یا تجربہ نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ چیز خلاف عقل ہے۔علوم کی بہت ساری جہتیں صرف معقولات پر انحصار کرتی ہیں۔

۲۔ سائنسی اعتبار سے یہ دعوی کرنا درست نہیں ہے کہ سائنس حقیقت کے تمام جوانب سے واقف ہو چکی ہے اس لئے معجزے کے صحیح ہونے کے لئے معلوم سائنسی اصولوں کے مطابق ہونا کوئی ضروری نہیں۔ موجودہ سائنسی علوم میں خود اس کے اندرونی تضادات موجود ہیں۔

۳۔ سائنس انسانی علوم کی صرف ایک جہت ہے۔انسانی علوم کے کچھ پہلو سائنس کے دائرے میں نہیں آتے۔اس لئے معجزات کی سائنسی تشریح غیر ضروری ہے۔

۴۔اسلامی عقیدے کے مطابق معجزات اور کرامات کو کوئی انسان اپنی مرضی سے تجربہ کر کے اس کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔اس لئے معجزے کو سائنسی تجربہ کر کے ثابت کرنے کو شش عبث ہے۔جب دعوی ہی موجود نہیں تو ثبوت کی طلب بے معنی ہے۔

تحریر ذیشان وڑائچ

3

معجزہ اور علت و معلول

اٹھاریوں و انیسویں صدی کی الحادی سائنس (خصوصا فزکس) سے دماغ کچھ یوں مبہوت ھوئے کہ بڑے بڑے ذہین مسلمان بھی اس کے سامنے سرنگوں دکھائی دیئے۔ اسی کے زیر اثر سرسید جیسوں نے قرآن کے بیان کردہ معجزات کی ایسی مادی تشریحات پیش کیں جن سے انکا معجزاتی پہلو معدوم ھو کر رہ گیا۔ اس فکری کج روی کی وجہ سائنس کے اس دعوے کا رعب تھا کہ "علل و معلول کے درمیان ایسا لازمی تعلق ھے جسکی ضد ناممکن ھے"۔

درحقیقت یہ دعوی کوئی نیا دعوی نہ تھا بلکہ معتزلہ کے یہاں بھی پایا جاتا تھا جو بعینہ اسی دلیل کی بنیاد پر معجزات پر ھاتھ صاف کیا کرتے تھے۔ امام نے تہافت الفلاسفہ میں اس دلیل کی بے ثباتی جس خوبصورت و قطعی انداز میں واضح کی وہ فلسفے کی دنیا کا ایک اعلی ترین شاھکار بن چکی ھے (مغربی دنیا میں ڈیوڈ ھیوم نے امام سے تقریبا آٹھ سو سال بعد اسی بنیاد پر علل و معلول کے قانون کا نقد پیش کیا تھا)۔

چنانچہ امام (فلاسفہ کے مسئلہ نمبر 17 کے رد میں) بتاتے ہیں کہ جسے ھم علت و معلول کہتے ھیں انکی حقیقت بس صرف اتنی ھے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بعد ظہور پزید ھوتا ھے۔ یہ سمجھنا کہ علت و معلول میں ایک ضروری ربط پایا جاتا ھے اور علت معلول کو پیدا کرتی ھے یہ محض ایک بے بنیاد ظن ھے۔ علت میں نہ کوئی ایسی قوت پائی جاتی ھے جس کی وجہ سے وہ معلول کو وجود بخش سکے اور نہ ہی ان دونوں میں کوئی لازمی و قطعی ربط پایا جاتا ھے جسکی ضد کا تصور محال ھو۔ علل و معلول کی حیثیت مخصوص ترتیب

واقعات کے انسانی تجربے (عادت) سے زیادہ کچھ نہیں۔ واقعات کی ترتیب میں جس امر کا ھم عادتا مشاھدہ کرتے ہیں وہ محض 'دو واقعات کی ترتیب' ھوتی ھے نہ کہ 'علت (cause) '، علت تو محض ایک '' ذہنی خیال ھے '' جس کے ذریعے ھم مشاھدے میں آنے والے واقعات میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بس۔

امام مزید بتاتے ہیں کہ افعال کا اقتران تقدیر الہی کی وجہ سے ھوتا ھے، اگر ایک فعل دوسرے کے بعد ھوتا ھے تو اسکی وجہ یہ ھے کہ خدا نے انہیں اس طرح پیدا کیا ھے، نہ اس وجہ سے کہ ربط خود ضروری اور ناقابل شکست ھے، تقدیر الہی یوں بھی ھو سکتی تھی کہ بغیر کھائے پیٹ بھر جائے اور گردن کٹنے کے بعد بھی زندگی قائم رھے.... آگ کے روئی کو جلانے کا فاعل ثابت کرنے میں فلسفیوں کے پاس سوائے اس کے کیا دلیل ھے کہ روئی جب آگ سے متصل ھوتی ھے تو وہ جل اٹھتی ھے؟ یعنی انکے پاس محض یہ مشاھدہ ہی ایک دلیل ھے، مگر اس پر کوئی دلیل نہیں کہ یہ فعل بذات خود آگ کا ھے (پھر امام بہت سی مثالوں سے اسکی وضاحت کرتے ہیں)۔

پس واقعات کی ترتیب اس وقت تک قائم رھتی ھے جب تک خدا کا اذن موجود ھو، جب وہ چاھتا ھے اس ترتیب کو اپنے اذن سے بدل دیتا ھے۔ لہذا معجزے کا انکار کرنا در حقیقت قدرت الہی کو محدود کرنے کے ھم معنی ھے۔ افسوس کہ جدید مسلم متجددین نے نہ اپنوں کے علم الکلام کو غور سے پڑھا اور نہ ہی اھل مغرب کے اور چل نکلے قرآن کی تاویلات باطلہ کرنے۔

زاہد مغل

4

واقعہ معراج اور جدید ذہن کے اشکالات

کہا جاتا ہے کہ موجودہ سائنس انسانی شعور کے ارتقاء کا عروج ہے لیکن سائنس دان اور دانشور یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ انسان قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کا ابھی تک صرف پانچ فیصد حصہ استعمال کر سکا ہے۔ قدرت کی عطا کردہ بقیہ پچانوے فیصد صلاحیتیں انسان سے پوشیدہ ہیں۔ وہ علم جو سو فیصد صلاحیتوں کا احاطہ کرتا ہو، اُسے پانچ فیصدی محدود ذہن سے سمجھنا ناممکن امر ہے۔ واقعہ معراج ایک ایسی ہی مسلمہ حقیقت ہے جدید علم جس کو ابھی تک مکمل سمجھ نہیں پایا۔ معجزات و کرامات کی حقیقت مشاہدے اور فطری قوانین سے مکمل بیان نہیں جاسکتی کیونکہ یہ مافوق الفطرت ہوتے ہیں لیکن جدید سائنس آج جہاں تک پہنچ چکی ہے ایسے کاموں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناممکن اور غیر معقول و محال ہیں۔ واقعہ معراج بعض لوگوں کی سمجھ میں اس لیے نہیں آتا کہ وہ کہتے ہیں کہ :

ایسے فضائی سفر میں پہلی رکاوٹ کشش ثقل ہے کہ جس پر کنڑول حاصل کرنے کے لیے غیر معمولی وسائل وذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لیے کم از کم چالیس ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے۔

دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہوا نہیں ہے جبکہ ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

تیسری رکاوٹ ایسے سفر میں اس حصے میں سورج کی جلا دینے والی تپش ہے کہ جس حصے پر سورج کی مستقیماً روشنی پڑ رہی ہے اور اس حصے میں مار ڈالنے والی سردی ہے کہ جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی۔

اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ فضائے زمین سے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز Cosmic Rays الٹراوائلٹ ریز Ultra Violet Rays اور ایکس ریز X-Rays ۔ یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو بدن کے آرگانزم Organism کے لیے نقصان وہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں بہت تباہ کن ہوتی ہیں۔(زمین پر رہنے والوں کے لیے زمین کے اوپر موجود فضا کی وجہ سے ان کی تپش ختم ہو جاتی ہے)۔

ایک اور مشکل اس سلسلے میں یہ ہے کہ خلا میں انسان بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اگرچہ تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اگر زمین کے باسی بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلا میں جا پہنچیں تو بے وزنی سے نمٹنا بہت ہی مشکل یا ناممکن ہے۔

آخری مشکل اس سلسلے میں زمانے کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دور حاضر کے سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی شخص آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ روشنی کی رفتار سے بہت کم رفتار پر زمین پر آنے والے شہابئے ہوا کی رگڑ سے جل جاتے ہیں اور فضاء ہی میں بھسم ہو جاتے ہیں تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حضور ﷺ اتنا طویل سفر پلک جھپکنے میں طے کر سکے۔

مندرجہ بالا اعتراضات کی وجہ سے کچھ مخلص مسلمانوں نے یہ تاویل کرنی شروع کر دی کہ معراج خواب میں ہوئی اور یہ کہ حضور ﷺ غنودگی کی حالت میں تھے اور پھر آنکھ لگ گئی اور یہ تمام واقعات عالم رؤیا میں آپ ﷺ نے دیکھے یا روحانی سفر درپیش تھا۔ جسم کے ساتھ اتنے زیادہ فاصلوں کو لمحوں میں طے کرنا ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ حالانکہ اسراء کے معنی خواب کے نہیں جسمانی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں لفظ ''سبحان الذی'' سے ابتداء خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ غیر معمولی واقعہ تھا جو فطرت کے عام قوانین سے ہٹ کر واقع ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا مقصود تھا۔ لہٰذا رات کے ایک قلیل حصے میں یہ عظیم الشان سفر پیش آیا۔ اور یہ وقت زمان و مکان کی فطری قیود سے آزاد تھا۔ واقعہ معراج اگر خواب ہوتا تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ خواب میں اکثر انسان مافوق الفطرت اور محیر العقول باتیں دیکھتا ہی ہے۔

☆واقعہ معراج کی ممکن سائنسی توجیہات:

آئن سٹائن کا نظریہ اضافت یا تھیوری آف ریلیٹویٹی

آئن سٹائن کا نظریہ اضافت یا تھیوری آف ریلیٹویٹی دو حصوں پر مبنی ہے۔ایک حصہ '' نظریہ اضافیت خصوصی (Special Theory of Relativity)'' کہلاتا ہے جبکہ دوسرا حصہ '' نظریہ اضافیت عمومی (General Theory of Relativity) '' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ خصوصی نظریہ اضافیت کو سمجھنے کے لیے ہم ایک مثال کا سہارا لیں گے۔

فرض کیجئے کہ ایک ایسا راکٹ بنالیا گیا ہے جو روشنی کی رفتار (یعنی تین لاکھ کلومیٹر فی سکینڈ) سے ذرا کم رفتار پر سفر کرسکتا ہے۔اس راکٹ پر خلاء بازوں کی ایک ٹیم روانہ کی جاتی ہے۔راکٹ کی رفتار اتنی زیادہ ہے کہ زمین پر موجود تمام لوگ اس کے مقابلے میں بے حس و حرکت نظر آتے ہیں۔راکٹ کا عملہ مسلسل ایک سال تک اسی رفتار سے خلاء میں سفر کرنے کے بعد زمین کی طرف پلٹتا ہے اور اسی تیزی سے واپسی کا سفر بھی کرتا ہے مگر جب وہ زمین پر پہنچتے ہیں تو انہیں علم ہوتا ہے کہ یہاں توان کی غیر موجودگی میں ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔اپنے جن دوستوں کو وہ لانچنگ پیڈ پر خداحافظ کہہ کر گئے تھے،انہیں مرے ہوئے بھی پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا ہے اور جن بچوں کو وہ غاؤں غاؤں کرتا ہوا چھوڑ گئے تھے وہ سن رسیدہ بوڑھوں کی حیثیت سے ان کا استقبال کر رہے ہیں۔وہ شدید طور پر حیران ہوتے ہیں کہ انہوں نے تو سفر میں دو سال گزارے لیکن زمین پر اتنے برس کس طرح گزر گئے۔اضافیت میں اسے ''جڑواں تقاقضہ '' (Twins Paradox) کہا جاتا ہے اور اس تقاقضے کا جواب خصوصی نظریہ اضافیت ''وقت میں

تاخیر (Time Dilation) ‘‘کے ذریعے فراہم کرتا ہے۔جب کسی چیز کی رفتار بے انتہاء بڑھ جائے اور روشنی کی رفتار کے قریب پہنچنے لگے تو وقت ساکن لوگوں کے مقابلے میں سست پڑنا شروع ہو جاتا ہے ،یعنی یہ ممکن ہے کہ جب ہماری مثال کے خلائی مسافروں کے لئے ایک سکینڈ گزرا ہو تو زمینی باشندوں پر اسی دوران میں کئی گھنٹے گزر گئے ہوں۔اسی مثال کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وقت صرف متحرک شے کے لئے آہستہ ہوتا ہے۔لہٰذا اگر کوئی ساکن فرد مذکورہ راکٹ میں سوار اپنے کسی دوست کا منتظر ہے تو اس کے لیے انتظار کے لمحے طویل ہوتے چلے جائیں گے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آکر ہم نظریہ اضافیت کے ذریعے واقعہ معراج کی توجیہ میں غلطی کر جاتے ہیں۔یہ ایک حقیقت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ معراج کے سفر سے واپس آئے تو حجرہ مبارک کے دروازے پر لٹکی ہوئی کنڈی اسی طرح ہل رہی تھی جیسے کہ آپ ﷺ چھوڑ کر گئے تھے۔گویا اتنے طویل عرصے میں زمین پر ایک لمحہ بھی نہیں گزرا۔اگر خصوصی نظریہ اضافیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس واقعے کی حقانیت جاننے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہو گا کہ اصلاً زمین پر آنحضرت ﷺ کی غیر موجودگی میں کئی برس گزر جانے چاہئیں تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

نظریہ اضافیت ہی کا دوسرا حصہ یعنی ’’عمومی نظریہ اضافیت‘‘ ہمارے سوال کا تسلی بخش جواب دیتا ہے ۔عمومی نظریہ اضافیت میں آئن سٹائن نے وقت (زمان)اور خلاء (مکان) کو ایک دوسرے سے مربوط کرکے زمان و مکان(Time and Space) کی مخلوط شکل میں پیش کیا ہے اور کائنات کی اسی انداز سے منظر کشی کی ہے۔کائنات میں تین جہتیں مکانی (Spatial Dimensions) ہیں جنہیں ہم لمبائی، چوڑائی اور اونچائی (یا موٹائی) سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ ایک جہت زمانی ہے جسے ہم وقت کہتے

ہیں۔اس طرح عمومی اضافیت نے کائنات کو زمان ومکان کی ایک چادر(Sheet) کے طور پر پیش کیا ہے ۔تمام کہکشائیں، جھرمٹ، ستارے، سیارے، سیارچے اور شہابئے وغیرہ کائنات کی اسی زمانی چادر پر منحصر ہیں اور قدرت کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کے تابع ہیں۔انسان چونکہ اسی کائنات مظاہر کا باشندہ ہے لہٰذا اس کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں۔آئن سٹائن کے عمومی نظریہ اضافیت کے تحت کائنات کے کسی بھی حصے کو زمان ومکان کی اس چادر میں ایک نقطے کی حیثیت سے بیان کیا جاسکتا ہے۔اس نظریے نے انسان کو احساس دلایا ہے کہ وہ کتنا بے وقعت اور کس قدر محدود ہے۔

کارل ساگان (Carl Sagan) جو ایک مشہور امریکی ماہر فلکیات ہے ،اپنی کتاب ''کائنات '' (Cosmos)میں ایک فرضی مخلوق کا تصور پیش کرتا ہے جو صرف دو جہتی (Two Dimensional)ہے۔وہ میز کی سطح پر پڑنے والے سائے کی مانند ہیں۔انہیں صرف دو مکانی جہتیں ہی معلوم ہیں۔جن میں وہ خود وجود رکھتے ہیں یعنی لمبائی اور چوڑائی۔چونکہ وہ ان ہی دو جہتوں میں محدود ہیں لہٰذا وہ نہ تو موٹائی یا اونچائی کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے یہاں موٹائی یا اونچائی کا کوئی تصور ہے۔وہ صرف ایک سطح (Surface) پر ہی رہتے ہیں ۔ایسی ہی کسی مخلوق سے انسان جیسی سہ جہتی (Three Dimensional)مخلوق کی ملاقات ہو جاتی ہے۔راہ ورسم بڑھانے کے لئے سہ جہتی مخلوق،اس دو جہتی مخلوق کو آواز دے کر پکارتی ہے۔اس پر دو جہتی مخلوق ڈر جاتی اور سمجھتی ہے کہ یہ آواز اس کے اپنے اندر سے آئی ہے۔سہ جہتی مخلوق،دو جہتی سطح میں داخل ہو جاتی ہے تاکہ اپنا دیدار کرا سکے مگر دو جہتی مخلوق کی تمام تر حسیات صرف دو جہتوں تک ہی محدود ہیں۔اس لیے وہ سہ جہتی مخلوق کے جسم کا وہی حصہ دیکھ پاتی ہے جو اس سطح پر ہے۔وہ مزید خوف زدہ ہو جاتی ہے۔اس کا خوف دور کرنے کے لیے سہ جہتی

مخلوق، دو جہتی مخلوق کو اونچائی کی سمت اٹھا لیتی ہے اور وہ اپنی دنیا والوں کی نظر میں ''غائب'' ہو جاتا ہے حالانکہ وہ اپنے اصل مقام سے ذرا سا اوپر جاتا ہے۔ سہ جہتی مخلوق اسے اونچائی اور موٹائی والی چیزیں دکھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ ایک اور جہت ہے جس کا مشاہدہ وہ اپنی دو جہتی دنیا میں رہتے ہوئے نہیں کر سکتا تھا۔ آخر کار دو جہتی مخلوق کو اس کی دنیا میں چھوڑ کر سہ جہتی مخلوق رخصت ہو جاتی ہے۔ اس انوکھے تجربے کے بارے میں جب یہ دو جہتی مخلوق اپنے دوستوں کو بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس نے ایک نئی جہت کا سفر کیا ہے جسے اونچائی کہتے ہیں، مگر اپنی دنیا کی محدودیت کے باعث وہ اپنے دوستوں کو یہ سمجھانے سے قاصر ہے کہ اونچائی والی جہت کس طرف ہے۔ اس کے دوست اس سے کہتے ہیں کہ آرام کرو اور ذہن پر دباؤ نہ ڈالو کیونکہ ان کے خیال میں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ہم انسانوں کی کیفیت بھی دو جہتی سطح پر محدود اس مخلوق کی مانند ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری طبعی قفس (Physical Prison) چہار جہتی ہے اور اسے ہم وسیع و عریض کائنات کے طور پر جانتے ہیں۔ ہماری طرح کائنات میں روبہ عمل طبعی قوانین بھی ان ہی چہار جہتوں پر چلنے کے پابند ہیں اور ان سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم بالا کی کائنات کی تفہیم ہمارے لیے ناممکن ہے اور اس جہاں دیگر کے مظاہر ہمارے مشاہدات سے بالاتر ہیں۔

اب ہم واپس آتے ہیں اپنے اصل موضوع کی طرف۔ عالم دنیا یعنی قابل مشاہدہ کائنات اور عالم بالا یعنی ہمارے مشاہدے و ادراک سے ماوراء کائنات دو الگ زمانی و مکانی چادریں ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے قریب تو ہو سکتی ہیں لیکن بے انتہاء قربت کے باوجود ایک کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا دوسری کائنات میں ہونے والے عمل پر نہ اثر پڑے گا اور نہ اسے وہاں محسوس کیا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ زمان و مکان کی

کائناتی چادر کے ایک نقطے پر سے دوسری زمانی و مکانی چادر پر پہنچے اور معراج کے مشاہدات کے بعد (خواہ اس کی مدت کتنی ہی طویل کیوں نہ رہی ہو) آنحضرت ﷺ زمان و مکان کی کائناتی چادر کے بالکل اسی نقطے پر واپس پہنچ گئے جہاں آپ ﷺ معراج سے قبل تھے۔ اور یہ وہی نقطہ تھا جب آنحضرت ﷺ کو دروازے کی کنڈی اسی طرح ہلتی ہوئی ملی جیسی کہ وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ معراج کے واقعے میں وقت کی تاخیر کی بجائے زمان و مکان میں سفر (ٹائم ٹریول) والا نظریہ زیادہ صحیح محسوس ہوتا ہے۔

ٹائم ٹریول:

آجکل سائنسی دنیا میں ٹائم ٹریولز یا وقت میں سفر کا تذکرہ عام ہے۔ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے جس پر بنی فلمیں عام لوگوں کے لیے سائنس فکشن ہی ہوتی ہیں۔ کیا یہ کہانی سے بڑھ کر بھی کچھ ہے؟ کیا وقت میں سفر ممکن ہے؟ آئیں پہلے آسان لفظوں میں سمجھیں کہ وقت میں سفر Time travel کیا ہے۔ ہمیں جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ روشنی کا کسی چیز سے منعکس ہو کر اس کا عکس ہماری آنکھ کے ذریعے اعصاب تک لے جانے کی وجہ سے ہے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل یا تقریباً تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ ہے جس کی وجہ سے ہمیں اطراف کے مناظر فوراً نظر آجاتے ہیں۔ اگر کوئی چیز زمین سے تین لاکھ کلو میٹر دور ہے تو اس سے منعکس ہونے والی روشنی کی کرن ہماری آنکھوں تک ایک سیکنڈ میں پہنچے گی، اس طرح ہمیں وہ چیز ایک سیکنڈ پہلے والی نظر آئے گی۔ سورج کا فاصلہ زمین سے 150 ملین کلو میٹر ہے اور اس کی کرن ہم تک تقریباً آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہمیں جو سورج نظر آتا ہے وہ آٹھ منٹ پہلے کا ہوتا ہے۔

ٹائم ٹریول کو سمجھنے کے لیے فرض کریں، اگر ہم روشنی کی دگنی رفتار سے سورج جتنے فاصلے پر موجود کسی ستارے یا سیّارے پر جا کر پلٹ آئیں تو ہمارا جانا چار منٹ میں اور واپسی بھی چار منٹ میں ہو گی اور کل سفر آٹھ منٹ میں ہو گا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہو گی کہ زمین پر پہنچ کر ہم خود اپنے آپ کو واپسی کا سفر کرتے دیکھیں گے ! وجہ اس کی یہ ہو گی کہ کیونکہ روشنی کی وہ کرنیں جو ہم سے ٹکرا کے منعکس ہو کر ہماری متحرّک تصاویر images لے کر زمین کی طرف آرہی تھیں، اُن کو تو قدرتی طور پر ہماری آنکھ تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لگنے ہیں جبکہ ہم اُن سے پہلے (چار منٹ میں) روشنی کی دگنی رفتار کی وجہ سے زمین پر آگئے. اس طرح ہمارے متحرّک عکس قدرتی وقت (آٹھ منٹ) میں ہماری آنکھوں میں داخل ہوں گے، جس کی وجہ سے ہم خود کو دیکھ رہے ہوں گے۔ یہی مستقبل یا وقت میں سفر ہے، اسی کو ٹائم ٹریول Time Travel کہا جاتا ہے، یعنی روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار سفر جس میں حال present پیچھے رہ جاتا ہے۔ جب آپ ﷺ سفر معراج سے واپس تشریف لائے تو زمین پر وقت وہی تھا حالانکہ آپ بہت طویل وقت یہاں سے غیر حاضر رہے تھے۔ ظاہر یہی ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے روشنی کی رفتار سے بھی بہت زیادہ رفتار سے سفر کیا۔ اسی لیئے زمین پر وقت نہیں گزرا اور آپؐ کی واپسی ہو گئی۔ قرآن میں اس کا تذکرہ اس کے کتابِ الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان وقت میں سفر کر سکے؟ دیکھیے اس دور کے قابل ترین سائنسدان مسٹر ہاکنگ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

Quote: ‘I do believe in time travel. Time travel to the future. Time flows like a river and it seems as if each of us is

carried relentlessly along by time's current. But time is like a river in another way. It flows at different in different places and that is the key to travelling into the future. This idea was first proposed by Albert Einstein over 100 years ago.

میں وقت میں، مستقبل میں سفر پر یقین رکھتا ہوں۔ وقت ہم سب کو ساتھ میں لیے دریا کی طرح بہتا ہے، لیکن یہ ایک اور طرح سے دریا کی طرح بہتا ہے، یہ مختلف جگہوں پہ مختلف رفتار سے بہتا ہے اور یہی وقت میں سفر کی کلید ہے۔ یہ تصوّر 100 سال پہلے آئن اسٹائن نے دیا۔

مختصر یہ کہ زمان و مکان میں سفر یعنی وقت کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھنا فی الحال تھیوری میں قابل عمل جدید سائنسی نظریہ ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں، بس انسان کا مسئلہ اس کی علمی اور عملی استعداد ہے جو کہ فی الوقت محدود ہے۔ یعنی اس سفر کے سائنسی لوازمات کے لیے بے حساب علم اور استعداد کی ضرورت ہے۔ اب اس طرف توجّہ دیں کہ اس کائنات کے خالق نے وقت میں سفر کی نہ صرف عملی مثال قائم کی بلکہ اپنے کلام میں اس کا تذکرہ بھی کر دیا۔ یہ مثال 14 سو سال قبل سفر معراج میں عملًا دکھائی گئی۔ یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایک سپر سائنس یا سپر علم ہمیشہ سے کائنات میں کارفرما ہے جس کی عملی استعداد لامحدود ہے جو ہر کام کر گزرنے کی لامحدود قوّت رکھتی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے،

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گئی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔ (بنی اسرائیل،آیت 1)

جہاں تک معراج کی فضائی سفر کی تمام تر مشکلات کی بات ہے آج انسان علم کی قوت سے ان پر قابو حاصل کر چکا ہے اور سوائے زمانے کی مشکل کے باقی تمام مشکلات حل ہو چکی ہیں اور زمانے والی مشکل بھی بہت دور کے سفر سے مربوط ہے۔ مسئلہ معراج جو کہ خود اسلام کے مطابق ایک معجزہ ہے جو کہ اللہ کی لا متناہی قدرت وطاقت کے ذریعے ممکن ہوتا ہے اور انبیاء کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے۔ جب انسان یہ طاقت رکھتا ہے کہ سائنسی ترقی کی بنیاد پر ایسی چیزیں بنالے کہ جو زمینی مرکز ثقل سے باہر نکل سکتی ہیں، ایسی چیزیں تیار کرلے کہ فضائے زمین سے باہر کی ہولناک شعاعیں ان پر اثر نہ کر سکیں اور مشق کے ذریعے بے وزنی کی کیفیت میں رہنے کی عادت پیدا کرلے۔ جب انسان اپنی محدود قوت کے ذریعے یہ کام کر سکتا ہے تو پھر کیا اللہ اپنی لامحدود طاقت کے ذریعے یہ کام نہیں کر سکتا؟ چناچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿القمر:50﴾ ''اور ہمارا حکم ایسا ہے جیسے ایک پلک جھپک جانا''

سائنسدان جانتے ہیں کہ ایٹم کے بھی 100 چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں (Sub Atomic Particles)،ان میں سے ایک نیوٹرینو (Neutrino) ہے جو تمام کائنات کے مادے میں سے بغیر ٹکرائے گزر جاتا ہے، مادہ اس کے لیے مزاحمت پیدا نہیں کرتا اور نہ ہی وہ کسی مادی شے سے رگڑ کھاتا ہے ،وہ بہت چھوٹا ذرہ ہے اور نہ ہی وہ رگڑ سے جلتا ہے کیونکہ رگڑ تو مادے کی اس صورت میں پیدا ہو گی جب کہ وہ کم از کم ایٹم کی کمیت کا ہو گا۔ (ابھی حال ہی میں سرن لیبارٹری میں تحقیق کرنے والے سائنس دانوں

نے 23 ستمبر 2011 کو یہ اعلان کیا ہے کہ تجربات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ نیوٹرینو کی رفتار روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ ہے)

روایت کے مطابق جبرائیلؑ نے آپ ﷺ کو براق پر سوار کیا۔ براق، برق سے نکلا ہے، جس کے معنی بجلی ہیں، جس کی رفتار 186000 میل فی سیکنڈ ہے۔ اگر کوئی آدمی وقت کے گھوڑے پر سوار ہو جائے تو وقت اس کے لیے ٹھہر جاتا ہے یعنی اگر آپ 186000 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلیں تو وقت رک جاتا ہے کیونکہ وقت کی رفتار بھی یہی ہے۔ وقت گر جائے گا۔ کیونکہ وقت اور فاصلہ مادے کی چوتھی جہت ہے اس لیے جو شخص اس چوتھی جہت پر قابو پا لیتا ہے کائنات اس کے لیے ایک نقطہ بن جاتی ہے۔ وقت رک جاتا ہے کیونکہ جس رفتار سے وقت چل رہا ہے وہ آدمی بھی اسی رفتار سے چل رہا ہے۔ حالانکہ وہ آدمی اپنے آپ کو چلتا ہوا محسوس کرے گا لیکن کائنات اس کے لیے وہیں تھم جاتی ہے جب اس نے وقت اور فاصلے کو اپنے قابو میں کر لیا ہو۔ اس کے لیے چاہے سینکڑوں برس اس حالت میں گزر جائیں لیکن وقت رکا رہے گا اور جوں ہی وہ وقت کے گھوڑے سے اترے گا وقت کی گھڑی پھر سے ٹک ٹک شروع کر دے گی، وہ آدمی چاہے پوری کائنات کی سیر کر کے آجائے، بستر گرم ہو گا، کنڈی ہل رہی ہو گی اور پانی چل رہا ہو گا۔

اللہ جلّ جلالہ کی قدرتیں لاانتہاء ہیں، وہ ہر بات پر قادر ہے کہ رات کو جب تک چاہے روکے رکھے، اگر وہ روکے تو کوئی اس کی ذات پاک کے سوا نہیں جو دن نکال سکے۔ قرآن پاک میں فرمایا: ''آپ کہیے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ اگر قیامت تک تم پر رات کو مسلط کر دے تو اس کے سوا کون روشنی لا سکتا ہے؟ آپ کہیے کہ بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ چاہے تو قیامت تک تم پر دن ہی دن رہنے دے تو کون رات لا سکتا ہے اس کے

سوا، جس میں تم آرام پاؤ" ﴿القصص: 72تا71﴾ تو حق تعالیٰ کو پوری قدرت ہے وہ اگر چاہے تو وقت کو روک سکتا ہے۔

ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک گھر میں بیک وقت بلب جل رہے ہیں، پنکھے (سیلنگ فین) سے ہوا صاف ہو رہی ہے، ریڈیو سُنا جارہا ہے، ٹیلی وژن دیکھا جارہا ہے، ٹیلی فون پر گفتگو ہو رہی ہے، فریج میں کھانے کی چیزیں محفوظ کی جارہی ہیں، ائیر کنڈیشنڈ سے کمرہ ٹھنڈا ہو رہا ہے، ٹیپ ریکارڈر پر گانے ٹیپ ہو رہے ہیں، گرائنڈر میں مسالے پس رہے ہیں، استری سے کپڑوں کی شکنیں دور ہو رہی ہیں، سی ڈی پلیئرز پر فلمیں دیکھی جارہی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کسی نے بڑھ کر مین سوئچ آف کر دیا، پھر کیا تھا لمحوں میں ہر چیز نے کام کرنا بند کر دیا۔ معلوم ہوا یہ تمام کرنٹ کی کارفرمائی تھی۔ یہی حال کارخانوں کا ہے۔ کپڑا بُنا جارہا ہے، جیسے ہی بجلی غائب ہوئی تانے بانے بُننے والی کلیں رُک گئیں، جونہی کرنٹ آیا ہر چیز پھر سے کام کرنے لگی۔ آج کا انسان ان روزمرہ کے مشاہدات کے پیشِ نظر واقعہ معراج کی روایات کی صداقت کا ادراک کر سکتا ہے۔ روایتیں ملتی ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب سفرِ معراج سے واپس تشریف لائے تو بستر کی گرمی اسی طرح باقی تھی، وضو کا پانی ہنوز بہہ رہا تھا کنڈی ابھی ہل رہی تھی۔ چودہ سو سال پہلے اس پر یقین لانا ناممکنات میں سے تھا لیکن آج یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کرنٹ کی مثال سے یہ سمجھا جا سکتا ہے اس پر قابو پالینے سے کیسے ہر کام معطل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح وقت پر قابو پالیا جائے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے۔ ممکن ہے معراج کی شب نظامِ زمان و مکان معطل کر دیا گیا ہو، وقت رُک گیا ہو۔ کیا یہ خالقِ کائنات، نظامِ زمان و مکان کے بنانے والے کے لیے کچھ مشکل تھا؟۔ پھر جب انسانی صنعت سے خلائی جہاز چاند ، زہرہ اور مریخ تک پہنچ سکتے ہیں تو خدائی طاقت اور لاانتہاء قدرت رکھنے والے کے حکم سے کیا اس کے

رسول ﷺ شب معراج میں آسمانوں کو طے کر کے سدرۃ المنتہیٰ تک نہیں پہنچ سکتے ؟ ہے کوئی سوچنے والا ؟

یہ جدید ذہن کے عقلی اشکالات کے جواب میں معراج کی ممکنہ عقلی توجیہات تھیں کہ آج کے دور میں ایسے معاملات کو سمجھنا مشکل نہیں اور ایسے اعمال کا ہونا محال یا ناممکن نہیں کہا جا سکتا، ورنہ مذہبی عقائد مشاہدات کا نہیں ایمان بالغیب کا تقاضہ کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ خالص یقین واعتقاد کا ہے، جب توحید ورسالت مستند ذرائع سے ثابت ہو جائے تو پھر ان پر ایمان لانا اور اس کی حقیقت و کیفیت کو علمِ الٰہی کے سپرد کر دینا ہی عین عبادت ہے، یہ لازمی نہیں ہوتا کہ ایک مافوق الفطرت کی ہر بات فطرت کے مطابق بھی ہو، اس لیے ایمان کا حکم پہلے ہے۔ نبوت، وحی اور معجزوں کے تمام معاملات احاطہ عقل و قیاس سے باہر کی چیزیں ہیں جو شخص ان چیزوں کو قیاس کے تابع اور اپنی عقل و فہم پر موقوف رکھے اور کہے کہ یہ چیز جب تک عقل میں نہ آئے میں اس کو نہیں مانوں گا، تو سمجھنا چاہیے کہ وہ شخص ایمان کے اپنے حصہ سے محروم رہا۔ اللہ رب العزت ہمارے دلوں پر دین پر جمائے رکھے۔

تحریر ڈاکٹر احید حسن، مجیب الحق حقی

5

حضرت آدم، عیسی و حوا کی پیدائش کس سائنسی اصول کے تحت ہوئی؟

ایک ملحد نے ایک پوسٹ کی ہے جس پر ہمارے کچھ ردِالحاد کے ساتھی عجیب و غریب طریقے سے حضرت مریم علیہ السلام میں Y کروموزومز کی موجودگی کی وضاحتیں کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ وہ معجزات ہیں جن کا سائنس انکار کر سکتی ہے نہ کوئی وضاحت۔

ان کا پہلا سوال ہے۔

1۔ حضرت آدم کس سائنسی اصول یا قانون کے تحت مٹی کے پتلے پر پھونک مارنے سے زندہ ہو گئے؟

جواب۔ سادہ سا جواب ہے۔ کسی سائنسی اصول کے تحت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو کسی مردے میں جان ڈالنے کے لئے سائنس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔اس کے سارے کام کن فیکون سے ہو جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعتراض کر کون رہا ہے؟ سائنس اور نظریۂ ارتقاء کے حامی ملحد؟

ان کے پاس منہ نہیں یہ سوال کرنے جوگا۔

نظریہ ٔارتقاء کو جولوگ اچھے سے سمجھتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ سائنس آج تک پہلی حیات کی وضاحت نہیں کر پائی۔ایک یک خلوی جرثومے کے اندر کس سائنس دان نے پھونک ماری تھی جو وہ مردہ سے زندہ ہو گیا ؟

یہ سوال میں جب بھی کسی ارتقائی ملحد سے پوچھتا ہوں وہ جواب میں کہتا ہے کہ نظریہ ٔارتقاء کا یک خلوی جرثومے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ نظریہ ٔارتقاءاس سے ایک قدم آگے سے شروع ہوتا ہے۔

کیوں؟

کیوں کہ سائنس آپ کو یہ تو بتا سکتی ہے کہ وہ جرثومہ پودے میں کیسے بدلا مگر یہ بتانے سے قاصر ہے کہ بے جان چیزوں سے زندہ جرثومہ کیسے وجود میں آگیا۔ لہٰذا وہ اس سوال سے ہی جان چھڑا لیتے ہیں۔

اب اس سوال کا سادہ سا جواب یہ بنتا ہے کہ جس سائنسی اصول پر تین بے جان کیمیکلز کے ملاپ سے یک خلوی جرثومہ زندہ ہو گیا اسی سائنسی اصول پر حضرت آدم علیہ السلام بھی زندہ ہو گئے۔

آگے چلیئے۔اگلا سوال ہے۔

2۔جوان جہان بی بی حوا کس سائنسی اصول یا قانون کے تحت ایک مرد یعنی حضرت آدم کے پسلی سے پیدا ہو کر دنیا میں نمودار ہوئی تھی؟

جواب۔ پچھلے جواب کی روشنی میں اس کا جواب بھی وہی ہو گا۔

اللہ نے ہر جاندار جوڑوں میں بنایا ہے۔ لہٰذا جس سائنسی اصول پر آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اسی سائنسی اصول پر حوا علیہ السلام بھی پیدا ہوئیں۔

اب چلتے ہیں اگلے سوال پر جس پر سب سے زیادہ بحث ہے۔

3۔ سبکو پتہ ہے کہ مردوں میں xy کروموسومز ہوتے ہیں اور خواتین میں .xx سوال یہ ہے کہ کنواری بی بی مریم کو جو حمل ٹھہرا اس سے بعد میں ایک بچہ پیدا ہوا یعنی ایک ایسا انسان جو کہ xy کروموسومز کے ملاپ سے وجود میں آیا۔ مجھے وہ سائنسی اصول یا قانون بتائیں جس کے تحت کسی انسانی خاتون میں بغیر کسی y کروموسوم کے کوئی male بے بی پیدا ہو سکتا ہے؟

جواب۔ ارتقاء کی تاریخ اگر ہم پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ارتقاء کا آغاز یک خلوی جرثومے سے ہوا۔ یک خلوی جرثومے کی افزائش نسل کا طریقہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو تقسیم کرتا تھا۔ اسے قطعاً قطعاً قطعاً قطعاً جنسی اختلاط کا علم نہیں تھا۔ نہ اس نے کبھی اسے استعمال کیا۔ پھر وہ یک خلوی جرثومہ ترقی کر کے پودہ بن گیا۔ اب اس نے افزائش نسل کا ایک نیا طریقہ سیکھا۔ وہ تھا جنسی تولید۔ کہاں سے سیکھا؟ سانوں کی پتہ؟ اس پودے کو بھی قطعاً قطعاً قطعاً جنسی اختلاط کا علم نہیں تھا۔ نہ اس نے کبھی یہ طریقہ استعمال کیا۔ بلکہ یہ اپنے آباء اجداد کا تقسیم والا طریقہ بھی بھول گیا۔ پھر یہ پودا ترقی کر کے آبی جاندار میں تبدیل ہوا۔ یہاں سے جنسی اختلاط سے پہلی بار روشناس ہوا۔ یعنی نر اور مادہ میں جنسی اختلاط۔ یاد رہے پہلے آبی جاندار سے پہلے اس کرہ عرض پر کبھی کسی نے جنسی اختلاط نہیں کیا تھا۔

اب میرا سوال بڑا سادہ سا ہے۔ جس پہلے جاندار نے پہلی بار جنسی اختلاط کا طریقہ استعمال کیا اس کی اپنی پیدائش میں Y کروموزومز استعمال ہوئے یا نہیں؟

جواب بھی بڑا سادہ ہے۔

جی نہیں۔

اس کے ماں باپ پودے تھے جو جنسی اختلاط نہیں بلکہ جنسی تولید کا طریقہ استعمال کیا کرتے تھے۔

بغیر Y کروموزومز کے استعمال کے بغیر ایک جاندار وجود میں آچکا تھا۔

اور یہ میں نہیں کہہ رہا۔ یہ ارتقائی نظریہ کہتا ہے۔

یعنی یہ سائنس ہے کوئی معجزہ نہیں۔

تو اگر سائنس کے مطابق ارتقائی نظریئے میں بغیر Y کروموزومز کے ایک نر جاندار وجود میں آسکتا ہے تو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پر اعتراض کیسا؟

تحریر محمد سلیم

معجزات کی سائنسی افادیت

معجزات کے عقلی وسائنسی پہلوؤں پر مختلف محققین نے طبع آزمائی کی ہے، صاحبِ تفسیر عثمانی مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اپنے رسالے 'اسلام اور معجزات' میں لکھا کہ معجزات قوانین فطرت کے خلاف نہیں ہوتے بلکہ ایک اعلی قانون فطرت پر ہی مشتمل ہوتے ہیں جسکو ہم اپنی کم علمی کی وجہ سے جان نہیں پاتے اور اسے قوانین فطرت کے خلاف سمجھنے لگتے ہیں جیسے اگر آج سے تین صدی پہلے کا کوئی آدمی جہاز کو اڑتا دیکھ لے تو وہ اسے بھی معجزہ خیال کرے گا۔ پیش نظر تحریر معجزات کے موضوع پر ایسے ہی نکات کو بیان کرتی ایک منفرد تحقیق ہے جو جدید مسلم تشکیکی ذہن کے اطمینان کے لیے پیش کی جارہی ہے۔ ہمارا اس تحریر کی ہر بات اور نتیجے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ایڈمن

☆☆

معجزات کا موضوع صدیوں سے فلاسفہ، متکلمین اور مسلم علماء و مفکرین کے ہاں زیرِ بحث رہا ہے اور حقیقت معجزہ، تاویل معجزہ، دفاع معجزہ، معجزات انبیاء اور معجزات خاتم الانبیاء جیسے اہم اور متنوع موضوعات پر مشتمل تصنیفی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ کتب خانوں کی زینت بن کر اہل علم کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچارہا ہے۔ یہ موضوع مسلم اور غیر مسلم ہر دو مفکرین کی فکری جولانگاہوں کا مرکز رہا ہے۔ غزالیؒ، رازیؒ اور ابن تیمیہؒ کی تحقیقات، ان کی علمی، فکری اور ذہنی توانائیوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ متاخرین میں سے سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سید سلمان ندوی، عبدالباری ندوی، غلام احمد پرویز اور شیخ مصطفٰی صبری بک نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے معجزات کی تشریح و توضیح کی ہے۔ مغربی فلسفہ میں سے وولسٹن (Woolston) ، ہکسلے (Huxley)، ہیوم (Hume) نے انکار معجزات پر عقلی استدلال سے کام لیا ہے جس پر خود مغربی مفکرین نے نقد و جرح (Criticism) کی ہے

قرآن حکیم نے جو کہ تاقیامت پوری انسانیت کے لئے خالق کائنات کی طرف سے آخری صحیفہ ہدایت ہے، انبیاء کرامؑ کے متعدد معجزات کو محفوظ کر دیا ہے اور قرآن حکیم کی شہادت ان معجزات کے یقینی ہونے کا قطعی ثبوت ہے۔

قرآنیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ سوال راقم کے ذہن میں بار بار کھٹکتا رہا کہ سابقہ انبیاء کرام کے خوارق و معجزات کا قرآن حکیم میں تفصیل اور تکرار کے ساتھ اعادہ کس حکمت کے تحت ہوا ہے؟ قرآن حکیم کا عمومی اسلوب تو واضح ہے کہ وہ غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف ان واقعات و مضامین کو اجمال و اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے جن میں انسانیت کے لئے ہدایت و راہنمائی اور

وعظ و نصیحت کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہو۔ معجزات کے حوالے سے ہمارے لئے اس کتاب ہدایت میں راہنمائی کا کون سا پہلو موجود ہے؟ راقم نے اس مقالہ میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نتائج فکر قطعی اور حتمی نہیں۔ نہ ہی راقم کو ان کی صحت پر اصرار ہے۔ تاہم ان پر بحث کی کافی گنجائش موجود ہے جنہیں اپنے محدود اور ناقص علم کی روشنی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

محققین کے نزدیک معجزہ وہ خلاف عادت چیز ہے جو سوال اور دعویٰ (نبوت) کے بعد ظاہر ہو جو ہر حیثیت سے محال نہ ہو اور لوگ باوجود کوشش اور تدبیر کے اس قسم کے معاملات میں پوری فہیم و بصیرت رکھتے ہوئے بھی اس کے مقابلہ سے عاجز ہوں۔ (حدالمعجزۃ ان یظھر عقیب السوٴال والدعویٰ ناقصاً للعادۃ من غیر استحالۃ بجمیع الوجوہ یعجز الناس عن اتیان مثلہ بعد التجھد والاجتھاد اذا کان بھم حذاقۃ وزرافۃ فی مثل تلک الصنیعۃ)۔

بعض دیگر علماء نے سوال اور مطالبے کی شرط ذکر نہیں کی کیونکہ بہت سے معجزات سوال اور مطالبے کے بغیر بھی پیش ہوتے رہے۔

معجزہ کے ذریعہ چونکہ ایسا واقعہ ظہور میں آتا ہے جو قوانین فطرت کی عام روش سے ہٹا ہوا ہوتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مدعی نبوت رب العالمین کا نمائندہ ہے جس نے اس کی صداقت ثابت کرنے کے لئے اپنی براہ راست مداخلت سے وہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے اس لئے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ معجزات سے مقصود بنیادی طور پر نبی کی نبوت و صداقت اور قدرت خداوندی کا اظہار و اثبات ہے مگر یہ دعویٰ، جب کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ معجزات کا ظہور اسی مقصد کے لئے ہے، ہماری ناقص رائے میں محل نظر ہے۔

کیونکہ سب معجزات نہ تو کفار کے مطالبے پر پیش کئے گئے اور نہ ہی ان سے مقصود نبوت کی تائید و تصدیق تھی۔ بہت سے معجزات کا مقصد مومنین کی مادی فلاح و بہبود اور ان کے مسائل و مشکلات کا ازالہ بھی تھا۔ انبیاء کرام نے انسان کی روحانی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ان کی مادی فلاح اور ترقی کے وہ نمونے پیش کئے جن پر آج سائنس ترقی کی معراج تک پہنچنے کے باوجود بھی انگشت بدنداں ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے کئی ایک معجزات اسی نوعیت کے ہیں جو اسرائیلیوں کے سامنے ظاہر ہوئے جو موسیٰؑ کی نبوت پر ایمان اور قدرتِ الٰہیہ پر اعتقاد رکھتے تھے مثلاً صحراء سینا میں ان کے لئے خوراک کا انتظام ہوا: ﴿وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ﴾ یعنی ﴿اور ہم نے تم پر من و سلویٰ اتارا﴾ اور ان کے پانی کا انتظام کیا: ﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ﴾ یعنی ﴿ہم نے کہا پتھر پر اپنا عصا مارو پھر اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے﴾، سورج کی گرمی اور تپش سے حفاظت کے لئے بطور معجزہ بادلوں کے سائے کا انتظام ہوا: ﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ﴾ یعنی ﴿ہم نے ان کے لئے بادلوں کے سایہ کا انتظام کیا﴾۔

حضرت عیسیٰؑ کے طب سے متعلقہ معجزات جن کے ذریعے وہ مادر زاد اندھوں اور کوڑھ کے مریضوں تک کا علاج فرما کر انہیں تندرست کر دیتے تھے یہ بھی اسی نوع سے متعلق ہیں۔ اس قسم کے معجزات سے اصل مقصود تو قدرت الٰہی کا اظہار و اثبات ہے مگر ان کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ یہ معجزات بظاہر مظاہرِ فطرت کی تسخیر اور ان سے استفادہ کو عملاً ممکن بنا کر سائنسی ترقی کا اہم محرک (Motive) بھی ثابت ہوئے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے اس امکان کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس کائنات میں جو واقعات بصورت معجزات خلاف عادت طور پر ظاہری اسباب کے بغیر ظہور میں آئے ہیں ان کا اسباب کے تحت بھی وجود میں آنا ممکن ہے۔ سوائے ان معجزات کے جن کے متعلق یہ بتلا دیا گیا ہو کہ ان کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی جیسا کہ قرآن

مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی مثل ایک سورۃ بھی پیش نہیں کی جاسکتی جو کہ آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور قیامت تک انسانیت کے لئے کھلا چیلنج ہے۔

علم و تحقیق کے میدان میں مشاہدات و تجربات کے ذریعے جو چیز سائنسی حقیقت (Scientific Truth) کی حیثیت اختیار کرتی ہے، ابتداء میں اس کی حیثیت ایک مفروضے کی ہوتی ہے۔آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے جن جن شعبوں میں انسانیت نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے ان کے بہترین نمونے معجزات انبیاء میں موجود ہیں۔ محققین اور سائنسدانوں نے انہی مفروضات کی بنیاد پر اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ مادی اسباب کے تحت اور فطرتی قوانین (Law of Nature) کے دائرے میں بہت سی ان چیزوں کو ممکن بنادیا ہے جنہیں اس سے قبل ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔آج بھی ان نمونوں (Models) کو سامنے رکھ کر ترقی کی ان منازل کو طے کیا جاسکتا ہے جن تک انسانیت کی رسائی تاحال ممکن نہیں ہو سکی۔ مسلمانوں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں علمی پسماندگی کے پسِ منظر میں معجزات کے متعلق یہ مباحثہ (Debate) اور نقطۂ نظر اہل علم و تحقیق کی خصوصی توجہ کا طالب ہے جس کی طرف مسلم علماء نے کوئی توجہ نہیں دی البتہ اس اہم نقطہ کی بنیاد ہمیں اس گفتگو سے ملتی ہے جو برصغیر کے نامور محدث اور اپنے دور میں اسلامی شریعت و فلسفہ کی نابغہ شخصیت مولانا انور شاہ کشمیریؒ (جن کے علوم و معارف سے ڈاکٹر اقبال مرحوم فیضیاب ہوئے) اور ڈاکٹر اقبال کے درمیان ہوئی۔ علامہ کشمیری نے اقبال مرحوم سے اپنی گفتگو میں اسی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ راوی لکھتے ہیں:

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے سامنے حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ کشمیریؒ) نے جو علمی جواہرات بیان فرمائے ان میں ایک موضوع یہ تھا کہ امت میں سائنس و طبعیات میں جو حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں انبیاء

کے معجزات میں ان کی نظیریں موجود ہیں اور انبیاء کرام کے معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لئے ظاہر کروائیں کہ یہ آئندہ امت کی ترقیات کے لئے تمہید ہوں اور فرمایا کہ ''ضرب الخاتم'' میں اس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔

اس نقطۂ نظر کی روشنی میں جب ہم معجزات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں آج بھی ان کی افادیت اور اہمیت نمایاں نظر آتی ہے۔ جنہیں قرآن حکیم تکرار اور اعادے کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ ان معجزات نے نہ صرف مفروضات کو سائنسی حقائق بنانے میں مدد دی ہے بلکہ وہ آج بھی سائنسی ارتقاء کا ایک اہم محرک ہیں۔ معجزات کی سائنسی افادیت کی توضیح درج ذیل مثالوں سے بخوبی ہو سکتی ہے:

ا۔ قرآن حکیم میں ہے جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا حکم ہوا۔ ﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ﴾ یعنی ﴿ہم نے کہا اے آگ! ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا﴾ اگرچہ آگ جلاتی ہے مگر اس سے آکسیجن کو خارج کر دیا جائے تو وہ فوراً بجھ جاتی ہے ممکن ہے اللہ نے اپنی قدرت کے ذریعے آگ کو ٹھنڈا کر دیا ہو یا ان کے جسم میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی ہو۔ (دوسری توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے (جس کے ذریعے ان پر آگ اثر انداز نہ ہو سکے یہ معجزہ آگ سے تحفظ کے فطرتی قوانین تک رسائی کے لئے اہم محرک ثابت ہوا ہے اور آج ایسے مخصوص پینٹس (Paints) ایس بس ٹاس (Aesbestos) اور فائر پروف لباس وجود میں آ چکے ہیں جن کے استعمال کے ذریعہ آگ کے اثرات سے بچا سکتا ہے اور خلانورد (Astronaut) خلائی سفر میں ایسا لباس استعمال کرتے ہیں جن پر آگ اثر انداز نہیں ہوتی اور قرآن کریم نے اس معجزہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ دوسرے مقام پر اسی قسم کے لباس کی پیشنگوئی کر کے سائنسی

تحقیق کے لئے مہمیز کا کام دیا ہے: ﴿وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ﴾ یعنی ﴿اور تمہارے لئے ایسے لباس بنا دیئے جو تمہیں گرمی (آگ) سے بچاتے ہیں﴾۔

۲۔ قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ ولادت کو جو بغیر باپ کے ہوئی، حضرت آدمؑ کے ساتھ تشبیہ دی ہے: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ ﴿بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ جیسی ہے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر کہا ہو جا تو وہ ہو گیا﴾۔ جو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔ آج جدید سائنس مرد کی کسی بھی نوعیت کی وساطت کے بغیر کنواری لڑکیوں کے بطن سے بچے پیدا کرنے کے کامیاب تجربات کر رہی ہے۔ اور جدید تجربات بتلا رہے ہیں کہ ولادت کی دیگر صورتوں کا بھی وجود میں آنا ممکن ہے۔ حشرات الارض میں تو یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بہت سے جاندار نر کی جانب سے بارآوری کے بغیر ہی پیدا ہوتے ہیں اور غیر جنسی تولید کے ذریعے افزائش نسل کرتے ہیں۔ بھڑوں (Wasps) میں بھی یہ صورت ہے جن میں نسل نر کے توسط کے بغیر صرف مادہ ہی سے چلتی ہے۔

مگر انسانوں سے متعلق کئے جانے والے جدید تجربات بتلا رہے ہیں کہ ولادت کی دیگر صورتوں کا بھی وجود ممکن ہے اور یہ تجربات قرآن کے آدمؑ اور عیسیٰؑ کی تخلیق اعجازی پر مہر تصدیق ثبت کر کے تشکیکی ذہنیت کو مطمئن کر سکیں گے۔

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کے دور میں فنِ طب (Medical Science) عروج پر تھا مگر آپ نے اپنے معجزات کے ذریعے اس فن کو عروج کمال (Climax) تک پہنچا دیا۔ آپؑ باذن الٰہی بے جان سے جاندار پیدا کر دیتے تھے ﴿أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ یعنی ﴿میں

تمہارے لئے گارے سے پرندے کی شکل بنا دیتا ہوں پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے ﴿﴾، آپ مردوں کو زندہ کرتے تھے ﴿وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾ اور لاعلاج مریضوں، مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے تھے اللہ کے حکم سے ﴿وَ اُبۡرِیٴُ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ

میڈیکل سائنس انتہائی ترقی کے باوجود تاحال اس منزل کو نہیں پا سکی کہ وہ حیات کے قانون سے واقف ہو سکے۔ البتہ اس سمت میں پیشرفت جاری ہے اور انسانی جسم کو منجمد کر کے اسے طویل عرصے تک زندہ رکھنے کے تجربات ہو رہے ہیں اور یہ نمونے ہمیں تحقیق و تفکر کی دعوت دے رہے ہیں اور اگر مادی اسباب، غذا، ادویہ اور سرجری وغیرہ کے ذریعے ان منزلوں کی طرف قدم بڑھایا جائے تو کامیابی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ ممکن ہے کسی وقت مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر سے بھی انسان واقف ہو جائے اور خود آپ ﷺ نے ایک حدیث میں ''دجال'' کے متعلق یہ پیشن گوئی فرمائی ہے کہ وہ مردے کو زندہ کرے گا۔ حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان جب دجال کے منہ پر اسے جھوٹا کہے گا تو اسے دجال کے حکم پر آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد دجال اسے حکم دے گا کہ زندہ ہو جاوہ صحیح سلامت اٹھ کر زندہ ہو جائیگا۔ پھر دجال اس سے سوال کرے گا کہ اب میرے بارے میں کیا کہتے ہو تو وہ جواب دے گا کہ مرنے کے بعد مجھے تیرے جھوٹا ہونے کا مشاہدہ ہوا ہے اس لئے اب تو مجھے تیرے جھوٹا ہونا کا پورا یقین ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دجال کو دوبارہ مومن کے مارنے پر قدرت نہ ہو گی۔

محقق فاضل مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے احیائے موتی کو انسان کے لئے ممکن قرار دیا جس کی وجہ وہ انسانی زندگی کے قانون سے واقفیت قرار دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن مجید نے احیاء موتی سے متعلق متعدد معجزات مختلف پیغمبروں کے حوالے سے ذکر کئے ہیں مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ چار پرندوں کا زندہ ہونا۔ حضرت عزیزؑ اور ان کے گدھے کا سو سال بعد زندہ ہونا۔

گویا قرآن حکیم کے مطابق اس مادی زندگی میں مردہ کے زندہ ہونے کے متعدد نمونے گزر چکے ہیں۔

۴۔ معجزات موسیٰؑ میں قرآن حکیم نے عصاء موسوی کے اژدھا بن جانے کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ اس نمونہ کو سامنے رکھ کر ماہیت اشیاء کی تبدیلی کے مفروضے کو سائنسی حقیقت بنانے پر توجہ دی جاسکتی ہے۔

انقلاب ماہیت کی توضیح کو ایک سائنسدان سر افرانسیس ینگ ہسبڈ کے ایک اقتباس سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے جو دراصل اس نے وجود باری کے اثبات میں پیش کیا ہے وہ لکھتا ہے:

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری یہ زمین کھولتے ہوئے سورج سے نکلی تھی تو ان بے پناہ تبدیلیوں پر حیرت ہوتی ہے جن کی آخری کڑی دامن کوہ کا ننھا سا رنگین پھول تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر مرئی طاقت نے ناچتے ہوئے شعلوں کو رام کر کے مسکراتے ہوئے پھولوں میں بدل دیا... جب سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وادی تبت کا ننھا سا پھول کسی وقت بھڑکتے ہوئے سورج کا شعلہ تھا تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ سورج کے شعلے سے پھول تک کا طویل سفر کسی راہنماء کی نگرانی میں طے ہوا ہوگا ورنہ ایک شعلے میں اتنی دانش کہاں کہ وہ ہزاروں انقلابات سے گزر کر از خود پھول کی ہیئت اختیار کر سکے۔

اس اقتباس کی روشنی میں یہ سمجھنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہے کہ سائنسدانوں کے نزدیک اگر سورج کے شعلے سے پھول تک کا سفر کروڑوں اربوں سال میں طے ہو سکتا ہے تو عصا کا اژدھا بننا اور اشیاء کی ماہیت کا

تبدیل ہونا کیونکر مستبعد (Improbable) ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے تحقیق و تجربات کی روشنی میں انسان کی رسائی ان قوانین تک ہو سکے جن کے ذریعے ماہیت کی تبدیلی کا طویل عمل (Long process)مادی اسباب کے تحت کم سے کم وقت میں ممکن ہو سکے جس کے نمونے انبیاء کے معجزات میں پیش ہو چکے ہیں۔

۵۔ حضرت داؤدؑ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ان کی خوش الحانی اور صوتی تاثر ہے۔ جب وہ زبور کی تلاوت اور خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہوتے تو حیوانات و جمادات، پہاڑ اور پرندے بھی ان کی ہمنوائی کرتے۔ قرآن میں ہے: ﴿إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ. وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ﴾ یعنی ﴿ہم نے پہاڑوں کو ان کے لئے مسخر کر دیا تھا۔ کہ وہ صبح و شام ان کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے اور پرندے بھی جمع رہتے تھے اور سب ان کے فرمانبردار تھے﴾۔ اس معجزے سے اس مفروضے کو تقویت ملتی ہے کہ صوتی تاثرات کے ذریعے حیوانات اور پرندوں تک کو مسخر کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ جمادات تک میں ایک قسم کی حیات اور شعور موجود ہے جس کی بناء پر وہ تسبیح میں مشغول رہتے تھے اور اس کی تائید دوسری قرآنی آیت سے بھی ہوتی ہے: ﴿وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ یعنی ﴿کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو﴾۔

آپ ﷺ کے معجزات میں بھی ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں نباتات و جمادات کے احساس و شعور کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً درختوں اور پتھروں کا آنحضرت ﷺ کو سلام کہنا۔ درخت کے خشک تنے کا آنحضرت ﷺ کے فراق میں رونا وغیرہ۔

۶۔ حضرت داؤدؑ نے زرہوں، جنگی آلات اور ہتھیاروں کو ترقی دے کر ایسی جدید صنعت ایجاد و متعارف کروائی جس سے لوگ اس سے قبل متعارف نہ تھے۔ اس ٹیکنالوجی میں مہارت کی بدولت آپ نے اپنا دفاع اس حد تک مضبوط کیا کہ قرآن حکیم بھی انہیں ﴿ذَا الْأَيْدِ﴾ یعنی ﴿بڑی قوت و طاقت والا﴾ کے القاب سے یاد کرتا ہے اور آپ کی قائم کردہ حکومت کی مضبوطی اور استحکام کی تعریف کرتا ہے: ﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ﴾ یعنی ﴿ہم نے ان کی سلطنت کو مستحکم کیا﴾۔

حضرت داؤدؑ کا یہ معجزہ لوہے کی افادیت کا تصور اجاگر کر کے راہنمائی کر رہا ہے کہ لوہے کو کسی بھی سائنسی عمل (Scientific Process) کے ذریعے نرم کر کے (پگھلا کر) دفاعی ٹیکنالوجی اور مفید ایجادات کا حصول ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ آج لوہے اور اسلحہ کی صنعت کی ترقی حضرت داؤدؑ کی معجزانہ صلاحیت اور اس فن میں ان کی دلچسپی اور مہارت کے ذریعے ممکن ہوئی ہے اور جس طرح داؤدؑ نے دفاعی ٹیکنالوجی کے میدان میں سبقت حاصل کر کے مستحکم اور مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی آج امت مسلمہ اس ماڈل کو اپنا کر مادی اور روحانی غلبہ کے ذریعے طاغوتی قوتوں کو زیر کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کو امن و سلامتی اور حقیقی ترقی و فلاح سے آشنا کروا سکتی ہے۔ قرآن حکیم اس دفاعی ٹیکنالوجی کی اہمیت کو ذوالقرنین کے واقعہ سے بھی اجاگر کرتا ہے اور مشرق و مغرب میں اس کی فتوحات اور جنگی مہموں کی نشاندہی کرتا ہے جسے قرآن کی رو سے اپنے دور کی جدید ترین ٹیکنالوجی میں بھرپور مہارت حاصل تھی اور اس کے ذریعے اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا اور یاجوج ماجوج جیسی وحشی مخلوق کی یلغار روکنے کے لئے لوہے، پگھلے ہوئے تانبے اور پتھروں پر مشتمل ایسی دیوار تعمیر کی جو سد ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھی۔ یہ نمونے امت مسلمہ کو دعوت فکر دے رہے ہیں کہ ''سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں برتری حاصل کر کے

آج بھی اپنے دور کے یاجوج ماجوج کی یلغار کو روک کر اپنے دفاعی حصار کو اس قدر مضبوط بنا سکتی ہے کہ کسی کو اس میں شگاف اور رخنہ ڈالنے کی ہمت و جرأت نہ ہو سکے۔ اور وہ دفاعی حصار سد ذوالقرنین کی طرح اس قدر مضبوط ہو جائے کہ قرآن کے الفاظ میں ﴿فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا﴾ یعنی ﴿یعنی ان میں نہ تو اس دیوار کے اوپر چڑھنے کی طاقت تھی اور نہ اس میں کوئی سوراخ کر سکتے تھے﴾ کی تعبیر ان پر صادق ہو سکے۔

واضح رہے کہ جدید سائنس اور فولادی صنعت (Steel Technology) میں مہارت کے بغیر اس منزل تک رسائی ممکن نہیں جس کی اہمیت اور افادیت کی طرف قرآن حکیم کی ایک دوسری آیت غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے۔ ﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ یعنی ﴿ہم نے لوہے کو اتارا (پیدا کیا) جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے بے شمار فوائد ہیں﴾۔

۷۔ معجزات یوسفؑ میں سے ایک اہم معجزہ خوابوں کی درست تعبیر ہے جو حضرت یوسفؑ نے جیل میں مقید دو قیدی ساتھیوں اور بادشاہ کے خوابوں کے جواب میں بتلائی تھی۔ احادیث میں آنحضرت ﷺ کی مختلف پیشنگوئیوں کا بھی ذکر ہے جن میں سے بعض خواب کے ذریعے آپ کو معلوم ہوئیں جو در حقیقت معجزات ہیں۔ معجزات ہماری اس طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ مستقبل کی پیش بینی ممکن ہے۔ خوابوں کے علم میں تحقیق کے ذریعہ ہم مستقبل میں پیش آنے والے کئی ایک واقعات کی پیشنگوئی کر سکتے ہیں اور ممکنہ خطرات اور مصائب و مشکلات سے تحفظ کے لئے بہتر منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔ جب کہ حضرت یوسفؑ کی قحط سالی سے تحفظ کے لئے کی جانے والی کاوشوں سے ظاہر ہے جن کا قرآن حکیم نے خاص طور پر حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے نہ صرف خواب کی درست تعبیر بتلائی بلکہ اپنی حکمت و دانش کے ذریعہ بہتر منصوبہ بندی

کر کے ملک مصر کو خشک سالی کے مضر اثرات سے بھی بچا لیا۔ یہ میدان تاحال سائنسدانوں کی تحقیق و توجہ کا طلبگار ہے اور اس میں تحقیق و تجربات کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

۸۔ حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ نے تسخیر جنات و طیور اور تسخیر ہوا کے معجزات عطاء فرمائے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کا لشکر نہ صرف انسانوں پر مشتمل تھا بلکہ ان کے زیرِ تصرف جنات اور پرندوں کے بھی الگ الگ لشکر تھے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ﴾ یعنی ﴿اور سلیمان کے پاس ان کے لشکر جنات انسانوں اور پرندوں کی صورت میں جمع تھے﴾۔ قرآن کریم کے بقول ان کے لئے شیاطین مسخر تھے۔ ﴿وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ﴾ ان کے لئے شیطانوں کو تابع کر دیا گیا تھا جو معمار اور غوطہ زن تھے جن سے وہ دیگر کام بھی لیا کرتے تھے۔ انہوں نے سرکش شیاطین کو جو تخریبی سرگرمیوں میں ملوث تھے اپنی روحانی قوت کے بل بوتے پر تخریبی سرگرمیوں کے لئے آزاد چھوڑنے کے بجائے مسخر کر کے تعمیری اور مثبت کاموں میں لگا دیا تھا جو حضرت سلیمانؑ کا اعجاز اور عظیم کارنامہ ہے۔ یہ معجزہ راہنمائی کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر مخفی قوتیں اور مخلوقات موجود ہیں جنہیں مسخر کر کے ان سے تعمیری کام لئے جا سکتے ہیں، اور اس بات کا امکان ہے کہ کل ہماری دسترس میں وہ مادی اسباب اور قوانین بھی آسکیں جن کے ذریعے ان قوتوں کی تسخیر بھی ممکن ہو سکے۔ (جنہیں آج بھی بعض روحانی اسباب کے ذریعہ مسخر کیا جا سکتا ہے)۔

واضح رہے کہ اب مخفی علوم (Parapsychology) کی تحقیقات کے ذریعہ مخفی قوتوں کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جانے لگا ہے۔ سائنسدان اور عقل پرست جو اس سے قبل جنات کے وجود کے منکر تھے اب انہیں ممکن سمجھنے لگے ہیں۔ سٹیفن ایچ ڈول اور کارل سیگان جیسے نوبل انعام یافتہ سائنسدانوں کی

تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں جنات جیسی مخلوق کا پایا جانا ممکن ہے جو بغیر غذا کے زندہ ہو، اور جس کے لئے فضا میں پرواز کرنا اور نگاہوں سے غائب ہونا اور مختلف شکلیں اختیار کرنا ممکن ہو۔

ڈاکٹر ھیرالڈ سی ارے نے "The Chemical World" میں سلیکون، سلفر اور فلورین گیس سے مرکب ایسی مخلوق کے وجود کو ممکن ثابت کیا ہے جسے نہ غذا کی ضرورت ہو اور نہ ہی وہ مسلسل ایک خاص ہیت میں موجود ہو۔ جنات کے وجود کو بعض امریکن Spiritual Scientiests ڈاکٹر سرلاج، ڈاکٹر سر جیمسن اور پروفیسر جوڈ نے بھی اپنی تحقیقات کے ذریعے ثابت کیا ہے۔

۹۔ حضرت سلیمانؑ کو بطور معجزہ پرندوں کی بولیوں کا علم بھی عطاء ہوا۔ قرآن میں ہے: ﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ یعنی ﴿اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے﴾۔ قرآن حکیم نے حضرت سلیمانؑ کی چیونٹیوں کی گفتگو سننے اور ھُدھُد پرندے سے ان کے مکالمہ اور گفتگو کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے۔ پرندوں کی بولیوں کے علم کو جسے قرآن حکیم حضرت سلیمانؑ کے معجزانہ کمالات میں سے قرار دیتا ہے اس علم کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے متعلق تفصیلی واقعات اور باہمی مفصل گفتگو کو بھی نمایاں کر رہا ہے جس کے ذریعے اس علم کے سمجھنے کی بھی ترغیب مل رہی ہے۔ آج اس علم میں دسترس حاصل کر کے اور حیوانات اور پرندوں کی تربیت کے ذریعے انسانی فلاح و بہبود کے متعدد مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں اور کئے جا رہیں ہیں جن کا تصور ان معجزات نے فراہم کیا ہے۔ قرآن حکیم کے بیان کے مطابق حضرت سلیمانؑ ھُدھُد پرندے سے پیغام رسانی کا کام لیتے تھے اور مفسرین کے نزدیک پانی کی تلاش میں بھی اس سے مدد لیتے تھے اور بعض پرندے اپنی غیر معمولی ذہانت اور فطری جبلت کی بناء پر زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں جیسا کہ ھُدھُد پرندے کی گفتگو سے واضح ہے جسکی تفصیل قرآنی آیات میں دی گئی ہے۔ Animal

Sciences میں اس تصور کی روشنی میں حوصلہ افزاء پیش رفت ہو رہی ہے اور شاید وہ دن دور نہیں جب انسان حیوانوں اور پرندوں کی بولیوں کو سمجھنے پر اس طرح قادر ہو جائے جس طرح وہ خود انسانی بولیوں کو سمجھنے پر قدرت رکھتا ہے۔

Ethology اور Ornithrology جیسے حیاتیاتی علوم بہتر طور پر جانوروں کی حرکات و سکنات اور بولیوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

۱۰۔ حضرت سلیمانؑ کو تسخیر ہوا کا معجزہ بھی عطاء ہوا۔ قرآن حکیم میں ہے؛ ﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ﴾ یعنی ﴿اور سلیمانؑ کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ ان کی صبح کی منزل بھی اور شام کی منزل بھی ایک ماہ بھر کی ہوتی﴾ یعنی ہوا ان کے تخت کو اڑا کر ایک ماہ کی مسافت کو صبح یا شام کے وقت میں طے کرا لیتی تھی اس معجزے نے پرندوں کی طرح ہوا کے دوش پر اڑنے کی انسانی خواہش کو مہمیز دی اور اس تصور کو ممکن بنا دیا کہ انسان فضا میں سفر کر سکتا ہے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مسافت کو طے کر سکتے ہے۔ آج جدید ترین اور تیز رفتار سواریوں نے نقل و حمل کو آسان بنا دیا ہے اور قرآن حکیم کی ایک آیت میں بھی انسانی تحقیق و تجربہ کو ایک پیشنگوئی کے ذریعے مزید تحریک دی گئی ہے: ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ یعنی ﴿اور وہ ایسی چیزیں (سواریاں) بھی پیدا کرے گا جنہیں تم نہیں جانتے﴾۔ احادیث نبوی ﷺ می ں زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ پیشنگوئیاں موجود ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے ایک صحابیؓ آصف برخیا نے آنکھ جھپکنے سے کم مدت میں ملکہ سبا کے تحت کو تقریباً 900 میل کے فاصلے سے حاضر کر کے یہ تصور بھی دیا ہے کہ مادی اجسام کی اس قدر تیز رفتاری سے بھی نقل و

حرکت ممکن ہے۔ جو آج کی سائنس کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے۔ ان معجزاتی نمونوں کے زیرِ اثر تحقیق تجربات ہو رہے ہیں۔ آج سائنسدانوں نے صوتی لہروں کو ریڈیائی لہروں میں تبدیل کر کے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے آواز، تصاویر اور پیغامات کو دور دراز مقامات تک پہنچانے اور وصول کرنے کا مرحلہ تو بڑی کامیابی کے ساتھ کر لیا ہے مگر مادی اجسام کی اس تیز رفتاری کے ساتھ نقل و حرکت تاحال ممکن نہیں ہو سکی مگر یہ سوچ فروغ پا رہی ہے کہ شاید مستقبل میں ایسا ممکن ہو سکے۔ اشیاء اور اجسام الیکٹرانوں اور پروٹانوں کی لہروں میں تبدیل کر کے روشنی کی رفتار پر سفر کر سکیں اور آنکھ جھپکنے میں بعید فاصلوں تک منتقل کئے جا سکیں اور پھر ان لہروں کو بھی جمع کر کے انہیں اصلی حالت میں لانا شاید ممکن ہو سکے گا۔ بہر حال معجزات اس امکان کی تائید کرتے ہیں۔

۱۱۔ آنحضرت ﷺ کے معجزات میں سے سفرِ معراج وہ عظیم معجزہ ہے جس کے ذریعے آپ ﷺ مسجد اقصیٰ اور ساتوں آسمانوں سے بھی گزر کر لامکاں تک جا پہنچے اور کھربوں نوری سال سے بھی زائد مسافت طے کر کے ایک لمحے میں واپسی کا سفر طے کر لیا۔ تیز رفتاری کی اس سے بڑھ کر مثال ممکن نہیں۔ اس سفر میں آپ کی سواری کا نام احادیث میں براق آیا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی تیز بجلی اور روشنی کے ہیں گویا وہ روشنی کی رفتار سے بھی کئی گناہ زیادہ تیز تھی۔ حضور ﷺ کے واقعہ معراج نے جس کی تفصیلات احادیث میں موجود ہیں۔ فضا، فلکیات، طبیعات اور سماعی علوم کی طرف انسانوں کو تشویق دلائی اور تسخیر کائنات کے بند دروازوں کو کھولنے کی ترغیب دی۔ خلائی راکٹ براق ہی کی ایک ادنیٰ شکل اور مادی نمونہ ہے جس نے تسخیر ماہتاب کو ممکن بنایا اور جس کی پیشنگوئی قرآن حکیم نے چودہ سو سال قبل کر دی تھی ﴿وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ. لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ. فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ یعنی ﴿قسم ہے چاند کی جب وہ پورا دکھائی دیتا

ہے تم یقیناً طبق در طبق ضرور سواری کرتے جاؤ گے تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے ﴾۔ معلوم نہیں خلائی فتوحات اور تسخیر کائنات کے اس سفر میں ابھی انسان نے کن کن منزلوں کو طے کرنا ہے۔ منزل مصطفٰی تک رسائی ممکن نہیں تاہم اس رستے کی گرد راہ ہی کو پالینا بھی غنیمت ہے۔ اقبال مرحوم نے معراج کے سی پہلو کی طرف اپنے اس شعر میں متوجہ کیا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰی سے مجھے کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

۱۲۔ انبیاء کرام کی غیر معمولی قوتوں کے پیشِ نظر وہ کچھ دکھائی دیتا ہے جنہیں عام نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں ان کی نگاہوں کے سامنے مادی حجابات اٹھائے دیئے جاتے ہیں وہ فرشتوں اور جنات کو جنت اور دوزخ کو دیکھ لیتے ہیں جب قریش مکہ نے آنحضرت ﷺ کے مسجد اقصیٰ کے سفر (اسراء) اور سفر معراج کو جھٹلایا اور آپ سے مسجد اقصیٰ کے متعلق تفصیلات طلب کیں تو احادیث میں ہے کہ مسجد آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے کر دی گئی۔

غزوہ موتہ میں آنحضرت ﷺ نے جھنڈا اٹھانے والوں کی شہادت کا منظر مدینہ میں دیکھ لیا غزوہ خندق میں چٹان کی ضرب سے پیدا ہونے والی چمک میں آنحضرت ﷺ نے شام، ایران اور یمن کے شاہی محلات دیکھ لئے۔ نیز آپ ﷺ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: ''ان اللہ تعالیٰ طویٰ لی الارض حتی رئیت مشارقھا و مغاربھا'' یعنی ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین سکیڑ دی حتی کہ میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا''۔

آنحضرت ﷺ کے روحانی کمالات جب صحابہؓ میں منتقل ہوئے تو حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ میں خطبہ کے دوران ہزاروں میل دور کی مسافت پر موجود لشکر کے سپہ سالات حضرت ساریہؓ کو" یاساریۃ الجبل" یعنی"اے ساریہ! پہاڑ کی طرف" کے الفاظ کے ساتھ راہنمائی کر کے لشکر کو فتح سے ہمکنار کرادیا۔

آج جدید ذرائع ابلاغ ومواصلات (Communication Technology) نے نہ صرف ان معجزات کو قابل فہم بنادیاہے بلکہ اس میدان میں انسان کی مسلسل تگ ودو کے مزید مثبت نتائج سامنے آنے کے امکانات بھی موجود ہیں۔

۱۳۔آنحضرت ﷺ کا ایک عظیم معجزہ شق القمر یعنی چاند کا آپ کی انگشت مبارک سے دو ٹکڑے ہونا۔ ہمیں دیگر سیاروں تک دسترس اوراس کرہ ارضی سے کی جانے والی انسانی تبدیلیوں کی قدرت کے امکانات کو ظاہر کر کے نامعلوم دنیاؤں کی تسخیر کی تحریک دے رہاہے اور انسان نے اپنی تحقیق و تجربات کے ذریعے اس میں نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کرلی ہیں۔

معجزات کے اس مطالعہ کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ معجزات کا ظہور آج بھی ممکن ہے۔ کل اگر وہ معجزات انبیاء کے ہاتھوں مادی اسباب کے بغیر یا روحانی اسباب کے تحت باذن الٰہی وجود میں آئے تھے تو آج سائنسی تحقیقات و تجربات کے ذریعے مادی اور ظاہری اسباب کے تحت ان کے وجود میں آنے کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔تاہم اب ان کی حیثیت سائنسی انکشافات و دریافت اور ایجاد کی ہو گی نہ کہ معجزات کی، البتہ ان معجزات کا اعادہ ممکن نہ ہو گا جن کے متعلق یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں۔اس بحث سے خدانخواستہ معجزات کی اہمیت کم کرنا مقصود نہیں بلکہ معجزات انبیاء کی اہمیت، عظمت

اب بھی اپنی جگہ مسلم ہے کیونکہ وہ مادی اسباب کے بغیر ظہور میں آئے جب کہ جدید سائنسی انکشافات و ایجادات مادی اسباب کی مرہون منت ہیں۔ معجزات کے متعلق یہ نقطۂ نظر انسان کے ذوق تحقیق کے لئے مہمیز کا کام دے سکتا ہے اور تحقیق کے بند دروازوں کو کھولنے کے ساتھ ساتھ ہمارے فکری زاویوں کی تشکیل اور ذہنی افق کی توسیع میں بھی نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معجزات انبیاء تحقیق و تدبر کی کلید (Key) ، علم و حکمت کا خزانہ اور مادی و روحانی ترقی کا زینہ ہیں جن کے ذریعے معراج کمال تک پہنچا جا سکتا ہے، جو درحقیقت مذہب کا مقصود ہے اور مذہب کی حقیقی روح ہی کے ذریعے ایک ایسی متوازن زندگی کی تشکیل و تعمیر ممکن ہے جو دنیوی اور اخروی سعادتوں کی ضمانت دے سکے۔

پروفیسر ڈاکٹر ازکیاء ہاشمی، ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

حواشی و حوالہ جات

[1] امام غزالیؒ نے ''المنقذ من الضلال'' میں، ابن تیمیہ نے ''الجواب الصحیح'' اور مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ میں، رازی نے ''تفسیر کبیر'' میں، سر سید احمد خان نے ''تفسیر القرآن'' میں، مولانا شبلی نعمانی نے ''الکلام اور علم الکلام میں، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے (Reconstruction of Religious thoughts) اور دیگر نثری تحریروں میں، مولانا بدر عالم نے ترجمان السنۃ میں، مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے رسالہ ''اسلام اور معجزات'' میں، مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی نے ''قصص القرآن'' میں، اور شیخ مصطفیٰ صبری بک نے ''موقف العقل والعلم والعالم'' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔

[2]تفصیل کے لئے دیکھئے: The Encyclopedia of Philosophy. Vol-5 (New York). Pp. 346-353; Enxyclopaedia Britanica. Vol-12, p 269-274

روح کی حقیقت وماہیت قرآن کی روشنی میں

روح انسانی کیا چیز ہے ؟اس کی ماہیت و حقیقت کیا ہے ؟ یہ سوال صحیحین کی روایت کے موافق یہود مدینہ نے آنحضرت ﷺ کے آزمانے میں کیا تھا۔اور ''سیر ''کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں قریش نے یہود کے مشورہ سے یہ سوال کیا۔اسلئے آیت کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے ، ممکن ہے نزول مکرر ہوا ہو، واللہ اعلم۔ یہاں اس سوال کے درج کرنے سے غالباً یہ مقصود ہو گا کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی ان لوگوں کو ضرورت ہے ادھر سے تو اعراض کرتے ہیں اور غیر ضروری مسائل میں ازراہ تعنت و عناد جھگڑتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ وحی قرآنی کی روح سے باطنی زندگی حاصل کرتے اور اس نسخہ شفا سے فائدہ اٹھاتے ''اور اس طرح ہم ے تمہارے پاس اپنے حکم سے ایک روح بطور وحی نازل کی ہے ''(شوریٰ۔ ۵۲)''وہ اپنے حکم سے فرشتوں کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اس زندگی بخشنے والی روح (وحی) کیساتھ اتارتا'' (نحل۔ ۲) مگر انہیں دورازکار اور معاندانہ بحثوں سے فرصت کہاں۔

"روح" کیا ہے؟ جوہر ہے یا عرض؟ مادی ہے یا مجرد؟ بسیط ہے یا مرکب؟ اس قسم کے غامض اور بے ضرورت مسائل کے سمجھنے پر نجات موقوف ہے نہ یہ بحثیں انبیاء کے فرائض تبلیغ سے تعلق رکھتی ہیں۔ بڑے بڑے حکماء اور فلاسفر آج تک خود "مادہ" کی حقیقت پر مطلع نہ ہو سکے "روح" جو بہر حال "مادہ" سے کہیں زیادہ لطیف و خفی ہے اس کی اصل ماہیت و کنہ تک پہنچنے کی پھر کیا امید کی جا سکتی ہے۔ مشرکین کی جہالات اور یہود مدینہ کی اسرائیلیات کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ جو قوم موٹی موٹی باتوں اور نہایت واضح حقائق کو نہیں سمجھ سکتی، وہ روح کی حقائق پر دسترس پانے کی کیا خاک استعداد و اہلیت رکھتی ہو گی؟ تو کار زمیں را نکو ساختی، کہ با آسماں نیز پرداختی۔

موضح القرآن میں ہے کہ "حضرت کو آزمانے کو یہود نے پوچھا، سو اللہ نے (کھول کر) نہ بتایا کیونکہ ان کو سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ آگے پیغمبروں نے بھی مخلوق سے ایسی باریک باتیں نہیں کیں۔ اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی، وہ جی اٹھا، جب نکل گئی مر گیا" اھ (تنبیہ) حق تعالیٰ کا کلام اپنے اندر عجیب و غریب اعجاز رکھتا ہے۔ روح کے متعلق یہاں جو کچھ فرمایا اس کا سطحی مضمون عوام اور قاصر الفہم یا کجرو معاندین کے لئے کافی ہے۔ لیکن اسی سطح کے نیچے ان ہی مختصراً الفاظ کی تہ میں روح کے متعلق وہ بصیرت افروز حقائق مستور ہیں جو بڑے سے بڑے عالی دماغ نکتہ رس فلسفی اور ایک عارف کامل کی راہ طلب و تحقیق میں چراغ ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ روح کے متعلق عہد قدیم سے جو سلسلہ تحقیقات کا جاری ہے وہ آج تک ختم نہیں ہوا، اور نہ شاید ہو سکے۔ روح کی اصلی کنہ و حقیقت تک پہنچنے کا دعویٰ تو بہت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ ابھی تک کتنی ہی محسوسات ہیں جن کی کنہ و حقیقت معلوم کرنے سے ہم عاجز رہے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک آیات قرآنیہ سے روح کے متعلق ان چند نظریات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔

)۱ (انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ کوئی اور چیز موجود ہے جسے "روح" کہتے ہیں وہ "عالم امر" کی چیز ہے اور خدا کے حکم و ارادہ سے فائز ہوتی ہے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ سورۃ الاسرا آیت 85۔ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (آل عمران۔۵۹) ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ المومنون۔۱۴) إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (نحل۔۴۰(

)۲ (روح کی صفات علم و شعور وغیرہ بتدریج کمال کو پہنچتی ہیں اور ارواح میں حصول کمال کے اعتبار سے بے حد تفاوت و فرق مراتب ہے۔ حتیٰ کہ خدا تعالیٰ کی تربیت سے ایک روح ایسے بلند اور اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں دوسری ارواح کی قطعًا رسائی نہ ہوسکے۔ جیسے روح محمدی ﷺ پہنچی۔ یشیر الیہ اضافۃ الامرا لی الرب والرب الی یاء المتکلم المراد بہ ہہنا محمد ﷺ۔ و قولہ تعالیٰ فیما بعد "قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (سورۃ الاسرا۔88)

)۳ (مگر اس کے یہ کمالات ذاتی نہیں۔ وہاب حقیقی کے عطا کئے ہوئے ہیں اور محدود ہیں۔ یدل علیہ قول تعالیٰ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ روح انسانی خواہ علم و قدرت وغیرہ صفات میں کتنی ہی ترقی کر جائے حتیٰ کہ اپنے تمام ہم جنسوں سے گوئے سبقت لے جائے پھر بھی اس کی صفات محدود رہتی ہیں صفات باری کی طرح لامحدود نہیں ہو جاتیں۔ اور یہ ہی بڑی دلیل اس کی ہے کہ آریوں کے عقیدہ کے موافق روح خدا سے علیحدہ کوئی قدیم و غیر مخلوق ہستی نہیں ہوسکتی۔ ورنہ تحدید کہاں سے آئی۔

)۴ (کتنی ہی بڑی کامل روح ہو، حق تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس وقت چاہے اس سے کمالات سلب کرلے۔ گو اس کے فضل و رحمت سے کبھی ایسا کرنے کی نوبت نہ آئے۔ یدل علیہ قولہ تعالیٰ: وَلَئِن شِئْنَا

لَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِيۡٓ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيۡنَا وَكِيۡلًا 86 اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَيۡكَ كَبِيۡرًا 87 (سورۃ الاسراء)

امر ربی کیا ہے؟

یہ چند اصول جو ہم نے بیان کئے اہل فہم کو نسق آیات میں ادنی تامل کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں صرف ایک "عالم امر" (قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّيۡ) کا لفظ ہے جس کی مناسب تشریح ضروری ہے اور جس کے سمجھنے سے امید ہے روح کی معرفت حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

لفظ "امر" قرآن کریم میں بیسیوں جگہ آیا اور اس کے معنی کی تعیین میں علماء نے کافی کلام کیا ہے لیکن میری غرض اس وقت سورہ "اعراف" کی آیت ۵۴ اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ (یاد رکھو کہ پیدا کرنا اور حکم دینا سب اسی کا کام ہے) کی طرف توجہ دلانا ہے۔ جہاں "امر" کو "خلق" کے مقابل رکھا ہے۔ جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خدا کے یہاں دو مد بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں ایک "خلق" دوسرا "امر" دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس کو ہم سیاق آیات سے بسہولت سمجھ سکتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِيۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ يُغۡشِى الَّيۡلَ النَّهَارَ يَطۡلُبُهٗ حَثِيۡثًا ۙ وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمۡرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ 54

ترجمہ: یقیناً تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے سارے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے۔ (۲۸) پھر اس نے عرش پر استواء فرمایا۔ (۲۹) وہ دن کو رات کی چادر اڑھا دیتا ہے، جو تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اس کو

آ دبو چتی ہے۔اور اس نے سورج اور چاند تارے پیدا کیے ہیں جو سب اس کے حکم کے آگے رام ہیں۔ یاد رکھو کہ پیدا کرنا اور حکم دینا سب اسی کا کام ہے۔ بڑی برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

پہلے فرمایا۔اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ یہ تو خلق ہوا۔ درمیان میں اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا ذکر کر کے جو شان حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا ۔ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ یعنی ان مخلوقات کو ایک معین و محکم نظام پر چلاتے رہنا جسے تدبیر و تصریف کہہ سکتے ہیں۔ یہ ''امر''ہوا۔ دوسری جگہ :''اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ ۔(اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے، اور زمین بھی انہی کی طرح۔ اللہ کا حکم ان کے درمیان اترتا رہتا ہے،)طلاق۔ ۱۲) گویا دنیا کی مثال ایک بڑے کارخانہ کی سمجھو جس میں مختلف قسم کی مشینیں لگی ہوں۔ کوئی کپڑا بن رہی ہے کوئی آٹا پیس رہی ہے کوئی کتاب چھاپتی ہے کوئی شہر میں روشنی پہنچا رہی ہے۔ کسی سے پنکھے چل رہے ہیں۔ وغیرہ ذٰلک۔ ہر ایک مشین میں بہت سے کل پرزے ہیں جو مشین کی غرض و غایت کا لحاظ کر کے ایک معین اندازے سے ڈھالے جاتے اور لگائے جاتے ہیں۔ پھر سب پرزے جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جاتا ہے۔ جب تمام مشینیں فٹ ہو کر کھڑی ہو جاتی ہیں، تب الیکٹرک (بجلی) کے خزانہ سے ہر مشین کی طرف جدا جدا راستہ سے کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے آن واحد میں ساکن و خاموش مشینیں اپنی اپنی ساخت کے موافق گھومنے اور کام کرنے لگ جاتی ہیں۔ بجلی ہر مشین اور ہر پرزہ کو اس کی مخصوص ساخت اور غرض کے مطابق گھماتی ہے۔ حتٰی کہ جو قلیل و کثیر کہربائیہ روشنی کے لیمپوں اور قمقموں میں پہنچتی ہے ،وہاں پہنچ کر ان ہی قمقموں کی ہیأت اور رنگ اختیار کر لیتی ہے۔اس مثال میں یہ بات واضح ہو گی کہ مشین کا ڈھانچہ تیار کرنا، اس کے کل پرزوں کا ٹھیک اندازہ پر رکھنا، پھر فٹ کرنا، ایک سلسلہ کے کام ہیں جس کی

تکمیل کے بعد مشین کو چالو کرنے کے لئے ایک دوسری چیز (بجلی یا اسٹیم) اس کے خزانہ سے لانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سمجھ لو حق تعالیٰ نے اول آسمان و زمین کی تمام مشینیں بنائیں جس کو ''خلق'' کہتے ہیں، ہر چھوٹا بڑا پرزہ ٹھیک اندازہ کے موافق تیار کیا جسے ''تقدیر'' کہا گیا ہے وَخَلَقَ کُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان۔۲) سب کل پرزوں کو جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جسے ''تصویر'' کہتے ہیں خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (اعراف۔۱۱) یہ سب افعال خلق کی مد میں تھے۔ اب ضرورت تھی کہ جس مشین کو جس کام میں لگانا ہے لگا دیا جائے۔ آخر مشین کو چالو کرنے کے لئے 'امر الٰہی'' کی بجلی چھوڑ دی گئ۔ شاید اس کا تعلق اسم ''باری'' سے ہے: الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (الحشر۔۲۴) وفی الحدیث فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ وفی سورہ الحدید۔۲۲ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا۔ ای النفوس کما ھو مروی عن ابن عباس و قتادۃ والحسن۔

کن فیکون کی علمی توجیہہ:

غرض ادھر سے حکم ہوا ''چل'' فورًا چلنے لگی۔ اسی ''امر الٰہی'' کو فرمایا اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ 82 (یٰس۔۸۲) دوسری جگہ نہایت وضاحت کے ساتھ اَمرِ ''کن'' کو خلق جسد پر مرتب کرتے ہوئے ارشاد ہوا خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران۔۵۹) بلکہ تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں کُنْ فَيَكُوْنُ کا مضمون جتنے مواضع میں آیا عمومًا خلق و ابداع کے ذکر کے بعد آیا ہے۔ جس سے خیال گذرتا ہے کہ کلمہ ''کن'' کا خطاب ''خلق'' کے بعد تدبیر و تصریف وغیرہ کے لئے ہوتا ہو گا۔ واللہ اعلم۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں ''امر'' کے معنی ''حکم'' کے ہیں اور وہ حکم یہ ہی ہے جسے لفظ ''کن'' سے تعبیر کیا گیا۔ اور ''کن'' جنس کلام سے ہے حق تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے۔ جس طرح ہم اس کی تمامی

صفات (مثلاً حیات سمع، بصر وغیرہ) کو بلا کیف تسلیم کرتے ہیں، کلام اللہ و کلمۃ اللہ کے متعلق بھی یہ ہی مسلک رکھنا چاہئے۔

خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ ''روح'' کے ساتھ اکثر جگہ قرآن میں امر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قُلِ الرُّوحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ۔ وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا (الشوریٰ۔ ۵۲) یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ (المومن۔ ۱۵) یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ (النحل۔ ۲) اور پہلے گذر چکا ہے کہ ''امر'' عبارت ہے کلمہ ''کن'' سے یعنی وہ کلام انشائی جس سے مخلوقات کی تدبیر و تصریف اس طریقہ پر کی جائے جس پر غرض ایجاد و تکوین مرتب ہو۔ لہذا ثابت ہوا کہ ''روح'' کا مبداء حق تعالیٰ کی صفت کلام ہے جو صفت علم کے ماتحت ہے۔ شاید اسی لئے نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ (ص۔ ۷۲) میں اسے اپنی طرف منسوب کیا ''کلام'' اور ''امر'' کی نسبت متکلم اور امر سے ''صادر'' و ''مصدور'' کی ہوتی ہے ''مخلوق'' و ''خالق'' کی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ (اعراف۔ ۵۴) میں ''امر'' کو ''خلق'' کے مقابل رکھا۔

ہاں یہ امر ''کن'' باری تعالیٰ شانہ سے صادر ہو کر ممکن ہے جو ہر مجرد کے لباس میں یہ ایک ''ملک اکبر'' اور ''روح اعظم'' کی صورت میں ظہور پکڑے۔ جس کا ذکر بعض آثار میں ہوا ہے اور جسے ہم ''کہربائیہ روحیہ'' کا خزانہ کہہ سکتے ہیں۔ گویا یہیں سے روح حیات کی لہریں دنیا کی ذوی الارواح پر تقسیم کی جاتی ہیں۔ اور اَلۡاَرۡوَاحُ جُنُوۡدٌ مُّجَنَّدَۃٌ الخ کے بے شمار تاروں کا یہیں کنکشن ہوتا ہے اب جو کرنٹ چھوٹی بڑی بے شمار مشینوں کی طرف چھوڑا جاتا ہے وہ مشین سے اس کی بناوٹ اور استعداد کے موافق کام لیتا اور اس کی ساخت کے مناسب حرکت دیتا ہے۔ بلکہ جن لیمپوں اور قمقموں میں یہ بجلی پہنچتی ہے ان ہی کہ مناسب رنگ و

ہئیت اختیار کر لیتی ہے۔رہی یہ بات کہ ''کن''کا حکم جو قسم کلام سے ہے، جوہر مجرد یا جس نورانی لطیف کی شکل کیونکر اختیار کر سکتا ہے اسے یوں سمجھ لو کہ تمام عقلاء اس پر متفق ہیں کہ ہم خواب میں جو اشکال وصور دیکھتے ہیں، بعض اوقات وہ محض ہمارے خیالات ہوتے ہیں جو دریا، پہاڑ، شیر، بھیڑیے وغیرہ کی شکلوں میں نظر آتے ہیں۔اب غور کرنے کا مقام ہے کہ خیالات جو اعراض ہیں اور دماغ کے ساتھ قائم ہیں وہ جواہر واجسام کیونکر بن گئے اور کس طرح ان میں اجسام کے لوازم وخواص پیدا ہو گئے۔ یہاں تک بعض دفعہ خواب دیکھنے والے سے بیدار ہونے کے بعد بھی ان کے آثار جدا نہیں ہوتے فی الحقیقت خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو خواب کے ذریعہ سے بڑی بھاری ہدایت کی ہے کہ جب ایک آدمی کی قوت مصورہ میں اس نے اس قدر طاقت رکھی ہے کہ وہ اپنی بساط کے موافق غیر مجسم خیالات کو جسمی سانچہ میں ڈھال لے اور ان میں وہ ہی خواص وآثار باذن اللہ پیدا کرے جو عالم بیداری میں اجسام سے وابستہ تھے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ وہ خیالات خواب دیکھنے والے کے دماغ سے ایک منٹ کو علیحدہ بھی نہیں ہوئے۔ان کا ذہنی وجود بدستور قائم ہے تو کیا اس حقیر سے نمونہ کو دیکھ کر ہم اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ ممکن ہے قادر مطلق اور مصور برحق جل وعلا کا امر بے کیف ''کن'' باوجود صفت قائمہ بذاتہ تعالیٰ ہونے کے کسی ایک یا متعدد صورتوں میں جلوہ گر ہو جائے۔ان صورتوں کو ہم ارواح یا فرشتے یا کسی اور نام سے پکاریں۔ وہ ارواح وملائکہ وغیرہ سب حادث ہوں۔اور ''امر الٰہی'' بحالہ قدیم رہے۔امکان وحدوث کے آثار واحکام ارواح وغیرہ تک محدود رہیں اور ''امر الٰہی'' ان سے پاک و برتر ہو۔ جیسے جو صورت خیالیہ بحالت خواب آگ کی صورت میں نظر آتی ہے اس صورت ناریہ میں احراق، سوزش، گرمی وغیرہ سب آثار ہم محسوس کرتے ہیں حالانکہ اسی آگ کا تصور سالہا سال بھی دماغوں میں رہے تو ہمیں ایک سیکنڈ کے لئے یہ آثار محسوس نہیں ہوتے۔ پس کوئی شبہ نہیں

کہ روح انسانی (خواہ جوہر مجرد ہو یا جسم لطیف نورانی) ''امر ربی'' کا مظہر ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ مظہر کے سب احکام و آثار ظاہر پر جاری ہوں کما ہو الظاہر۔ واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے لکھا اور جو مثالیں پیش کیں ان سے مقصود محض تسہیل و تقریب الی الفہم ہے ورنہ ایسی کوئی مثال دستیاب نہیں ہو سکتی جو ان حقائق غیبیہ پر پوری طرح منطبق ہو اے بروں از دہم و قال و قیل من، خاک ہر فرق من و تمثیل من۔ رہا یہ مسئلہ کہ روح جوہر مجرد ہے جیسا کہ اکثر حکمائے قدیم اور صوفیہ کا مذہب ہے یا جسم نورانی لطیف جیسا کہ جمہور اہل حدیث وغیرہ کی رائے ہے۔ اس میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم سید انور شاہ صاحب اطال اللہ بقائہ نے فرمایا کہ بالفاظ عارف جامی یہاں تین چیزیں ہیں۔

(۱) وہ جواہر جن میں مادہ اور کمیت دونوں ہوں جیسے ہمارے ابدان مادیہ

۲) (جواہر جن میں مادہ نہیں صرف کمیت ہے جنہیں صوفیہ ''اجسام مثالیہ'' کہتے ہیں

۳) (وہ جواہر جو مادہ اور کمیت دونوں سے خالی ہوں جن کو صوفیہ ''ارواح'' یا حکماء جواہر مجردہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

جمہور اہل شرع جس کو ''روح'' کہتے ہیں وہ صوفیہ کے نزدیک ''بدن مثالی'' سے موسوم ہے جو بدن مادی میں حلول کرتا ہے۔ اور بدن مادی کی طرح آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ اعضاء رکھتا ہے۔ یہ روح بدن مادی سے کبھی جدا ہو جاتی ہے اور اس جدائی کی حالت میں بھی ایک طرح کا مجہول الکیفیت علاقہ بدن کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے جس سے بدن پر حالت موت طاری ہونے نہیں پاتی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قول کے موافق جو بغوی نے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الاَنفُسَ حِینَ موتِہا (الزمر۔ ۴۲) کی تفسیر میں نقل کیا، اس

وقت روح خود علیحدہ رہتی ہے مگر اس کی شعاع جسد میں پہنچ کر بقائے حیات کا سبب بنتی ہے۔ جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے۔ یا جیسے آج ہی میں نے اخبار میں ایک تار پڑھا کہ ''حال ہی میں فرانس کے محمکہ پرواز نے ہوابازوں کے بغیر طیارے چلا کر خفیہ تجربے کئے ہیں اور تعجب انگیز نتائج رونما ہوئے ہیں۔ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ حال میں ایک خاص بم پھینکنے والا طیارہ بھیجا گیا تھا جس میں کوئی شخص سوار نہ تھا۔ لیکن لاسکی کے ذریعہ سے منزل مقصود پر پہنچایا گیا۔ اس طیارہ میں بم بھر کر وہاں گرائے گئے اور پھر وہ مرکز میں واپس لایا گیا (یہ اس دور کی تحریر ہے جب یہ گائیڈڈ میزائل اور ڈرون ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ ایڈمن) دعویٰ کیا جاتا ہے کہ لاسکی کے ذریعہ سے ہوائی جہاز نے خود بخود جو کام کیا وہ ایسا مکمل ہے جیسا کہ ہواباز کی مدد سے عمل میں آتا''۔ آج کل یورپ میں جو سوسائٹیاں روح کی تحقیقات کر رہی ہیں انہوں نے بعض ایسے مشاہدات بیان کئے ہیں کہ ایک روح جسم سے علیحدہ تھی اور روح کی ٹانگ پر حملہ کرنے کا اثر جسم مادی کی ٹانگ پر ظاہر ہوا۔ بہر حال اہل شرع جو روح ثابت کرتے ہیں صوفیہ کو اس کا انکار نہیں بلکہ وہ اس کے اوپر ایک اور روح مجرد مانتے ہیں جس میں کوئی استحالہ نہیں بلکہ اگر اس روح مجرد کی بھی کوئی اور روح ہو اور آخر میں کثرت کا سارا سلسلہ سمٹ کر ''امر ربی'' کی وحدت پر منتہی ہو جائے تو انکار کی ضرورت نہیں۔ شیخ فرید الدین عطارؒ نے ''منطق الطیر'' میں کیا فرمایا ہم ز جملہ و ہم پیش از ہمہ، جملہ از خود دیدہ و خویش از ہمہ۔ جاں نہاں در جسم واو در جاں نہاں، اے نہاں اندر نہاں اے جان جان۔ مذکورہ بالا تقریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر چیز میں جو ''کن'' کی مخاطب ہوئی، روح حیات پائی جائے۔ بیشک میں یہ ہی سمجھتا ہوں کہ ہر مخلوق کی ہر ایک نوع کو اس کی استعداد کے موافق قوی یا ضعیف زندگی ملی ہے یعنی جس کام کے لیے وہ چیز پیدا کی گئ، ڈھانچہ تیار کر کے اس کو حکم دینا ''کن'' (اس کام میں لگ جا) بس یہ ہی اس کی

روح حیات ہے جب تک اور جس حد تک یہ اپنی غرض ایجاد کو پورا کرے گی اسی حد تک زندہ سمجھی جائے گی۔اور جس قدر اس سے بعید ہو کر معطل ہوتی جائے گی اسی قدر موت سے نزدیک یا مردہ کہلائے گی۔ ہذاما عندی و عندالناس ماعندہم واللہ سبحانہ و تعالیٰ ہوا لمُلہم للصواب۔

از شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

8

روح کی حقیقت اور احادیث

اللہ تعالی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے ،اور روح بھی مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے ،اس حقیقت وغیرہ کا علم تو اللہ تعالی کی خصوصیت ہے جس طرح کہ حدیث میں وارد ہے : عبداللہ بن مسعود رضي اللہ تعالی عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کھیتی میں تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کی چھڑی پر سہارا لیے ہوئے تھے کہ اچانک وہاں سے کچھ یھودیوں کا وہاں سے گذر ہوا تو وہ ایک

دوسرے کو کہنے لگے کہ ان سے روح کے بارہ میں سوال کرو تو وہ کہنے لگا کہ تمہاری کیا رائے ہے کہ اس کے پاس چلیں تو ایک نے کہا نہیں کہیں وہ ایسی بات نہ کہہ دے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ وہ کہنے لگے کہ اس سے پوچھو تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے بارہ میں سوال کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی اور جواب نہیں دیا تو مجھے یہ علم ہو گیا کہ آپّ پر وحی کا نزول ہو رہا ہے تو میں اپنی جگہ پر ہی کھڑا ہو گیا تو جب وحی کا نزول ہو چکا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور وہ آپ سے روح کے بارہ میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیں کہ روح میرے رب کا حکم ہے اور تمہیں تو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے) صحیح بخاری)

اللہ تعالی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب وسنت میں روح کے کئ ایک اوصاف بیان کیے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں: وہ قبض اور فوت ہوتی ہے اور اسے جکڑا اور کفن میں لپیٹا جاتا ہے، وہ آتی اور جاتی ہے اوپر چڑھتی اور نیچے اترتی ہے، اور وہ اس طرح نکل جاتی ہے جس طرح کہ آٹے سے بال نکلتا ہے۔ روح بدن کی طرح نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور اس میں روح پھونکی اور اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اللہ تعالی نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان میں روح پھونکی تو آدم علیہ السلام نے چھینک ماری اور الحمد للہ کہا تو انہوں اللہ تعالی کی اجازت سے ہی اللہ تعالی کی تعریف کی) سنن ترمذي: 3290)۔

اللہ تعالی فرشتے کو مادر رحم میں پائے جانے والے بچے میں روح پھونکنے کے لیے بھیجتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں اس کا ذکر ہے: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا اور وہ صادق ومصدوق ہیں کہ تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک جمع کیا جاتا ہے پھر اسی طرح چالیس یوم میں خون کا لوتھڑا اور پھر اسی طرح چالیس یوم میں گوشت کا ٹکڑا پھر

فرشتہ بھیجا جاتا ہے تو وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے چار چیزوں کا حکم دیا جاتا ہے اس کے رزق اور موت اور اسے عمل اور شقی یا سعید کے بارہ میں۔) صحیح مسلم حدیث نمبر (4781)۔

روح نیچے پاؤں کی انگلیوں سے اوپر کی جانب قبض کی جاتی ہے تو جب وہ حلق تک پہنچتی ہے تو مرنے والے شخص کا غرغرہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھیں اوپر کو اٹھ جاتی ہیں۔ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابو سلمہ رضي اللہ عنہ کے پاس آئے تو ان کی آنکھیں پھٹ چکی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بند کیا پھر فرمانے لگے: بلاشبہ جب روح قبض کی جاتی ہے تو آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے۔ صحیح مسلم حدیث نمبر (1528)۔

اور فرشتے روح سے ملتے جلتے ہیں جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''فرشتے تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کی روح سے ملے تو اسے کہنے لگے کیا تو نے کوئی اچھا کام کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں اپنے ملازموں سے کہا کرتا تھا کہ تنگ دستوں سے در گزر کرو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہوں نے اس سے در گزر کر دیا) صحیح بخاری حدیث نمبر (1935)۔

فرشتے روح قبض کرنے کے بعد اسے آسمان پر لے جاتے ہیں جس طرح کہ حدیث میں بھی وارد ہے :ابو ھریرہ رضي اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب مومن کی روح نکلتی ہے تو اسے فرشتے مل کر بٹھاتے ہیں۔۔۔اور انہوں نے اس روح کی اچھی خوشبو ذکر کیا اور کستوری کا بھی ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ آسمان والے کہتے ہیں زمین سے اچھی روح آئی ہے تجھ پر جس جسم میں تو تھی اللہ تعالی اپنی رحمت کرے تو وہ اسے لیکر اللہ تعالی کے پاس لے جاتے ہیں پھر وہ کہتا ہے کہ اسے سدرۃ المنتھی تک لے جاؤ۔

وہ کہتے ہیں کہ جب کافر کی روح نکلتی ہے۔۔اور انہوں نے اس کی گندی بدبو کاذکر کیااور لعنت کا بھی اور اہل آسمان کہتے ہیں کہ زمین سے خبیث روح آئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اسے سجین کی طرف لے جاؤ (جو کہ کفار کی روحوں کی جگہ ہے)ابو ھریرہ رضي اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں کہ نبی علیہ وسلم نے اپنے ناک پر رکھا ہوا رومال ہٹایا۔ صحیح مسلم(5119)۔

روح نکلنے کے بارہ میں تفصیل سے امام احمد رحمہ اللہ تعالی نے براء بن عازب رضي اللہ تعالی عنہ سے بیان کی ہے:

براء بن عازب رضي اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری صحابی کے جنازہ میں گ ئے گویا کہ ہمارے سروں پر پرندے ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس سے وہ زمین کرید رہے تھے، توانہوں نے اپنا سر اٹھایااور فرمانے لگے عذاب قبر سے اللہ تعالی کی پناہ طلب کرو یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو یا تین بار دھرائ پھر فرمانے لگے: جب مومن بندہ اس دنیا سے آخرت کی طرف جارہا ہوتا ہے تو آسمان سے سفید چہروں والے فرشتے اس کے پاس آتے ہیں گویا کہ ان کے چہرے سورج ہوں ان کے پاس جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے حتی کہ وہ اس کے سامنے حد نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سر کے قریب بیٹھتا اور کہتا ہے اے اچھی جان اپنے رب کی مغفرت اور رضامندی کی طرف چلو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ روح اس طرح نکلتی ہے جس طرح کہ مشکیزے کے منہ سے پانی کا قطرہ بہتا ہے، توفرشتے اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور پلک جھپکتے ہی اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے جنتی کفن اور خوشبو میں لپیٹ لیتے ہیں اور اس سے زمین میں پائ جانے والی سب سے اچھی قسم کی کستوری کی خوشبو نکلتی ہے، تووہ اسے لیکر اوپر چڑھتے ہیں تووہ جس فرشتے کے پاس سے بھی گزرتے ہیں وہ

کہتا ہے یہ اچھی روح کس کی ہے ؟ تو وہ کہتے کہ یہ فلان بن فلان ہے دنیا میں اسے جس سب سے اچھے نام سے بلایا جاتا تھا حتی کہ وہ اسے آسمان دنیا تک جا کر اسے کھلواتے ہیں تو کھول دیا جاتا ہے تو اسے ہر آسمان والے دوسرے آسمان تک پہنچاتے ہیں حتی کہ ساتویں آسمان تک جاتے ہیں تو اللہ تعالی فرماتے ہیں میرے بندے کی کتاب اعلی علیین میں لکھ دو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو بلاشبہ میں نے انہیں اسی میں پیدا کیا اور اسی میں لوٹاؤں گا اور پھر اسی میں سے نکالوں گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی روح جسم میں لوٹائی جاتی ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آ کر اسے بٹھاتے اور اسے کہتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے تو وہ کہتا ہے میرا رب اللہ تعالی ہے، وہ اسے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے ؟ وہ جواب دیتا ہے میرا دین اسلام ہے، وہ اس سے سوال کرتے ہیں اس شخص کے بارہ میں تیرا کیا خیال ہے جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا وہ جواب دے گا وہ اللہ تعالی کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، وہ اس سے سوال کرتے ہیں تیرا علم کیا ہے وہ جواب دیتا ہے میں نے کتاب اللہ کو پڑھا تو اس پر ایمان لایا اور تصدیق کی تو آسمان میں آواز لگائی جاتی ہے کہ میرے بندے نے سچ بولا اس کے لیے جنت کا بستر لگاؤ اور جنتی لباس پہناؤ اور جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں سے جنت کی ہوائیں اور خوشبو آتی ہے اور حد نگاہ تک اس کی قبر وسیع ہو جائے گی، اور فرمایا کہ اس کے پاس خوبصورت وجیہ شکل اور خوبصورت لباس اور اچھی خوشبو میں ایک شخص آ کر کہتا ہے خوش ہو جاؤ یہی وہ دن ہے جس کا تیرے ساتھ وعدہ کیا جاتا تھا، تو وہ اسے کہے گا تو کون ہے تیرے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تو خیر لانے والا ہے، وہ جواب دے گا میں تیرے اعمال صالحہ ہوں، وہ شخص کہے گا اے رب قیامت قائم کر دے حتی کہ میں اپنے گھر اور مال میں چلا جاؤں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ جب کافر اس دنیا سے آخرت کی طرف جارہا ہوتا ہے تو اس آسمان سے اس کے پاس سیاہ چہروں والے کھردرا ٹاٹ لیے آتے اور اس کے پاس حد نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا اور کہتا کہ اے خبیث روح اپنے رب کے غصہ اور غضب کی طرف نکل۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو وہ روح پورے جسم میں پھیل جاتی ہے تو اسے جسم سے اس طرح کھینچا جاتا ہے جس طرح کہ بھیگی ہوئی روئی سے سلاخ کھینچی جاتی ہے، تو وہ اسے پکڑ کر پلک جھپکتے ہی اس کھردرے ٹاٹ میں رکھ دیتے ہیں اور اس سے زمین پر پائے جانے والے گندے ترین مردار کی طرح بدبو آتی ہے تو وہ اسے لیکر اوپر چڑھتے ہیں وہ فرشتوں میں سے جس کے پاس سے بھی گزرتے ہیں وہ کہتا کہ یہ کس کی گندی روح ہے تو وہ کہتے ہیں یہ فلان بن فلان اس نام ساتھ جو زمین میں قبیح ترین نام اسے دیا جاتا تھا حتی کہ وہ آسمان دنیا تک پہنچتے اور اسے کھلواتے ہیں لیکن نہیں کھولا جاتا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کا یہ فرمان پڑھا: {ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ اس وقت تک جنت میں بھی نہیں داخل ہو سکتے حتی کہ سوئی کے نکے میں اونٹ داخل ہو جائے}

تو اللہ تعالی فرمائیں گے کہ اس کی کتاب سب سے نچلی زمین میں سجین کے اندر لکھ دو تو اس کی روح کو اوپر سے ہی پھینک دیا جائے گا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: {اور جو بھی اللہ تعالی کے ساتھ شرک کرتا ہے وہ اس طرح ہے کہ جیسے آسمان سے گرے تو اسے پرندے اچک لے جائیں یا پھر اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر پھینک دے}

تو اس کی روح جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور دو فرشتے اس کے پاس آکر بٹھاتے اور کہتے ہیں تیرا رب کون ہے وہ جواب میں کہتا ہے ہائے مجھے تو کوئی علم نہیں، وہ اسے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے وہ جواب دیتا ہے ہائے مجھے

تو کچھ علم نہیں، وہ اسے کہتے ہیں اس شخص کے بارہ میں تو کیا کہتا ہے جو تمہارے اند مبعوث کیا گیا، وہ جواب کہتا ہے ہائے مجھے تو اس کا علم نہیں، تو آسمان سے یہ آواز لگائی جاتی ہے کہ :

اس کے لیے آگ کا بستر لگادو اور آگ کی طرف دووازہ کھول دو تو اس سے اس کی گرمی اور دھواں اور بدبو آتی ہے اور قبر اس پر اس قدر تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہیں، اور اس کے پاس ایک قبیح الشکل گندے اور بدبودار کپڑوں میں ملبوس ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے تجھے تیری ناپسندیدگی کی خوشخبری ہے یہی وہ دن ہے جس کا تیرے ساتھ وعدہ کیا جاتا تھا، وہ اس سے سوال کرے گا تو کون ہے ؟ تیرا تو چہرہ ہی ایسا ہے جو شر ہی شر لاتا ہے وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں تیرے برے اعمال ہوں، تو وہ کہے گا اے رب قیامت قائم نہ کر۔ مسند امام احمد حدیث نمبر (17803) اور یہ حدیث صحیح ہے۔

اور آخری زمانے میں اللہ تعالی ایک ایسی ہوا بھیجے گا جو ہر مومن کی روح کو قبض کرلے گی اس کا ذکر مندرجہ ذیل حدیث میں بھی ملتا ہے:

نواس بن سمعان رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال اور نزول عیسی علیہ السلام کا ذکر کیا اور عیسی علیہ السلام کی زندگی میں اچھی معیشت اور ان کے بعد اس وقت لوگوں کی سعادت کا بھی ذکر کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تو وہ اسی حالت میں ہوں گے تو اللہ تعالی ایک اچھی ہوا بھیجے گا جو انہیں ان کی بغلوں کے نیچے سے پکڑے گی اور مومن اور مسلمان کی روح قبض کرلے گی اور سب سے شریر ترین لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح سرعام مجامعت کریں گے تو ان پر قیامت قائم ہو گی۔ صحیح مسلم (5228)۔

اور نیند (جسے موت صغری کہا جاتا ہے) کے وقت بھی روح قبض ہوتی ہے لیکن اسے کلی طور پر قبض نہیں کیا جاتا اسی لیے سویا ہوا شخص بقید حیات اور زندہ ہوتا ہے اللہ تعالی کا فرمان ہے :

{ اور اللہ تعالی ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی ان کی نیند کے وقت قبض کرلیتا ہے پھر جن پر موت کا حکم لگ چکا ہوتا ہے انہیں روک لیتا اور دوسری روحوں کو ایک مقرر وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے، بلا شبہ اس میں غور کرنے والوں کے لیے بہت ساری نشانیاں ہیں } الزمر (42)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو یہ دعا پڑھے :

) بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتُ جَنْبِي وَبِكَ أَرْفَعُهُ فَإِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِي فَارْحَمْهَا وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِينَ (

میرے رب تیرے ہی نام کے ساتھ اپنا پہلو رکھا اور تیرے ہی ساتھ اٹھاؤں گا پس اگر تو میر جان روک لے تو اس پر رحم کر اور اگر تو اسے چھوڑ دے تو اس کی اس طرح حفاظت فرما جس طرح تو اپنے نیک اور صالح بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔

اور جب وہ نیند سے بیدار ہو تو یہ دعا پڑھے :

)الحمد للہ الذي عافاني في جسدي ورد علي روحي وأذن لي بذكره(

اس ذات کی حمد و تعریف ہے جس نے میرے جسم کو عافیت سے نوازا اور میری روح کو مجھ پر لوٹایا اور اپنے ذکر کی اجازت دی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالی نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد حسن قرار دیا ہے سنن ترمذی (3323)۔

روح کے متعلقہ یہ چند آیات اور احادیث صحیحہ تھیں جو آپ کے سامنے ذکر کی گئیں ہیں امید ہے کہ سائل اس کی راہنمائی سے راہ حق اور دین اسلام پر چلے گا۔

آپ کا سوال کرنے پر شکریہ۔

واللہ تعالی اعلم.

الشیخ محمد صالح المنجد

9

رُوح کیا ہے؟ایک سائنسی نظر

روح کیا ہے؟انسانوں کی اکثریت روح کے تصوّر سے آشنا ہے لیکن مادّہ پرست روح سے انکاری ہیں۔روح ہے یا نہیں یا کیا ہے؟اس کی تشریح محض اپنی تمنّا پر نہیں کی جاسکتی بلکہ کائنات اور حیات کے تناظر میں اس کا عقلی جائزہ ہی کسی قابل قبول رائے تک پہنچائے گا کیونکہ کسی بھی موقف کی درستگی کے لیے دلیل ہی جواز بنتی ہے۔

کیاسائنس اور الحاد کے پاس حیات کا کوئی ٹھوس سائنسی جواز ہے؟

کیاسائنس انسان کے اندر موجود متعدّد میکینزم کی سائنسی تشریح کا فریضہ انجام دے چکی؟

حیات کے جواز کے علاوہ کچھ اہم ذیلی سوالات بھی اپنے جواب جدید سائنس سے مانگ رہے ہیں۔مثلاً:

شعور کیا ہے؟ عقل کیا ہے؟ حواس کیوں ہیں؟ خیال کی حقیقت کیا ہے یہ کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ نیند اور خواب کیوں آتے ہیں؟

یادداشت کیا اور کیوں ہے؟

یہ سوالات اُن مظاہر کے بارے میں ہیں جو طبعی وجود نہیں رکھتے لیکن جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انسان ان کو محسوس کرتا ہے۔ آپ کو جدید علوم کے تئیں ان سوالات کے جواب میں کسی ٹھوس جواز کے بجائے اُس متعلّقہ مظہر کی صرف تشریح ملے گی یعنی ان کی موجودگی کی لفظی وضاحت۔ جواز کے اصرار پر یہی جواب ملے گا کہ یہ ناقابل وضاحت مظاہر ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جدید محقّق یا اسکالر ان سوالات کے جوابات اپنے علم کی روشنی میں پانے میں ناکام ہو کر ان کو نظر انداز کر دیتا ہے اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ان سوالات کا جواب سائنس کبھی نہ کبھی ڈھونڈ لے گی! ان کی یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے لیکن ان سوالات کا جواب کیا ملے گا اس کا پتہ نہیں اور نہ یہ ضمانت کہ کسی کی مرضی کا ہی ملے۔ لہٰذا مستقبل کا انتظار تو وہ کریں جنہوں نے آبِ حیات پی لیا ہو کیونکہ ہمارے سامنے تو مذہب ہمارے طرزِ عمل کے تئیں ثواب و عذاب کے حوالے سے فکر مند کر دینے والا نظریہ لیے کھڑا ہے۔ ہمیں کسی انجانے مستقبل میں نہیں بلکہ آج اپنی زندگی میں ہی ان سوالات کے جوابات تلاش کرنا ہیں تاکہ ہم اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں نہ کہ چند پُر امید افراد کے فلسفے کی نظر کر دیں جن کی نظر میں فی الوقت انسان ایک بلبلے کی طرح ظاہر اور فنا ہو رہا ہے۔

آئیں تو پھر ایک اہم پہلو پر غور کریں وہ یہ کہ انسانی جسم کسی نامعلوم وجہ سے سوچتا، حرکت اور کام کرتا ہے۔ ان حرکیات کو ہم اس جسم کے زندہ ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ فی الوقت ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسان کو با عمل، باشعور، باحواس اور دانشمند بنانے والا عامل کیا ہے۔ مگر اس سے پہلے حیات کی مروّجہ تعریف جانیں کہ جدید فکر کا نقطہ نظر کیا ہے۔

ایک ماہر طبعیات حیات کا یہ فعّال نظریہ لایا کہ زندگی اس لیے ہے کیونکہ تھرمل انرجی میں بے ترتیب تبدیلیوں کا قانون مادّے کو اس صورتحال میں لے جاتا ہے کہ وہ حیات کی مانند طبعی شکل حاصل کرلیتا ہے !

برٹرینڈرسل کی نظر میں زندگی ایک ایٹمی حادثہ ہے !

اسٹیون ہاکنگ کے بقول طبعی قوانین نے نہ صرف کائنات بنائی بلکہ ہمارے اذہان بھی !

عموماً زندگی کی وضاحت کم و بیش سطحی یا انتہائی پیچیدہ علمی مفروضات کی تشریحات ہوتی ہیں مگر بے جان مادّے میں زندگی ظاہر ہی کیوں ہوتی ہے اس کی سائنسی وضاحت ابھی تک کہیں نہیں ملتی۔ حیات کی عاقلانہ تعریف میں ناکامی کی وجہ مادّہ پرست کی فکری محدودیت ہے جس کے باعث جدید علوم حیات کے منبع اور موجودگی کا کوئی ٹھوس جواز دینے سے قاصر ہیں۔ یہ جواز ہمیں اسی وقت ملے گا جب ہم اپنی سوچ کے اطراف کھینچی مادّیت کی فصیل کو ڈھا کر ایک کھلے ماحول میں غور کریں گے۔ اب یہی دیکھیں کہ تصّورات اور جذبات جیسے خوشی، غم، محبت، شہرت یا صفت وغیرہ طبعی وجود نہ رکھے بغیر بھی ہمیں قبول ہیں کیونکہ ہم انہیں محسوس کرتے ہیں تو اسی تناظر میں کیا کچھ ایسی چیزیں موجود نہیں ہو سکتیں جنہیں نہ صرف ہم بلکہ ہمارے موجودہ سائنسی آلات ابھی ڈھونڈ نہ پائے ہوں ! یہ بھی مدّ نظر رہے کہ ایسی کسی بھی صورت میں جبکہ کوئی غیر مرئی شئے عقل اور منطق سے اپنا جواز ثابت کرتی ہو تو سائنسی ردّ عمل یہی ہوتا ہے کہ مفروضات کے بموجب اس کی تلاش کی جاتی ہے کیونکہ ایسے کسی اسرار کا بلا استدلال مسترد کرنا علمی تنگ نظری ہوگا۔ اس کی بہترین مثال ہگز فیلڈ Higg's-field کی دریافت ہے۔ سائنسدان پریشان تھے

کہ جب ایٹم توانائی ہے تو اس سے بنی چیز میں وزن کیسے آتا ہے۔ اس پر ایک سائنسدان نے یہ منطقی نظریہ پیش کیا کہ کائنات میں کوئی ایسی فیلڈ ہو سکتی ہے جس سے مس ہو کر ہر ایٹم کو وزن ملتا ہو۔ پھر اس نظریے پر تحقیق ہوئی اور آخر کار اس فیلڈ کی تصدیق تجربات سے ہو گئی۔ روح اور مذکورہ بالا سوالات کے تئیں ہم مذہبی عقائد کو ایک طرف کر کے فطری حقائق اور انسان کی ہی تخلیقات اور تعمیرات کی روشنی میں اس مفروضے پر چھان بین کرتے ہیں کہ :

"کیا ہگز فیلڈ کی طرح انسان کے اندر کوئی پس پردہ کثیر جہتی سسٹم یا کسی انہونی قوّت کا مقناطیسی حصار موجود ہے جو اندرونی نظام میں پیوست ہو کر پراسرار عوامل کو کنٹرول کرتا ہے؟"

ہم آگے اسی مفروضے کے قابل قبول ہونے کے لیے طبعی حوالوں کی تلاش کرتے ہیں جو اسے شواہد کی بنیاد پر مزید منطقی اور عقلی وزن دے۔

انسان کا مشاہدہ اور تجربہ اس کا مکمل یا ادھورا علم بنتا ہے۔ زندگی کا ایک وصف کام کرنا ہے اور انسان نے ایسے اوزار بنائے جو اس کے کام کو آسان کرتے ہیں اور کچھ مشینیں ایسی بھی بنائیں جو خود کار ہوتی ہیں۔ ان مشینوں کی ساخت اور کارکردگی کے پیچھے انسان کا علم ہی عملی پیرائے میں کام کرتا ہے۔ سڑک پر چلتی گاڑی اپنے اندر میکینکل انجینئرنگ کے لاتعداد اسباق کا عرق لیے ہوتی ہے۔ ایک مصوّر کی بنائی تصویر اپنے پیچھے تصوّرات کے بے شمار جھماکوں کا عکس ہوتی ہے۔ کیا ہم اس علم کو دیکھ سکتے ہیں جو کسی تجربے، کوشش یا مشاہدے کے بموجب کسی مشین کی تیّاری یا کسی تصویر کی میناکاری میں استعمال ہو رہا ہے؟ نہیں، اس لیے کہ علم تجریدی ہے۔ ہم روزمرہ کی ایسی چیزوں پر نہ غور کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی سوال اُٹھاتے ہیں کیونکہ ہم ان

کے تعمیری مراحل کو جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کوئی چیز بنانے سے پہلے کسی انسانی ذہن میں اس کا تصوّر پیدا ہوتا ہے پھراس کی تکمیل کی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور علم کے بموجب تعمیر کا عمل ہونے کے بعد چیز تیّار ہوتی ہے۔

ایسی کسی ساخت کی تفصیل میں جائیں تومزید حقائق سامنے آتے ہیں جیسے کمپیوٹراور روبوٹ اپنی ساخت میں تین مختلف پیرایوں کا مجموعہ ہیں، ایک طبعی جس میں ہارڈ ویئر تیّار کیا جاتا ہے جو ایک بے جان چیز ہوتی ہے لیکن اس کی تکنیکی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ الیکٹرک کرنٹ سے توانائی پاکر سوفٹ ویئر کے اشارات سمجھ کر بے شمار کام کر سکے۔اس ضمن میں اس سے کام لینے کے لیے مخصوص اشارات یاسوفٹ ویئر کی تخلیق ایک حسابی علم کے ذریعے کی جاتی ہے۔اس طرح کمپیوٹر کے بننے کے عمل میں مرئی اور غیر مرئی لوازمات کی ایک تکون بنتی ہے جسے ہم تعمیری یاپیداواری تکون manufacturing-triangle کانام دے سکتے ہیں جس میں ایک طرف مادّی لوازمات (ہارڈویئر)، دوسری طرف تجریدی اشارے (سوفٹ ویئر) اور تیسری طرف قوّت (پاور) ہوتے ہیں جو تعمیر کا عمل مکمل ہونے پر ایک ہم آہنگ پیرائے میں عمل پذیر ہوکر کام انجام دے سکتے ہیں۔ یہ سارے اجزاء مل کر ہی کمپیوٹراور روبوٹ وغیرہ بناتے ہیں جو مذکورہ کسی بھی ایک جز کی کمی سے ناقابل استعمال ہوگا۔اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ اس تعمیر میں سوفٹ ویئر ایک ایسا عنصر ہے جو تجریدی یعنی نظرنہ آنیوالا ہے۔کاغذپر لکھے یاکی بورڈ سے کمپیوٹر کے دماغ میں ہدایات کا مجموعہ فیڈ کرنے کے باوجود ہم سوفٹ ویئر کا طبعی ادراک نہیں کر سکتے۔دیکھیں جناب اگر کوئی یہ کہے کہ صرف ہارڈویئر میں کرنٹ گزارنے سے کمپیوٹر چل پڑاتو کوئی یقین نہیں کرے گا کیونکہ ہمارامشاہدہ یہی ہے کہ سوفٹ ویئر کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔نرم ہدایات کا مجموعہ نظر نہیں آتا مگر کمپیوٹر کی کارکردگی ہی اس بات

کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کے اندر اس کو جگانے اور چلانے والی کوئی چیز ہے جو اور کچھ نہیں انسان کا علم ہے جو خاص ماحول میں اپنی عملی جھلک دکھاتا ہے۔

اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہوئے انسان کی صفات اور خواص کے تئیں دیگر پیچیدہ عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف روح کے تناظر میں اپنی بحث کو محدود رکھتے ہیں۔ تعمیری عمل کی مذکورہ مثلّث کے حوالے سے اب انسان کی اندرونی ساخت کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں کہ گوشت پوست کا یہ ''سپر حیاتیاتی روبوٹ'' بھی کسی سہ فریقی تنظیم میں جکڑا تو نہیں؟ انسان میں بظاہر تو ہارڈ ویئر (جسم) اور قوّت (سانس و غذا سے حاصل توانائی) تو سامنے ہیں لیکن کسی تیسرے رکن یعنی کسی سوفٹ ویئر یا سسٹم کا ہمیں ادراک نہیں جبکہ اس کا ہونا عملی و سائنسی ضرورت ہے۔

آیئے دیکھیں کہ لامذہب سائنس انسان کے زندہ اور فعّال رہنے کی کیا علمی توجیہہ پیش کرتی ہے۔

''ہر خلیے میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ ایندھن کو قابل استعمال توانائی میں تبدیل کر سکے، اس لیے خلیات نہ صرف زندہ چیزوں کو بناتے ہیں بلکہ خود بھی زندہ ہوتے ہیں''

سائنس سیل یا خلیے کو حیات کی بنیادی اکائی کہتی ہے۔ واضح ہو کہ انسانی جسم سینتیس 37 سے لیکر ستّر 70 کھرب سیل یا خلیات سے تعمیر ہوتا ہے جس کا سائنسی تخمینہ انسان کے وزن اور حجم سے کیا جاتا ہے۔ خلیات میں میٹابولزم یا غذا کا جزو بدن ہونے کا عمل ہی ہمیں زندہ رکھتا ہے۔ یہ مختلف کیمیکل ری ایکشن کا مجموعہ ہے جو سوچنے، بڑھنے، چلنے پھرنے، بات کرنے، نسل بڑھانے، سانس لینے غرض ہر عمل میں انسان کا مددگار

ہوتا ہے۔یعنی خلیات سے جسم بنااور ہر خلیہ توانائی پیدا کرنے کا کارخانہ ہے جو انسان کو تمام کاموں کے لیئے مسلسل توانائی فراہم کرتا ہے۔اب اس عمل کو ذرا وضاحت سے دیکھتے ہیں کہ انسان کیسے زندہ رہتا ہے۔

انسان میں زندہ رہنے کے لیے ایک زیادہ ترقّی یافتہ نیم خودکار نظام بہت منظّم سطح پر رو بہ عمل ہے جس میں انرجی کے لیے ایندھن باہر سے آتا ہے یعنی سانس اور غذا کے ذریعے۔ بیرونی دنیا میں انسان کی غذا خام اور تیّار دونوں حالتوں میں موجود ہوتی ہے اور انسان اپنی خواہش پر غذا کھا کر جسم کے نظام ہضم میں پہنچاتا ہے جہاں سے یہ انزائم اور ایسڈ کی کیمیا ترکیبی کے بعد کاربو ہائیڈریٹس میں تبدیل ہو کر خون کے ذریعے سیل میں پہنچتی ہے جہاں اس کو توانائی میں تبدیل کیا جاتا ہے اور اس توانائی سے انسان اپنے کام کرتے ہیں۔خون کی گردش ایندھن کی متحرّک سیّال کارگو cargo بیلٹ ہے جو ایندھن سے لدی جسم میں گردش کرتی ہے۔ مختلف اسٹیشنوں پر ایندھن اتارا جاتا ہے اور استعمال شدہ ایندھن کا فضلہ اُٹھایا جاتا ہے۔اب سوال یہی ہے کہ:

کیا توانائی کی فراہمی بغیر کسی ہدایات اور کمانڈ اینڈ کنڑول سسٹم کے ہو سکتی ہے؟

اور اسی تناظر میں کیا انسان کے تمام اندرونی سسٹم کوئی مرکزی کنڑول نہیں رکھتے جو غذائی توانائی کو مربوط طور پر کام میں لائے یعنی فیصلہ کرے کہ:

غذا سے حاصل کل توانائی کا استعمال کس عضو میں کس مقدار سے صرف ہونا ہے

یہاں سوال یہ بھی ہے کہ یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ کس جگہ کتنے ایندھن کی ضرورت ہے؟ یہ سوال اس لیے اُٹھا کہ تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں محض تین پاؤنڈ کا دماغ کل انرجی کا بیس فیصد استعمال میں لیتا

ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ نہ خلیات خود کر سکتے ہیں اور نہ دماغ, اسی طرح انسان کے اندر مختلف انتہائی پیچیدہ نظام مختلف اعضاء میں انسان کی پیدائش کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن جدید سائنس لاعلم ہے کہ کہ یہ تمام نظام کہاں سے کنٹرول ہوتے ہیں یا کہاں سے احکام لیتے ہیں۔ یعنی دل، گردے ، پھیپھڑے اور دیگر حواسی اعضاء اپنے اپنے کام کی ہدایات کہاں سے لیتے ہیں؟

ہمیں اسی کمانڈ اینڈ کنٹرول کے کسی نظم کو انسان کے جسم میں تلاش کرنا ہے جو اندرونی عضوء اور عضلاتی نظام کو انسان کے ارادے کے بغیر رواں رکھتا ہے۔

اس بارے میں انسان سے مشابہ روبوٹ humanoid-robot انسان کے اندرونی غیر مرئی سسٹم کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں کیونکہ یہ مصنوعی ذہانت کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ ان کی نظیر لینے کی ایک ٹھوس وجہ یہ ہے کہ ورلڈ روبوٹک ساکر فیڈریشن نے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ سال 2050 تک وہ روبوٹ کی ایسی فٹبال ٹیم تیّار کر لیں گے جو ورلڈ چیمپین ٹیم کو ہرانے کی صلاحیت کی حامل ہو گی! یعنی انسان کے مقابل مصنوعی انسان!

مصنوعی ذہانت کی کارکردگی کی ایک مثال یہ ہے کہ 1997 میں IBM کمپیوٹر Deep-Blue نے شطرنج کے عالمی چیمپین گیری کسپاروو کو شطرنج میں شکست دی تھی جس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی بنائی ذہانت فی الوقت کم از کم کسی ایک شعبے جیسے کھیل میں انسان کو زیر کرنے کی صلاحیت کی حامل ہو سکتی ہے۔

ہیومنائڈ روبوٹ انسان کا تیّار کنندہ مشینی انسان ہے جس کی تیّاری میں الیکٹریکل، میکینیکل، کمپیوٹر، ٹیلی کمنیو کیشن اور کچھ دوسری انجینیئر نگ کو سموئے ہوئے علم میکاٹرونکس mechatronics سے مدد لی جاتی ہے۔اس کا اندرونی نظام بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ یہ روبوٹ مصنوعی ذہانت کا حامل ہونے کی وجہ سے فیصلہ کرنے کی محدود قوّت بھی رکھتا ہے۔ یہ حواس جیسی صلاحیّت اور محدود پیمانے پر انسانوں کی طرح چل پھر کر بہت سے کام کرنے کی صفت بھی رکھتا ہے۔اس کی تعمیر وساخت میں بھی مذکورہ تعمیری تکون نظر آتی ہے یعنی ہارڈ ویئر، سوفٹ ویئر اور انرجی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں سوفٹ ویئر وہ کمانڈ اینڈ کنٹرولنگ مینیجر ہے جس کے ذریعے پروگرامر روبوٹ کے جسم کے ہر حصّے کی کارکردگی کی حدود اور ضروری قواعد کو معیّن کرتا ہے۔ اس کے اندر ایسے ٹرانزسٹر اور مزاحمتی آلات ہوتے ہیں جو اس میں دوڑتے کرنٹ کی مقدار کو مختلف نتائج کے لیے کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہاں غور طلب یہ نکتہ ہے کہ جب ایک مشینی انسان جس کا ہر چھوٹا بڑا جز بغیر الیکٹرانک ہدایات کے کام نہیں کر سکتا تو انسان بغیر کسی سُپر پروگرام کے کس طرح زندہ اور متحرّک ہو سکتا ہے؟ کیا انسان کائنات میں ظاہر ہونے والے مظاہر میں کوئی منفرد مقام رکھتا ہے؟ مگر کیوں؟

دوستو!

الحادی فلسفے کا اصرار ہے کہ کائنات خود بنی اور معیّن قوانین پر چل رہی ہے جو ناقابل تبدیل ہیں یعنی اس کے قوانین اٹل ہونگے اور ان میں یکسانیت ہوگی۔اس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ کائنات ایک بے جان مظہر ہے جس میں شعور، عقل وحواس نہیں دوسرا یہ کہ اس نظریہ کے بموجب اگر تخلیقی اور تعمیری اصول و قوانین بھی کائنات کے ساتھ اچانک ظاہر ہوگئے تو وہ بھی فطرت کا حصّہ ہوگئے اور کائنات میں بننے والی یا ظاہر

ہونے والی ہر چیز اِن ہی معیّن اصولوں پر ہی بنے گی۔ وضاحت یہ ہے کہ فطرت کی کوئی آنکھ، دماغ یا شعور نہیں کہ وہ ایک ہی طرح کے نتائج دینے والی تعمیر یا تخریب کے لیئے مختلف قوانین ترتیب دے۔ ایک جیسی سرشت رکھنے والے مظاہر یا چیزیں ایک ہی اصول پر پیدا ہونگی۔ ایک جیسی ساخت یا ایک جیسی صلاحیت کے حامل ایک جیسے تخلیقی عمل یا تعمیر کا نتیجہ ہونگے مثلاً دیکھنے، سننے، چلنے پھرنے اور غور و فکر کے بعد فیصلہ کرنے کی صلاحیت ایک ہی طرح کے فطری نظم میں ہی جنم لے گی، اگر ایسا نہیں ہو گا تو کائنات کا وجود اچانک تخلیق spontaneous-creation نہیں بلکہ ذہین تخلیق intelligent-creation ہو گا جو سائنس فی الوقت نہیں مانتی کیونکہ اس کا ماننا الحادی فکر کی شکست ہو گی۔

ان استدلال سے یہاں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کائنات خود بنی اور خود چل رہی ہے تو یہ یکساں لاگو ہونے والے طبعی قوانین کے تحت ہی چلے گی لیکن ایسی صورت میں انسان بھی اِس تعمیری تکون کے فطری قفل سے مبرّا نہیں ہو سکتا ہے کہ:

جہاں حرکت پذیر چیز کی تعمیر ہو گی وہاں تین عوامل، مادّہ، توانائی اور ٹیکنالوجی (علم) لازم ہونگے

لہٰذا الحادی سائنس اور جدید فکر کے بموجب اس ضمن میں انسان کو استثنیٰ ملنے کا کوئی عقلی جواز نہیں بنتا۔ ہیومنائڈ روبوٹ کیونکہ ایک انسان کی طرح سوچتا اور عمل کرتا مظہر ہے اس لیے انسان کے اندر بھی وہی سسٹم ہونا فطری ہو گا جو روبوٹ میں انسان نے تخلیق کیا۔ یہاں ہم پھر یہی زور دیتے ہیں کہ جیسا کہ ہم نے جانا کہ خود فطرت شعور سے نابلد ہے اس لیے فطرت میں حیات اور مصنوعی حیات کے لیے جدا اصول نہیں ہونگے۔ اگر تقریباً ہر حیوانی زندگی شعور، حواس، ارادے اور عمل کے رنگ لیئے ہو گی تو یہی "باشعور

حیات ''کی بقا کا فطری قانون ہو گا اور اس کے بموجب ہر مصنوعی باشعور حیات بھی ایسے ہی معیّن پیرایوں میں عمل انگیز ہو گی۔ دیکھیے زندہ رہنے کے لیے انسان و حیوان کے اندر مطلوب توانائی خاص راستوں یعنی شریانوں میں سفر کرتی ہے تو اسی اصول پر روبوٹ کے جسم میں بھی الیکٹرک باریک تاروں میں دوڑتی ہے! اسی طرح انسان کی ساخت میں اگر کوئی طرح کی سپر انجینئرنگ ہے تو روبوٹ میں بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔

خودکار ردّ عمل Reflex-action:

انسان کا ہر عمل شعور اور حواس کے بموجب تکمیل پاتا ہے لیکن انسان کے اندر بے اختیاری ردّ عمل reflex-action کا خودکار نظم ایک ایسا متوازی اندرونی نظام ہے جو انسانی شعوری اور حواسی ردّ عمل سے قبل محدود پیمانے پر انسان کی فوری حفاظت کرتا ہے۔ کسی خطرے کی صورت میں اچانک حفاظتی ردّ عمل بغیر کسی سسٹم کے نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں دماغ کے بجائے ریڑھ کی ہڈّی کے مہرے سے ایک اضطراری قوس reflex-arc عضلات کو فوری ردّ عمل پر اکساتی ہے۔ اس لیے انسان میں شعور سے اوپر کسی بہت ترقّی یافتہ نظم کی موجودگی سے انکار عقل کے تقاضوں کے منافی ہو گا۔ ابھی ہم نے روبوٹ میں دیکھا کہ ایک سوفٹ ویئر پروگرام ہے جو غیر مرئی ہوتے ہوئے روبوٹ کے سارے سسٹم کو کنڑول کرتا ہے، تو پھر انسان کے اندر ایسا کیا ہے یا ہو سکتا ہے جو تعمیری یا تخلیقی تکون کے نظم میں سوفٹ ویئر کی جگہ لے سکے؟ نتیجہ یہی اخذ ہوتا ہے کہ انسانی جسم کے فعّال ہونے میں انسان کے اندر کسی انجانے کنڑولنگ مظہر کا ہونا عین فطری اور سائنسی ضرورت ہے۔ اسی لیے یہ سوال اہم ہیں کہ:

انسان کا اپنا اندرونی مینیجنگ اینڈ کنڑول سسٹم کہاں ہے، کیا ہے؟

یہی وہ دوراہا ہے جہاں زندگی اور روح کے حوالے سے مذہب اور لادینیت کا علمی و عقلی ٹکراو ہے۔

روح کے لیے آئن اسٹائن نے کہا: کیونکہ ہمارے اندرونی تجربات ہمارے حواس کے مجموعی تاثرات کا حاصل ہوتے ہیں اس لیے جسم کے بغیر روح کا تصوّر لایعنی نظر آتا ہے۔

یعنی اگر جسم نہیں تو روح نہیں!

سائنس روح کے الگ تشخّص کو مسترد کر کے ہی نہ صرف انسانی زندگی بلکہ مختلف حیاتیاتی صفات جیسے شعور وجذبات کی تشریح سے قاصر رہی جبکہ یہاں پر مذہب ایک عقلی نقطہ نظر کا حامل ہوتے ہوئے سائنس پر غلبہ دکھاتا ہے۔ مذہب عقلی اور منطقی وضاحت دیتا ہے کہ انسان کے اندر اس کے جسمانی نظام کو چلانے والی ایک انجانی شئے ہے جو روح ہے یعنی یہ کسی سپر سائنس کی سپر ٹیکنالوجی ہے جس کے فنکشن کو انسان جان تو نہیں پایا مگر یہی انسان کی زندگی اور موت کا ذریعہ ہے۔ جس طرح کسی کمپیوٹر میں اس کا آپریٹنگ سسٹم جیسے ونڈوز اَن انسٹال کر دی جائے تو وہ مردہ ہو جاتا ہے اسی طرح اگر روح جسم سے الگ ہو جائے تو انسان مردہ ہو جاتا ہے۔ یعنی روح کا ہونا فطری اور سائنسی ضرورت بھی ہے ورنہ انسان کے اندر موجود کئی اَسرار کی وضاحت ممکن نہیں۔ اب اگر سائنس مذکورہ بالا اندرونی عوامل کو چکرا دینے والے معمّے کہہ کر ان کی توجیہہ سے دست کش ہوتی ہے تو ہم ان کو مذہب کی تشریح پر ہی جانچیں گے۔

لٰہذا اب ہم قرآن کے حوالے سے بات کرتے ہیں جس میں خالق روح کے حوالے سے مخاطب ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

قرآن۔بنی اسرائیل: ۸۵

اور یہ لوگ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کا حکم ہے اور جو تمہیں علم دیا گیا ہے وہ بس تھوڑا سا ہی علم ہے۔(آسان ترجمہ قرآن)

ربّ کائنات واضح کرتا ہے کہ روح کا علم انسان کو کم دیا گیا، یہ اعلان دائمی بھی ہو سکتا ہے اور وقتی بھی کیونکہ یہ نہیں کہا گیا کہ روح کا علم نہیں دیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ محدود علم مل بھی سکتا ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں انسان اپنے جسم میں موجود کسی اچھوتے مظہر کی اتنی جانکاری حاصل کر لے کہ وہ کس طرح انسان کے اندر مختلف نظام ہائے اعضاء کو کنٹرول کرتا ہے اور اندرونی معموں یعنی شعور، جذبات، نیند، خیالات وغیرہ وغیرہ کی آفرینش کا ذمہ دار بھی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ وقت یقیناً انسان کو ان نشانیوں کے قریب کر دے گا کہ جس کا وعدہ قرآن میں کیا گیا ہے کہ انسان کو اس کے اندر اور کائنات میں ایسی نشانیاں دکھادی جائیں گی کہ وہ کہہ اٹھے گا کہ یہ ہی سچ ہے۔

قرآن: حٰمٓ السجدہ: ۵۳

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۵۳ اَلَآ اِنَّهُمْ
فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۵۴

"انہیں اپنی نشانیاں کائنات میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کے اپنے وجود میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ یہی حق ہے، کیا تمہارے ربّ کی یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا گواہ ہے

؟ یاد رکھو کہ یہ لوگ اپنے ربّ کا سامنا کرنے کے معاملے میں شک میں پڑے ہیں۔ یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو احاطے میں لئے ہوئے ہے" (آسان ترجمہ قرآن تقی عثمانی)

ان نشانیوں کا ہمیں پتہ نہیں لیکن قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بہت سے کائناتی معموں اور مذکورہ بالا اسرار کی (جن کا جواز آج کے سائنسدان ڈھونڈنے سے قاصر ہیں) حقیقت کا پتہ چلنا ہی اللہ کے عرفان کی طبعی اور علمی آگاہی کے دروازے کھولے گا۔ بادی النظر میں روح ہی کوئی سپر سوفٹ ویئر یا اس جیسا مظہر ہے جو انسان اور اس میں موجود بہت سے غیر حل شدہ معموں کے حل فراہم کرتا ہے۔، یعنی انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے، روح وہ جوڑنے والا مظہر ہے جو انسانی جسم اور توانائی کو اس طرح یکجا کیے رکھتا ہے کہ انسان ایک ذی نفس کی طرح چلتا پھرتا، دیکھتا سنتا، ہنستا روتا، سوچتا فکر کرتا اور بڑھتا ہے۔ ہمارے دماغ میں اس کی سرائیت ہی سے شعور، خیالات اور جذبات جنم لیتے ہیں۔ یہ کنٹرولنگ سسٹم انسان پر نیند طاری کرتا ہے اور خواب بھی۔ دیکھیں جناب درخت بھی ایک زندگی ہے جس کی شاخیں بے ترتیب بڑھتی ہیں لیکن انسان کے دو ہاتھ اور دو پیر بالکل ایک طرح بڑھتے ہیں، ان کے بڑھنے کو کیا کہیں سے کنٹرول نہیں کیا جاتا؟ انسانی اعضاء جیسے دل، دماغ، گردے، جگر وغیرہ مختلف کام کا قرینہ کہاں سے سیکھتے ہیں؟ روح عین اسی طرح انسان کے اندر سرائیت رکھتی ہے جیسے ہیومنائڈ روبوٹ میں اس کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سوفٹ ویئر۔ گویا روح ایسا انجانا مظہر یا اجنبی سپر سوفٹ ویئر ہے جو ان گنت ڈائمنشن رکھتے ہوئے پورے انسانی جسم میں سرائیت رکھتا ہے اور جسم کے ہر حصّے اور عضوء کی کارکردگی کے حوالے سے نہ صرف کمانڈ رکھتا ہے بلکہ اس کے توانائی کے نظام کو کنٹرول کرتا ہے۔ انسانی حیات کے قائم رہنے میں غذا کا بدن کا جز بننا ہی بنیادی عنصر ہے اور بظاہر یہی میٹابولزم یا توانائی کا پیداواری عمل روح اور جسم کو جوڑے رکھتا ہے۔ بُڑھاپے میں عمر کے

ساتھ انسان کا میٹابولزم کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے، سیل زیادہ تیزی سے مرنے یا فنا ہونے لگتے اور جب سیل مردہ ہونے سے میٹابولزم کا عمل رک جاتا ہے تو روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے۔ یعنی روح، جسم اور طاقت تینوں مثلّث کی دیواروں کی طرح ایک دوسرے کو تھامے حیات کا تانا بانا جوڑے رکھتے ہیں۔

روح زندگی کی وہ غیر مرئی کڑی ہے جو بہت سے معموں کو حل کرنے والی چابی رکھتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنوعی ذہانت کا حامل روبوٹ بھی نہیں جانتا کہ کس سسٹم یا سوفٹ ویئر کی وجہ سے وہ کام کرتا ہے یعنی وہ بھی لاعلمی کے ایک بھنور میں ہوتا ہے الّا یہ کہ اس کا خالق انسان ہی اس پر کچھ ظاہر کرنا چاہے۔ یہاں خالق کی اپنی علمی صلاحیت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنے ہونے کا احساس اپنی تخلیق میں ودیعت کر سکے! سائنس ابھی تک روح کی موجودگی کو مادّی پیرایوں میں ڈھونڈ نہیں پائی لیکن سائنس کی وقتی ناکامی کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم انسان میں موجود کسی سپر سائنسی مظہر کا انکار کریں بلکہ سائنسدانوں کو اس کی کوئی نہ کوئی مناسب منطقی تشریح تو کرنی پڑیگی کیونکہ روح ہی حیات کے پزل کا گمشدہ رکن ہے جس کو قبول کرنے سے جسم کے نظام کی سائنسی تشریح آسانی سے ہو سکتی ہے۔

☆انسان کیا ہے؟

روح ہی انسان کی شخصیت ہے جو جسم کے ذریعے خود کو عیاں کرتی ہے۔ روح اور جسم کا آمیزہ ہی انسان ہے۔ انسان کے جسم کو موت ہے لیکن روح یعنی شخصیت کو موت نہیں۔ روح ہی وہ انجانا مقناطیس بھی ہو سکتا ہے جو انسان کے اعمال کا کوئی عکس اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے اور انسان کی موت کے ساتھ تمام اعمال کے ڈیٹا بینک کا ایک بیک اپ لیکر خالق کی طرف روانہ ہوتا ہے جو وہاں پر کسی رجسٹر میں درج ہمارے

اعمال سے قیامت میں منطبق ہوگا کہ انسان اس کو جھٹلا نہیں پائے گا۔جب انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو روح کو جسم ملے گا، وہی پرانا یا نیا اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ سوفٹ ڈیٹا جس مشین میں بھی انسٹال کیا جائے وہ اپنے ہی رنگ لیے ظاہر ہوگا۔ مزید یہ کہ غالباً روح میں محفوظ یہ ہمارے اعمال کی یادداشت ہی ہوگی کہ ہر عضوء خود انسان کی بداعمالیوں کی گواہی دے گا۔یعنی روح کے سوفٹ ویئر میں پنہاں کوئی خفیہ کمانڈ کوڈ جو قیامت میں ایکٹیو ہوکر اعضاء کے اعصاب کو گویائی کی قوّت بھی دے دیں گے۔ گویا یہ بھی کبھی ثابت ہونا بعید از قیاس نہیں کہ خلیات حواس بھی رکھتے ہیں!۔۔تو مشتری ہوشیار باش!

اس بحث سے منطقی، علمی، مشاہداتی اور عقلی طور پر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانی جسم کے متعدّد اندرونی پیچیدہ نظم کی سائنسی وضاحت کی غیر موجودگی میں مذہب کا روح کی بابت بیانیہ ٹھوس عقلی بنیاد رکھتا ہے۔ شعور، خیال، جذبات، نیند، خواب اور دوسرے عوامل جیسے اعضاء کی کارکردگی روح سے منسلک مظاہر ہیں جن کی موجودگی اور ابھرنے کی بابت انسان اسی وقت جان پائے گا جب روح کے پیرایوں کو جان لے گا۔ایک بائیولوجسٹ فی الوقت یہ سمجھنے سے قاصر ہوگا کہ فزکس اور روحانیت کا ملاپ بھلا کیسے ممکن ہے اسی طرح ایک مذہبی فکر والا بھی خلجان میں مبتلا ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کو جدا کرکے انسان دو گروہوں میں نہ صرف مذہبی و غیر مذہبی طور پر بٹا بلکہ علمی طور پر بھی تقسیم ہوا جو غیر فطری تھا۔اس طویل رقابت نے طبعیات اور مابعد الطبعیات کے ایک فطری تعلق کو بظاہر غیر فطری بنایا اور خاص طور پر سائنسی ذہن کو ایک خاص فریم آف مائنڈ کا اسیر کر دیا جس میں احساس برتری کا غلبہ ہوا جبکہ مذہبی فکر بھی ایک دائرے میں محبوس ہوگئی۔ دیکھیں جناب انسان تو ایک ہستی ہے جس کی ساخت کئی پہلو رکھتی ہے تو پھر اس ہستی کے پہلوؤں سے منسلک اعمال اور علم جدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ ہماری کوتاہ نظری تھی جس نے مختلف

وجوہات کی بنا پر علم کے راستے کو تقسیم کر دیا۔ انسان ایک ہستی ہے اور اس سے منسلک تمام علوم کا آپس میں ہم آہنگ ہونا عین فطری اور منطقی ہے۔ لہٰذا یہ گمان کہ طبعیاتی اور مابعد الطبعیاتی علوم کسی مرحلے پر ہم آہنگ ہو جائیں گے نہ صرف عقلی، منطقی، فطری بلکہ علمی سہارے رکھتا ہے۔

انسان یہ جان لے کہ ضروری نہیں کہ زندگی ویسی ہی اشکال میں ہو جیسی ہم جانتے ہیں۔

اس بات کو ایک بڑے کینوس یعنی کائنات پر لاگو کریں تو یہ کائنات بھی ایک زندہ'' شئے''کا رنگ لیے ہے۔ کائنات ہر لمحہ کسی ترتیب پر پھیل رہی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں پس پردہ کوئی ارادہ ہے۔ کائنات بھی بے حساب حرکت کرتے سسٹم اور اجسام کو لیے کہیں چلی جا رہی ہے تو بغیر کسی توانائی کے نہیں بلکہ انسان نے جب کھوج لگایا تو چار قوّتوں سے واقف ہوا جو اس نظام کے چلانے کی ذمہ دار ہیں۔ یہ قوّتیں (ثقل، مقناطیسی اور کمزور و طاقتور ایٹمی) گویا اس کائنات کی روح ہیں لیکن کیا کوئی جان پایا یہ توانائیاں آ کہاں سے رہی ہیں، ؟ یعنی ہماری تعمیری مثلّث میں کائناتی نظام کی مکمل تشریح اسی وقت ممکن ہو گی جب ہمیں اس علم یا ٹیکنالوجی کا بھی پتہ ہو جو ان قوّتوں کو جنم دے رہا ہے اور ان سے کام لے رہا ہے۔ سائنس نے کائنات کو جاری و ساری رکھنے والے مگر حواس سے ماورا خفیہ سسٹم ڈھونڈ نکالے تو اس کی بنیاد انسان کا تجسّس تھا جو عقل کے تیئں حواس کی سرحدوں کو عبور کر کے اِن غیر مرئی اشیاء تک جا پہنچا۔ اسی طرح جس دن انسان روح کی طرف متوجّہ ہوا تو اس کے بھی کچھ پیرائے ڈھونڈ سکتا ہے۔

اب تک کی بحث ہمارے مفروضے کی جانچ کے لیے مناسب شواہد کی نشاندہی کرتی ہے جو روح کے موجود ہونے کی دلیل بنتے ہیں۔ امید افزا بات یہی ہے کہ سچّائی اپنے آپ کو منواتی ہے۔ وہ وقت اہم موڑ ہو گا جب

جنّیاتی سائنس انسانی جِین میں چھپے ایسے کوڈ دریافت کرلے جو مابعد الطبعیاتی وصف رکھتے ہوں اور روحانیت سے کسی طبعی رابطے کی اساس بنیں۔ اُس سسٹم کی سائنسی توجیہہ یا تشریح ہی نہ صرف انسانی جسم کے کسی خفیہ نظم کی نشاندہی کرپائے گی بلکہ کائنات کے کسی بڑے راز کو آشکارہ بھی کرجائے گی۔ غالباً یہی وہ دریافت ہوسکتی ہے جو سائنسدانوں کو حقیقت کبریٰ کی کسی پیمانے پر ایسی سمجھ دیدے کہ ان کے پاس الحاد کو خیر باد کہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے۔ لہٰذا ہم انتظار کرتے ہیں اس وقت کا کہ جب انسان حیات اور اپنے آپ میں موجود معموں کے منبع کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے روح کی کسی انجانی اور نیم طبعی ڈائمنشن کے دروازے پر دستک دے اور وہ کھل جائے۔

قرآن۔ سورۃ الانبیاء: آیت ۳۷

خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ‌ؕ سَاُورِيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ‏

)ترجمہ: انسان جلد بازی کی خصلت لے کر پیدا ہوا ہے۔ میں عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھلادونگا، لہٰذا تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ۔(

)مجیب الحق حقی(

10

روح یا کیمیائی تعاملات

یہ بات درست ہے کہ تمام تر جذباتی کیفیات جسم میں موجود رطوبتوں کے نظام کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ خوشی، غم، غصہ، خوف، یہ سب کیمیائی تعاملات ہیں۔ لیکن کیا ''سرشاری''، ''استغنا''، ''اُنس''، ''بے نیازی''، ''سخاوت'' بھی کیمیائی تعامل کے ذریعے پیدا ہونے والی کیفیات ہیں؟ کیا غریب کی مدد کرنے، دیانتداری سے کام کرنے کے بعد جو سکون ملتا ہے وہ بھی خون میں پیدا ہونے والا کیمیکل ری ایکشن ہے؟ یقیناً نہیں۔ ہم انسانی کیفیات کی بعض منفرد شکلوں کو فقط کیمیائی تعامل، مادے کا ایک شکل سے دوسری شکل میں ارتقا کہہ کر جان نہیں چھڑا سکتے۔ ایک دفعہ ایک بحث میں ایک دوست نے یہ سوال پوچھا تھا کہ کیا انسانی ذہن اور شعور حیاتیاتی دماغ ہی ہے یا حیاتیاتی دماغ سے خارج میں کوئی چیز ہے؟ اگر حیاتیاتی دماغ سے باہر کسی چیز کو تسلیم کر لیں تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان میں کوئی غیر مادی چیز ضرور ہے جس کی بنیاد پر آپ کو کہیں نہ کہیں جا کر انسانوں کے خالق کو ماننا ہی پڑے گا۔

اگر کوئی یہ مانے کہ انسانی شعور اور ذہن حیاتیاتی دماغ ہی ہے تو پھر یہاں پر ایک الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔اس طرح تو یہ ماننا پڑے گا کہ عقل، منطق، حسن، قبح، گنتی، حساب، استخراج، احساس، معانی، جذبے، صحیح، غلط، اخلاقیات سب کچھ غیر معروضی اور ضمنی ظاہرے (فنامنا) ہیں۔اور یہ سب کچھ ارتقاء کے نتیجے میں ہی وجود میں آئے۔ ہم کو اس کائنات میں جو نظم اور پیٹرن نظر آتا ہے دراصل وہ ہے نہیں بلکہ ہمارا دماغ کچھ اس طرح سے ارتقاء پذیر ہوا ہے جس کی وجہ سے ہمیں وہ پیٹرن لگ رہا ہے۔ تمام سائنسی نظریات اور نتائج ہمارے حیاتیاتی دماغ کی اختراع ہے جو کہ کسی مجبوری کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ ہمیں جو چیز صحیح لگ رہی ہے وہ اس لئے لگ رہی ہے کیوں کہ ہمارے دماغ نے نشوئنما ہی ایسی پائی کہ وہ ہمیں صحیح لگے۔ ہمیں دو اور دو چار اس لئے لگ رہے ہیں کیوں کہ ہمارے دماغ کا ارتقاء اس طرح سے ہوا ہے کہ ہمیں ایسا لگے۔ ہمیں جو چیزیں منطقی اور معقول لگ رہی ہیں اس کا عقل اور منطق سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ عقل اور منطق سرے سے کوئی چیز نہیں ہے۔ نیچرل سیلیکشن اور تنازع للبقا کی نتیجے میں ہمارے دماغ نے ایسا محسوس کرنا شروع کیا۔اگر ہمارا دماغ کسی اور طریقے سے ارتقاء پذیر ہوا ہوتا تو ہم یہ سب کچھ محسوس نہ کرتے بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کا بالکل الٹا محسوس کر رہے ہوتے اور منطقی طور پر سوچنا ہی ناقابل قبول قرار دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ کائنات میں کہیں دور کوئی مخلوق کسی اور پیٹرن پر ارتقاء پذیر ہوئی ہو جس کی ذہانت، عقل، حسن، صحت سب کچھ یہاں سے مختلف ہو۔اس صورت میں اگر کوئی یہ کہے کہ سچ کہنا اچھا ہے، حیات وجودیت کے اعتبار سے موت سے اعلی ہے، بقا کی کوشش فطری ہے، باتوں میں تناقض نہیں ہونا چاہئے تو یہ سب باتیں اتفاقیات کے نتیجے میں آنے والی کوئی چیز ہے۔ ورنہ ان باتوں کی کوئی معروضی حقیقت نہیں ہونی چاہئے۔

اگر ایسا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس عقل سے جو کہ قطعی طور پر غیر معروضی ہے خدا کا اثبات یا انکار کرنے پر کیوں مصر ہیں؟ جو انسانی حیاتیاتی دماغ سے باہر کسی انٹیلی جنس کو نہیں مانتا وہ یہ کیوں اس حیاتیاتی عقل سے ایک غیر بایولوجیکل وجود کی تصدیق کرنے یا تردید کرنے کا کی استعداد کا دعوی کر سکتا ہے؟!!!

اب اس سے بھی ایک اور بڑی الجھن ہے۔ ہم نے ارتقاء کو بھی اسی غیر معروضی عقل سے سمجھا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس کو یہ ارتقاء اتنا منطقی لگتا ہے وہ سچ مچ ہے بھی یا ایسے ہی ہمارا دماغ محسوس کر رہا ہے۔!!!!

انسانی حیاتیات سے باہر کسی انٹیلی جنس سے انکار کرنے کی صورت میں سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔ ہمارے مشاہدات، ہماری سوچ، ہمارے احساسات، ہماری منطق ہر چیز کی عمارت ڈھ جاتی ہے۔۔ارتقاء کو ماننے کی صورت میں ارتقاء کا غلط ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔۔ میں اپنے ذہن کو استعمال کر کے کہہ سکتا ہوں کہ عقیدہ ارتقاء میں ایک عقلی تناقض موجود ہے۔اس لئے کسی بیرونی انٹیلی جنس کے بغیر ارتقاء کا عقیدہ سو فیصد غلط ہے

اگر یہ سب انسانی، ارادہ، روح، شعور کچھ بھی نہیں سب طبعی قوانین و کیمیائی تعاملات ہی ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ ہم اپنے عمل میں کتنا آزاد ہیں؟ اسٹیون ہاکنگ نے دی گرینڈ ڈیزائن میں لکھا: ''یہ تصّور بہت دشوار ہے کہ ہماری مرضی کس طرح آزادنہ طور پر کام کر سکتی ہے جبکہ ہمارے رویّے طبعی قانون سے ہی متعین ہیں۔ گویا بظاہر ہم سب حیاتی روبوٹ سے زیادہ کچھ نہیں، اور آزاد مرضی محض ایک دھوکہ ہے۔'' دوسری

جگہ اسکی مزید وضاحت بھی کر دی: " یہ نتیجہ اخذ کرنے کے باوجود کہ انسانی رویّے فطری قوانین کے طابع ہوتے ہیں، یہ بات بھی معقول لگتی ہے کہ اس کو سمجھنے کا عمل اتنا پیچیدہ اور اتنی زیادہ جہتوں پر مشتمل ہوگا کہ کوئی بھی پیشگوئی تقریباً ناممکن ہوگی، اس کے لیے انسانی جسم میں موجود ہزار کھرب کھرب خلیات thousand-trillion-trillion-molecules میں ہر ایک کی ابتدائی کیفیت کی معلومات درکار ہوں گی، پھر اتنی بڑی تعداد کی مساوات equations کو حل کرنے کے لیے چند ارب سال درکار ہوں گے"!

انسانی رویّے کے متعلق یہ پیشگوئی انسانی علم و طاقت کی کمزوری کا اعتراف ہے۔ کیا اس ادھورے علم کی بناء پر ہم الہامی توجیہات روح وغیرہ کا انکار کیا جا سکتا ہے۔؟ یہ بیان ایک عظیم تر اور ہمارے شعور کی پہنچ سے ماوراسپر سائنس کا بالواسطہ اعتراف بھی ہے۔

روح کی حقیقت کو ایک تمثیل سے واضح کرتا ہوں:

اگر میں تم سے پوچھوں اپنے آپ کو دکھاؤ تو پہلے تو تم کہو گے یہ کیا سوال ہے، تم جسم کے کسی حصے کی طرف اشارہ کرو گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو تمہارا سینہ، چہرہ یا ہاتھ ہے، تم کہاں ہو؟ تو یقیناً تم اپنے آپ کو دکھانے سے قاصر رہو گے۔ انسان در حقیقت اپنی "شخصیت" کے حوالے سے پوشیدہ یا غیبی Unseen ہے۔ ایک کار کی مثال لو فرض کرو اس کا برانڈ نام "ج" ہے۔ اگر ہم برانڈ "ج" کے تمام پارٹس کھول کر علیحدہ کر دیں تو "ج" غائب ہو جائے گی لیکن سارے پرزے موجود ہوں گے یعنی "ج" ایک غیبی تصوّر ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح ہر انسان خود ایک غیبی تصوّر کی طرح ہے۔ میں ایک شخص ہوں اور ایک نام رکھتا

ہوں جب میں کہتا ہوں کہ ''میں''تو در حقیقت ایک غیبی وجود کی حیثیت سے بات کرتا ہوں جو کہ ایک جسم کے ذریعے اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔یعنی میرا وجود جو ایک Abstract ہے،وہ غیبی وجود ''روح'' بھی کہلاتا ہے۔گویا روح ایک سوفٹ وئیر ہے اور جسم ایک ہارڈ وئیر ،دونوں مل کر ایک جیتا جاگتا ''انسان'' بناتے ہیں،روح کے سافٹ وئیر کے بغیر جسم کا کوئی حصہ کام کا نہیں رہتا۔سائنس جسم کے اندر موجود ایک ہستی یا self کو نہیں مانتی مگر زندگی کے اس اسرار سے پردہ بھی نہیں اُٹھاتی نااٹھاسکتی ہے۔سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ انسان ایٹم سے بنا لیکن ابھی تک سائنس یہ نہیں بتا پائی ہے کہ ایٹم میں زندگی کیسے آتی ہے؟اور زندگی میں شعور،جذبات اور حواس کیسے عیاں ہوتے ہیں؟ایٹم میں ایسا کیا ہے کہ زندگی،شعور اور جذبات ابھر آتے ہیں؟

روح کے متعلق جدید تھیوری روح کا کوانٹم نظریہ [Quantum consciousness or quantum soul theory]ہے۔اسکی وضاحت مختلف طریقے سے پیش کی جارہی ہے۔ایک مشہور اانگلش سائیٹ سے اقتباس پیش ہے۔امریکی ڈاکٹر سٹووارٹ ہیمراف اور برطانوی ماہر طبیعیات یا فزکس سر روجر پینروز نے انسانی ہوش وزندگی کی ایک کوانٹم تھیوری پیش کی ہے جس کے مطابق ہماری روح دماغ کے خلیوں یا سیلز میں موجود سیل یا خلیے کے ایک چھوٹے حصے یا آرگنیلی مائیکروٹیوبیولز میں ہوتی ہے۔ڈاکٹر ہیمراف کہتے ہیں:''فرض کریں کہ ہمارا دل دھڑکنا بند کر دیتا ہے،خون کا جسم میں بہاؤ رک جاتا ہے،مائیکروٹیوبیولز کی کوانٹم حالت ختم ہو جاتی ہے لیکن ان مائیکروٹیوبیولز میں موجود کوانٹم معلومات جو ان دماغی خلیوں یا نیورانز کو چلاتی ہے اور انسان کو زندہ رکھتی ہے،پھر بھی تباہ نہیں ہوتی۔یہ محض تقسیم ہوتی ہے اور کائنات میں چلی جاتی ہے(جیسا کہ مذہب کا تصور ہے کہ مرنے کے بعد روح اللہ تعالیٰ کی طرف چلی

جاتی ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ یہ کوانٹم معلومات جو دماغ اور دماغ سے زندگی کو چلاتی ہیں مرنے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتی۔ اس کے اندر انسان کی ساری زندگی کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی میں کیا کیا۔ یہ مذہب کے اس تصور کا ثبوت ہے کہ مرنے کے بعد بھی روح زندہ رہتی ہے اور انسان کے اعمال کی گواہ ہے اور اللہ کو موت کے بعد حساب دیتی ہے اور عالم برزخ میں اس سے جزا و سزا کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس طرح موت کے بعد کی زندگی کا وجود ثابت ہوتا ہے)۔ اگر انسان مرنے کے قریب ہو جائے لیکن اس کی جان بچ جائے تو زندگی چلانے والی یہ کوانٹم معلومات واپس مائیکروٹیوبیولز میں آجاتی ہے اور انسان کہتا ہے کہ میں مرنے کے بہت قریب تھا۔ اگر انسان مر جائے تو اس کی موت کے بعد جسم سے الگ یہ کوانٹم معلومات ہمیشہ روح کی صورت میں موجود رہتی ہے۔

اس حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر ہینز پیٹر ڈور، فرینکفرٹ جرمنی کے میکس ویل پلانک فزکس انسٹیٹیوٹ کے سابق سربراہ کا ایک اقتباس ایک انگلش سائیٹ پر موجود ہے۔ انکے مطابق "جو ہم اس دنیا کے بارے میں اس وقت تصور کرتے ہیں وہ صرف مادے کی سطح پر ہے جس کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے ایک لامحدود حقیقت ہے جو کہ اس مادی تصور سے بھی بڑی ہے۔ اس طرح ہمارا وجود اس دنیا کے بعد کی ایک دنیا کی قید میں ہے جس نے اس مادی وجود کو گھیر رکھا ہے۔ یہ تصور کرتے ہوئے میرا وجود اس دنیا میں دماغ کی یادداشت یا ہارڈ ویئر پر نقش ہے جس کا پھیلاؤ کوانٹم فیلڈ تک ہے۔ اس طرح میں کہہ سکتا ہوں جب میں مروں گا تو میری زندگی کی یہ کوانٹم معلومات یا روح ضائع نہیں ہوگی کیونکہ جسم مرے گا لیکن روحانی کوانٹم فیلڈ جاری رہے گا۔ اس طرح میں زندہ جاوید ہوں"۔

11

روح کا وجود

قارئین ! کسی چیز کے وجود کو نہ ماننا اور کسی چیز کے وجود کا انکار کر ڈالنا۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ ان کے محرکات بھی مختلف ہیں اور نتائج بھی۔ کسی چیز کو نہ ماننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتا بلکہ آپ کی کم علمی کی دلیل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ چیز موجود ہو مگر آپ کے علم میں نہ ہو۔ مگر کسی چیز کا انکار کر ڈالنا کم علمی کی دلیل نہیں بلکہ باقاعدہ ایک دعویٰ ہے۔ اس دعوے کے لئے ثبوت درکار ہیں۔ علم درکار ہے۔ یہ دعویٰ اگر علم کے ساتھ کیا جائے تو قابل ستائش ہے اور اگر بغیر کسی علم کے کیا جائے تو اس سے بڑی جہالت اور کوئی نہیں۔

اگر ہم دنیا کو دینی اور لادینی لوگوں میں تقسیم کریں تو لادینی لوگ مزید فرقوں میں تقسیم ہوتے نظر آئیں گے۔ جن میں قابل ذکر ہیں ملحد اور اگناسٹک۔ اگناسٹک وہ ہوتے ہیں جو خدا کو نہیں مانتے۔ مگر خدا کا انکار بھی نہیں کرتے۔ وہ صرف اپنی کم علمی اور کم فہمی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یعنی وہ علم جو خدا کے بارے میں

مذہبیوں کے پاس موجود ہے وہ اگناسٹکس کے پاس موجود نہیں۔ جیسے ہی وہ علم آجائے گا وہ بھی خدا کو مان جائیں گے۔

ملحدوں کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ خدا کا برملا انکار کرتے ہیں۔ جس کے لئے ثبوت درکار ہیں۔ یعنی ایک طرح سے ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اس کائنات اور اس کے گرد و نواح کے چپے چپے کا علم رکھتے ہیں اور اس میں خدا کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہ دعویٰ اس وقت باطل قرار پاتا ہے جب اس زمین پر موجود سمندر میں ایک نئی مچھلی دریافت ہوتی ہے۔ یعنی اس زمین پر ابھی دریافتوں کا سلسلہ جاری ہو اور کوئی اٹھ کر دعویٰ کردے کہ اس پوری کائنات میں یا اس سے باہر کہیں خدا کا وجود ممکن نہیں۔ سبحان اللہ۔

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کسی چیز کو ماننے کے لئے اس کا سائنسی اصولوں پر پورا اترنا ضروری ہو۔ سائنس انسانوں کے علم پر صرف دو طرح سے اثر انداز ہو سکتی ہے۔

پہلا یہ کہ وہ ثبوتوں اور مشاہدوں کی بنیاد پر کسی چیز کا وجود ثابت کردے۔

دوئم یہ کہ وہ ثبوتوں اور مشاہدوں کی بنیاد پر کسی چیز کے عدم وجود کو ثابت کردے۔

نہ تو کسی چیز کو بغیر ثبوتوں کے تسلیم کرنا سائنس کا دائرہ کار ہے اور نہ ہی بغیر ثبوتوں کے کسی چیز کا انکار کردینا سائنس کے لئے ممکن ہے۔

پہلا طریقہ آسان ہے۔

مثال کے طور پر میں نے مینارِ پاکستان دیکھا تو اب میرے لئے اس کا وجود ثابت کرنا بہت آسان ہے۔ میں اس کی تصاویر دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ اس کی موجودگی کی جگہ بتا سکتا ہوں۔ اس کے آس پاس موجود عمارات کو بطور ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے کئی طریقے ہیں۔ مگر اگر میں نے مینارِ پاکستان نہیں دیکھا تو بغیر ثبوتوں کے میرا یہ دعویٰ بھی باطل ہی ہو گا کہ مینارِ پاکستان کا کوئی وجود ہی ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے موجود ہو مگر میرے علم میں نہ ہو۔ اس قسم کے دعوے کے لئے ایک اور دعویٰ بھی درکار ہے کہ میں نے دنیا کی ہر چیز دیکھ رکھی ہے اور ان میں مینارِ پاکستان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ دعویٰ کرنا سائنس کے لئے بڑا مشکل کام ہے۔

میری معلومات کے مطابق سائنس ابھی تک روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔ مگر فی الوقت سائنس روح کا انکار کرنے جوگی بھی نہیں ہے۔ کیوں کے جس طرح سائنس کو اسے ماننے کے لئے ثبوت درکار ہیں اسی طرح اس کا انکار کرنے کے لئے بھی ثبوت درکار ہیں۔ یہ دعویٰ بھی بے سود ہو گا کہ ہم نے پورا جسم ٹٹول لیا روح نہیں ملی۔ کیوں کہ روح کی بابت دعویٰ ہی ایک نہ نظر آنے والے جسم کا ہے۔ یعنی جس طرح عقل کو بغیر دیکھے تسلیم کیا جا سکتا ہے اس طرح روح کو بھی مشاہدات کی بناء پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک مثال کششِ ثقل کی بھی ہے کہ جب تک دریافت نہ ہو گئی سائنس نے اس کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر اگر سائنس اس کا انکار کر ڈالتی تو جس دن نیوٹن نے قانونِ کششِ ثقل پیش کیا سائنس کو اپنا تھوکا چاٹنا پڑتا۔ لہٰذا کسی بھی ایسے وجود جس کے ہونے یا نہ ہونے کا سائنس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو اس پر سائنس کی خاموشی بہتر ہے ۔ نہ اقرار نہ انکار۔ جب تک مشاہدات سامنے نہیں آجاتے۔

اب مشاہدات کیا ہیں اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

سائنس ابھی تک اس بات کا تسلی بخش جواب دینے سے قاصر ہے کہ انسانی جسم کا وہ کون سا عضو ہے جس کے پیدا ہونے سے زندگی شروع ہوتی ہے اور جس کے ختم ہونے سے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میرے پاس ایک کمپیوٹر ہے۔ میں اس کا پلگ آن کرتا ہوں تو اس میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور جیسے ہی میں پلگ آف کرتا ہوں تو زندگی دم توڑ دیتی ہے۔ اس کا ماخذ کرنٹ ہے جو اس میں زندگی کی لہر دوڑا رہا ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچے کے تمام اعضاء شروع کے چار مہینوں میں باری باری بنتے ہیں۔ دوسرے مہینے میں دل اور دماغ کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ ہر وہ عضو جس کے نہ ہونے سے جان جا سکتی ہے وہ بن جانے کے باوجود زندگی کی لہر نہیں دوڑ رہی؟ کس کا انتظار ہے؟ کون سا کرنٹ دوڑے گا جو زندگی کا آغاز ہو گا؟ پھر چوتھے مہینے میں بچے کی حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسا عضو ہے جس کی تشکیل چوتھے مہینے میں ہوئی اور جس کی وجہ سے انسان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی؟ تو جواب ہے ایسا کوئی عضو نہیں ہے۔ چوتھے مہینے میں جن اعضاء کی تشکیل ہوتی ہے وہ سارے کے سارے بے جان۔ بال۔ ناخن اور دانت۔ ان میں سے کسی کا بھی تعلق زندگی سے نہیں۔ تو وہ کیا چیز تھی جو چوتھے مہینے میں شامل ہوئی اور جسم میں کرنٹ دوڑ گیا؟ سائنس اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

موت کے معاملے میں بھی یہی اسرار ورموز ہیں۔

ایسا ممکن ہے کہ کچھ اعضاء کا تباہ ہو جانا فوری موت کا سبب بن جائے۔ جیسے دل و دماغ۔ مگر پھر ان کی موجودگی کے باوجود موت کا واقع ہو جانا سمجھ نہیں آتا۔ یعنی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دماغ کی موت

پورے جسم کی موت کا سبب بن جاتی ہے لہٰذا دماغ ہی وہ عضو ہے جو زندگی کی لہر دوڑاتا ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ صحیح الدماغ ہونے کے باوجود کیوں مر جاتے ہیں؟ یہی معاملہ باقی اعضاء کے ساتھ بھی ہے۔ سائنس اب تک موت کی حتمی وجہ کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔

اسلام کے مطابق موت جسم سے روح نکل جانے کا نام ہے۔ یہ عمل قلیل مدتی بھی ہو سکتا ہے اور طویل مدتی بھی۔

قرآن۔ سورہ الانعام۔ آیت نمبر 60

اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے تاکہ (یہی سلسلہ جاری رکھ کر زندگی کی) معین مدت پوری کر دی جائے پھر تم (سب) کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس روز) وہ تم کو تمہارے عمل جو تم کرتے ہو (ایک ایک کر کے) بتائے گا ﴿۶۰﴾

سورہ الزمر۔ آیت 42

خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں (ان کی روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ جو لوگ فکر کرتے ہیں ان کے لئے اس میں نشانیاں ہیں ﴿۴۲﴾

پھر جب تمام ارواح تخلیق کی گئیں تو ان سے توحید کا وعدہ لیا گیا۔

سورۃ الاعراف۔آیت نمبر 172

”اور (یاد کیجئے!) جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشتوں سے ان کی نسل نکالی اور ان کو انہی کی جانوں پر گواہ بنایا (اور فرمایا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ (سب) بول اٹھے: کیوں نہیں؟ (تو ہی ہمارا رب ہے،) ہم گواہی دیتے ہیں تاکہ قیامت کے دن یہ (نہ) کہو کہ ہم اس عہد سے بے خبر تھے۔“

جس طرح روح کا انکار ممکن نہیں اس طرح روح کی صحیح توجیہ بھی ایک مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

۔

سورہ بنی اسرائیل۔آیت نمبر 85

اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کا ایک حکم ہے اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے ﴿۸۵﴾

انسان کی سمجھ بوجھ کا ماخذ سائنس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ہر علم سے واقف ہے۔ سائنس ان میں سے صرف ایک چھوٹا سا علم ہے جو انسان کو دیا گیا ہے۔

اس آیت سے ایسا لگتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ روح کے علم کا تعلق انسان کی محدود عقل سے بالاتر ہو۔

تحریر: محمدّ سلیم

12

کیا جنات حقیقت ہیں؟

کیا جنّات حقیقت ہیں؟ کیا سائنس آگ سے زندگی کی تصدیق کرتی ہے؟ جواب یہی ہو گا کہ سائنس موجودہ علوم کی روشنی میں اس کی تصدیق نہیں کرتی۔ لیکن اس موضوع پر سائنس، کامن سینس اور قرآن کے زاویوں سے طائرانہ نظر ڈالنا ایک دلچسپ امر ہو گا۔

کائنات اور اس میں زندگی کے حوالے سے سائنسی نقطۂ نظر مختصراً یہ ہے کہ کائنات ابتداء میں انتہائی گرم تھی اور آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوئی یہاں تک کہ زمین پر پانی ظاہر ہوا، پھر بہت سے کیمیائی عمل کے بعد مناسب درجۂ حرارت پر اس میں آبی زندگی شروع ہوئی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی ایسی زندگی جس کا ماٰخذ تپش اور آگ ہو تو وہ قدرتی طور پر تُرابی یا آبی زندگی سے پہلے وجود میں آئی ہو گی اور فطری طور پر ایک شعلہ فگار ماحول میں اُبھری زندگی کے پیرامیٹرز یا اس کی ساخت، شعور اور حواس خلیے میں پیدا ہونے والی کسی بھی حیات سے یا انسان سے بالکل جدا نوعیّت کے ہوں گے۔ بالفاظ دیگر دہکتے ستارے میں حرارتی توانائی سے کوئی

زندگی ظاہر ہوتی ہے تو وہ ویسے ہی لطیف خواص کی حامل ہوگی جیسا کہ توانائی! ہم اسے حرارتی حیات Thermal Life کا نام دے سکتے ہیں۔ قدرتی طور پر کسی ایسی زندگی جس کا منبع origin خلیے کے بجائے توانائی سے منسلک ہو، وہ انسان کے شعور سے ماوراء ہوگی اور اس کی تصدیق عام حواس سے ممکن نہیں ہوگی۔

سائنس تو اجنبی زندگی کے بارے میں تذبذب میں ہے لیکن آئیں اور حیرت زدہ ہو کر پڑھیں کہ ایسی حیات کی تخلیق کے حوالے سے قرآن کیا کہتا ہے! قرآن: سورۃ الحجر (۱۵) آیات ۲۶۔۲۷ وَلَقَد خَلَقنَا الِانسَانَ مِن صَلصَالٍ مِن حَمَاٍ مَسنُونٍ o وَالجَانَّ خَلَقنَاہُ مِن قَبلُ مِن نَارِ السَّمُومِ o ـــ اور ہم نے انسان کو سڑی مٹّی کے سوکھے گارے سے بنایا۔ اس سے پہلے ہم جنوں کو آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے۔ یہ اگر انسان کی تحریر ہوتی تو اس میں "قبل یا اس سے پہلے" کا حوالہ نہ ہوتا کیونکہ 1400 سال قبل کا کوئی بھی انسان حیات کی تخلیق کے مدارج اور ارتقاء کے درجوں کا سائنسی علم نہیں رکھتا تھا۔ یہاں قرآن کی یہ صراحت حیران کن ہے کہ انسان سے پہلے جنّات کی آگ سے تخلیق کی گئی جو سائنسی علوم کے مطابق حیات کے فطری ارتقاء میں منطقی درجہ ہوگا۔ یہاں انسانی پیدائش کے حوالے سے نظریۂ ارتقا کی تصدیق ہرگز مقصود نہیں بلکہ ایک عمومی پیرائے میں یہ بتانا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ قرآن انسان کی تخلیق کے حوالے سے جس مٹّی کا تذکرہ کرتا ہے وہ کائنات کے ٹھنڈا ہونے پر ہی بنی ہوگی جس میں تقریباً تمام عناصر مختلف تناسب سے موجود ہیں۔

سائنس کے مطابق عناصر elements ہی مل کر انسان بناتے ہیں جن میں آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کیلشیم، فاسفورس، پوٹیشیم، سلفر، سوڈیم، کلورین، میگنیشیم اور ان کے علاوہ کسی حد تک تمام دوسرے عناصر بہت کم تناسب میں شامل ہیں، لیکن یہ واضح رہے کہ ان عناصر کے باہمی کیمیائی

عمل سے زندگی کے ظہور میں جلنے cumbustion یا سُلگنے کا عمل شامل نہیں ہے۔ جلنا Combustion ایک کیمیکل یا کیمیائی عمل ہے جس میں عناصر کے جلنے سے روشنی اور تپش پیدا ہوتی ہے جس میں آکسیجن کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ یہاں ایک منطقی سوال ابھرتا ہے کہ جب زندگی عناصر کے باہمی ملاپ یعنی مخصوص کیمیا ترکیبی specific-chemical-actions-reactions سے پیدا ہوتی ہے تو یہ پیرایہ صرف ایک ہی کیوں ہو؟ ان ہی عناصر میں سے کچھ عناصر کا جلنے cumbustion کے کسی مخصوص عمل کے دوران حیات کو جنم دینا خارج از امکان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جلنا بھی ایک کیمیائی عمل ہے۔ جدید سائنس خلیوں میں ظاہر ہونے والی طبعی حیات کا راز نہیں جان سکی جو کہ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور ابھی تک ایک لاینحل معمّہ ہے تو وہ کس بنیاد پر کسی حرارتی حیات کو مطلق رد کر سکتی ہے جبکہ دور جدید کے مشہور ترین سائنسدان اسٹیفن ہاکنگ Stephen Hawking نے کہا کہ: ”ہمیں یقین ہے کہ زمین پہ زندگی اچانک ابھری ہے تو یقیناً اس لامحدود کائنات میں زندگی اور طرح سے بھی وقوع پذیر ہوئی ہوگی۔

" "We believe that life arose spontaneously on Earth," Hawking said at Monday's news conference, "So in an infinite universe, there must be other occurrences of life."

اور اسی یقین کی بِنا پر اس سائنسدان نے کسی ایسی مخلوق کی تلاش کے عمل میں مدد کے لیے ایک سو ملین ڈالر مختص کیے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ اس بات کا امکان بھی ہے کہ خلائی مخلوق کے مقابلے میں انسان کیڑے مکوڑوں سے بھی حقیر ہو سکتے ہیں اور وہ ہمیں اس طرح برباد کر سکتے ہیں جس طرح ہم چیونٹیوں کو۔

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید سائنسدان اجنبی حیات کو کسی نامعلوم پیرائے میں قبول کر رہے ہیں اور مان رہے ہیں کہ ہمارے مخصوص ذہنی معیار سے بہت ہٹ کر بھی ترقّی یافتہ زندگیاں ہو سکتی ہیں۔ جدید سائنسدان غیر ارضی یا خلائی حیات Extraterrestrial-life کے وجود پر گفتگو اسی لیے کرتے ہیں کہ یہ عقلی اور منطقی ہے۔ اسطرح یہ بات تو عیاں ہوئی کہ خود سائنس کے مطابق بھی زندگی کی جہتیں اور پیرائے dimensions مختلف ہو سکتے ہیں جو کہ ایک معقول بات ہے تو پھر آگ یا کسی مخفی توانائی سے پیوستہ حیات کو مسترد کرنے کا کوئی معقول عقلی جواز تو موجود نہیں ہوا سوائے اس کے کہ بیچارگی تو ہمارے علم کی ہے کہ ہم ابھی اس قابل نہیں ہوئے کہ اس کو سائنسی طور پر جان سکیں۔ جدید سائنسدان جس اجنبی مخلوق aliens کا انتظار یا اس کی تلاش کر رہے ہیں کیا عجب کہ ان میں سے کچھ ہمارے درمیان ہی ایک محدود پیرائے میں موجود ہوں اور اس وقت سے یہاں ہوں جب زمین آتشی گولہ ہو۔

ایک دردمندانہ گذارش ان لبرل اور جدید سوچ کے پروردہ دوستوں، دانشوروں اور مفکّرین سے ہے کہ جنّات وغیرہ کو دقیانوسی خیال قرار دینے کے بجائے زندگی کے حوالے سے جدید سائنسی نظریات کی روشنی میں اس کو بھی پرکھیں یا پھر اسٹیفن ہاکنگ جیسے سائنسدانوں کو بھی دقیانوسی قرار دے دیں! ہاکنگ کا کسی اجنبی مخلوق پر 'ایمان' محض طبعی علم اور تخیّل و وجدان پر مبنی ہے جس پر لوگ یقین کر رہے ہیں۔

رہا سوال یہ کہ اس کائنات میں کسی اجنبی زندگی کا مقام اور دائرہ کار کیا ہو سکتا ہے، تو جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن وضاحت کرتا ہے کہ انسان ایک برتر حیثیت کا حامل، اشرف المخلوقات اور خالق کا نائب ہے۔ کیونکہ اللہ ہر طرح کی تخلیق پر قادر ہے لہٰذا آگ سے پیدا ہونے والی زندگی بھی اللہ کی تخلیق ہے۔ لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ کوئی بھی زندگی اپنے فزیکل یا پیرا فزیکل وجود کے باوجود انسان سے کمتر ہی ہے اور

آئندہ بھی رہے گی کیونکہ فزیکل دنیا میں انسان طبعی برتری رکھتا ہے۔اس دنیا میں انسان کو خالق نے اشرف المخلوق قرار دے کر فوقیت اور غلبہ عطا کیا ہے لہٰذا جن یا کوئی بھی کائناتی یا خلائی مخلوق مافوق الفطرت خصائص کی حامل ہوتے ہوئے بھی انسان کے مقابلے میں طبعی ماحول Physical-World میں کمزور ہی رہے گی۔

تحریر مجیب الحق حقی

13

قرآن میں آسمان اور زمین کا ذکر اور جدید سائنسی اصطلاحات

اعتراض: جدید سائنس کے مطابق آسمان نام کی بھی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی، ایک خلا ہے جس میں زمین اور باقی ستارے، سیارے تیر رہے ہیں، جبکہ قرآن زمین اور آسمان کا ذکر کرتا ہے۔

قرآن اور آسمان کا مطلب:

پہلے تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن سائنسی کتاب نہیں ہے اس لئے اس کا انداز بھی سائنسی نہیں ہے۔ اس کا طرز بیان ایسا ہے کہ موجود دور کا جدید انسان بھی اس کو سمجھے اور چودہ سو سال پہلے والا ایک عام سے بدو بھی اس کو سمجھے۔ قرآن کا مقصد چونکہ سائنس سکھانا نہیں اس لئے آپ قرآن سے سائنسی انداز کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ہے کہ قرآن اگرچیکہ سائنسی کتاب نہیں ہے لیکن سادہ انداز میں جو بھی اس میں سائنسی حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہیں۔

دوسری بات قرآن کی اصطلاح میں آسمان پانچ چھے معانی میں استعمال ہوا ہے ایک مجموعی مطلب یہی ہے کہ زمین سے اوپر جو فضا ہے وہ آسمان ہے، اسی میں ہینلی باڈیز بھی ہیں، بادل بھی ہیں، سپیس بھی ہے۔اس طرح قرآن ستاروں، سیاروں، آسمان میں برج، دروازوں کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، غلطی فہمی قرآن کی اصطلاح کا مطلب سائنس کی اصطلاح میں سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے، جدید سائنسی اصطلاحات چونکہ بعد کی ہیں اور لازمی نہیں قرآن کو مد نظر رکھ کے ترتیب دی گئی ہوں۔ اگر قرآن ہمارے سر پر موجود فضا کو آسمان کہتا ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے عوامی زبان آج بھی اسی طرح ہے، یورپ ہو یا امریکہ ساری دنیا میں آج بھی سکائے، آسمان کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور اس سے وہی مراد لیا جاتا ہے جو قرآن سمجھا رہا، آج بھی یہ کہا جاتا ہے کہ آسمان میں سورج نکلا ہوا ہے، چاند، ستارے آسمان میں چمکتے ہیں، اگر یہ ساری اصطلاحیں قابل قبول ہیں تو قرآن کی اصطلاح پر اعتراض کیوں ہے جو عوام الناس کو سمجھانے کے لیے ہی نازل ہوا ہے۔؟

قرآن مجید نے بہت سی جگہوں پر لفظ سماء (آسمان) مختلف معانی میں استعمال کیا ہے اور وہ عام اصطلاح میں بالکل درست ہے مثلا:

1۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ اس وقت دھویں کی شکل میں تھا (سورۃ فصلت آیت 5) یہاں آسمان سے مراد آسمان سے مراد کائنات ہے، جیسا کہ بعد کے فقروں سے ظاہر ہے کہ آسمان کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات کی طرف متوجہ ہوا۔

2۔ ونزلنا من السماءِ ماءً مبارکاً'''' اور ھم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا ھے۔''

3۔ ''بابرکت ھے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں چراغ اور چمکتا ھوا چاند قرار دیا ھے ۔'' (سورۃ الفرقان آیت 61) یہاں آسمان فضا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

4۔ جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کیے، تم خدائے رحمن کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں پاؤ گے۔ (سورۃ الملک آیت 3)

اسی طرح قرآن میں بادلوں اور چھت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں جہاں لفظ سماء آیا ہے اسکو سمجھنے کے لیے اسکے سیاق و سباق کو دیکھا جاتا ہے۔ قرآن میں سات آسمان اور سات زمینوں کا ذکر ہے، کچھ مفسرین نے اس سے مراد آسمان و زمین کی تہیں / سطحیں مراد لی ہیں۔ قرآن نے آسمان دنیا کو طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ سبع (سات) عربی میں کثرت کی علامت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ممکن ہے یہ سات سے زائد ہوں۔ سات زمینوں کے متعلق کچھ مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس طرح یہ زمین اپنی موجودات کے لئے ماحول کے لحاظ سے موضوع ہے ممکن ہے اسی طرح کی اللہ تعالی نے کائنات میں اور زمینیں بھی تیار کر رکھی ہوں (تفہیم القرآن، سید مودودیؒ)

☆ کیا قرآن کے مطابق زمین فلیٹ ہے؟

ملحدین قرآن پر اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کے مطابق زمین ہموار یا فلیٹ ہے اور اس کے لیے وہ قرآن کی دیگر آیات کے ساتھ ایک آیت 'والارض مد دنھا' پیش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کو پھیلایا گیا اور اس پھیلائے جانے سے مراد وہ یہ لیتے ہیں کہ قرآن کے مطابق زمین فلیٹ ہے جب کہ سائنس کے مطابق زمین گول ہے۔

جواب: قرآنی آیت اور اسکا ترجمہ:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ 19

ترجمہ: ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی۔ (سورۃ الحجر آیت 19)

آیت سے واضح ہے کہ یہاں قرآن زمین کی سطح کی بات کر رہا ہے اسکی شیپ یا شکل کی نہیں۔! قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو وسعت دی، اسکو پھیلایا، یہ پھیلانا ایک گول چیز کا بھی ہو سکتا ہے اور مستطیل نما اور فلیٹ چیز کا بھی۔ اسی طرح سورۃ النازعات میں ہے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا۔ ترجمہ: اس کے بعد اس نے زمین کو بچھایا۔ (النازعات، 30)

زمین وآسمان کی تخلیق چھے ایام میں یا آٹھ

اعتراض:

قرآن کئی مقامات پر بیان کرتا ھے کہ زمین وآسمان چھ دن میں پیدا کئے گے لیکن سورۃ فصّلت میں کہا گیا ھے کی زمین واسمان 8 دنوں میں بنا ے گے کیا یہ تضاد نہیں؟

جواب: قرآن کے مطابق آسمان وزمین چھ دنوں یعنی چھ ادوار میں پیدا کیے گے ھیں اسکا ذکر ان سورتوں میں آیا ھے. سورۃ اعراف کی آیت 54، سورۃ یونس آیت 3، سورۃ ہود آیت 7، سورۃ فرقان 59، سورۃ حدید کی آیت 4۔

قرآن کریم کی جتنی بھی آیات میں زمین وآسمان کو تخلیق کرنے کی کل مدت للہ تعالیٰ نے بیان کی ہے وہ چھ دن ہی ہے۔ مگر سورہ فصلت میں للہ نے زمین وآسمان کی پیدائش کے دو ایام اور ان میں موجود باقی تمام چیزوں کی پیدائش کے چار ایام اور زمین وآسمان کے دوبارہ دو ایام بیان کیے ہیں جس پر ملحدین کا اعتراض یہ ہے کہ اگر ان کو ٹوٹل کیا جائے تو آٹھ دن بنتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ سورت فصلت آیت 9 تا 12 پیش ہے:

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٩﴾ وَجَعَلَ فِيهَا
رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ﴿١٠﴾ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ

دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴿١١﴾ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿١٢﴾

ترجمہ: کہہ دو کہ کیا تم واقعی اس ذات کے ساتھ کفر کا معاملہ کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو؟ وہ ذات تو سارے جہانوں کی پرورش کرنے والی ہے۔(9)اور اس نے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ پیدا کیے جو اس کے اوپر ابھرے ہوئے ہیں اور اس میں برکت ڈال دی اور اس میں توازن کے ساتھ اس کی غذائیں پیدا کیں۔ سب کچھ چار دن میں تمام سوال کرنے والوں کے لیے برابر۔(10) پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ اس وقت دھویں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے کہا: چلے آؤ چاہے خوشی سے یا زبردستی۔ دونوں نے کہا: ہم خوشی خوشی آتے ہیں(11)

آیت نو میں ذکر آیا کہ دو دن میں زمین بنائی، آیت دس میں اس موجود لوازمات کا ذکر آیا کہ یہ سب چار دن میں بنے، آیت گیارہ میں زمین اور آسمان دونوں کو وجود میں لانے کا ذکر ہوا۔ یعنی جو دو دن آیت نمبر 9 میں بیان کئے گئے آیت نمبر 11 میں انہی کا اعادہ کیا گیا۔ چناچہ حم سجدہ کی آیت 11 میں واضح بیان پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ اس وقت دھویں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے کہا: چلے آؤ چاہے خوشی سے یا زبردستی۔ دونوں نے کہا: ہم خوشی خوشی آتے ہیں(11)

آیت میں واضح آسمان کی تخلیق کیساتھ زمین کا ذکر آیا ہے، یعنی زمین اور آسمان کی تخلیق اکھٹی ہوئی، چنانچہ یہ وہی دن ہیں جنکا ذکر آیت نو میں ہے۔ خلق ارض (آیت نو) اور تسویہ سماء (آیت گیارہ) کے مابین (آیت

دس) میں متعلقات ارض کا ذکر جملہ معترضہ کے طور پر لایا گیا ہے کیونکہ سیاق کا تقاضا یہی تھا، اور ایک بلیغ کلام میں صرف ظاہری و قوعی ترتیب کی نہیں بلکہ معنوی اور بلاغی ترتیب ہی اہم ہوتی ہے!

جب اسی اگلی آیات میں یہ بات واضح ہو چکی کہ زمین و آسمان ایک ساتھ تخلیق ہوئے تو پھر یہ دو دن پچھلی آیات میں زمین کے لئے بیان کردہ دو دنوں سے الگ کیسے ہو سکتے تھے؟

بنیادی بات یہ ہے کہ زمین و آسمان کی چھ دن میں تخلیق کا بیان اتنے زیادہ تواتر سے قران میں آیا ہے کہ اس کے بعد سورہ فصلت کی ان آیات سے یہ بات اخذ کی ہی نہیں جا سکتی کہ یہاں چھ دن آٹھ دنوں میں بدل گئے ہوں گے۔ قرآن پر چودہ سو سال سے تحقیقات ہو رہی اگر یہ غلطی ہوتی تو فوراً عیاں ہو جاتی کہ پہلے چھ فرماتے رہے اب تعداد گن رہے ہیں تو آٹھ آ رہی ہے۔ جی نہیں۔ اس کو کسی بھی دور میں غلطی سمجھا ہی نہیں گیا۔ نہ ہی یہ غلطی ہے۔ یہ غلطی صرف اس ملحد کی ہے جس نے قران کی گزشتہ سات آیات کو بھی نظر انداز کر دیا اور اس آیت میں بھی زمین کے دو دن الگ گنے اور آسمان کے دو دن الگ۔ جبکہ اسی آیت میں زمین اور آسمان کی اکٹھی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے۔

نوٹ: چار دن میں جو کام ہوا یعنی تزین و آرائش، خوراک و باقی ضروریات وغیرہ کا بندوبست' ان آیات میں اس کا ذکر آسمان کی پیدائش کے تذکرے سے پہلے کیا گیا۔ حم سجدہ میں رد شرک کے سیاق میں بندوں پر احسانات کا ذکر چل رہا ہے، لہذا وہاں زمین کے متعلقات کو پہلے یکجا کر دیا گیا ہے، کہ انسان جن نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، ان کا براہ راست تعلق اسی زمین سے ہے، لہذا اس کو زمین کی تخلیق کے ساتھ بیان کرنا مناسب حال ہوا، اور اس میں موجود واؤ ایسا کوئی تقاضہ نہیں کرتا کہ ما قبل مستقل اور الگ آیت میں مذکور

مرحلے اوراس مرحلے میں کوئی فاصلہ نہ ہو،نہ اسے ماقبل سے جوڑ کر مرتب کرنااس سے سمجھ میں آتاہے..
ایسی صورت میں مذکورہ آیت جملہ معترضہ شمار ہوگی۔ مگر اسلوب بیان میں پھر بھی اس بات کی بھرپور
رعایت کی گئی کہ جملہ معترضہ جملہ معترضہ ہی رہے اور سمجھا جاسکے،اور اصل سلسلہ کلام بھی نہ ٹوٹنے
پائے،اس طرح کہ آسمان کے تسویہ کو زمین کے پیدا کرنے پر عطف کیا گیا،جب کہ متعلقات ارض کو ایسے
پیرایے میں لایا گیا کہ اس کی ترتیب ہی لازم نہیں آتی،اور وہ پوری بیانی وبلاغی وسعت کے ساتھ جملہ
معترضہ ہی رہتا ہے! یہ قرآن کا اعجاز ہے! کہ ہر مقام اور سیاق کے اعتبار سے بہترین اور مناسب ترین
ترتیب کے باوجود کہیں پر بھی تناقض نہیں ہوتا۔

چنانچہ اگلی آیت ""ثم استوی الی السماء... ""میں ثم کا عطف،مذکورہ آیت سے پہلے والی آیت "" قل ائنکم لتکفرون
بالذی خلق الارض فی یومین ""میں ""خلق الارض ""پر ہوگا.. یہ چیز لغت کے کسی قاعدے سے متعارض
نہیں ہے۔یہ وضاحت اعتراض کے جواب میں وجود میں نہیں لائی گئی،بلکہ نقل ہوتی ہوئی آئی ہے،چنانچہ
بطور مثال صحیح بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ حم السجدۃ کے اندر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے.

استفادہ تحریر محمد سلیم،وسیم بیگ

15

کیا تخلیق سے پہلے زمین و آسمان آپس میں جڑے ہوئے تھے؟

اعتراض: اکثر مومنین ان آیات کو استعمال کر کے بگ بینگ کو قران سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، مگر مومنین یہ بھول جاتے ہیں کہ زمین کو وجود میں آنے کے سائنسی شواہد بالکل مختلف ہیں، بگ بینگ آج سے 13.7 ارب سال پہلے ہوا، جبکہ زمین 4.6 ارب سال پہلے وجود میں آئی اس لئے زمین اور آسمان کو جڑے ہوئے کہنا ہی غلط ہے۔ ''اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا[3]
ترجمہ: اور کیا کافر لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اکائی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے پس ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا۔'' ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ ہِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَہَا وَ لِلۡاَرۡضِ ائۡتِیَا طَوۡعًا اَوۡ کَرۡہًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیۡنَا طَآئِعِیۡنَ ۝[6] ترجمہ: پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا، اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آجائو، خواہ تم چاہو، یا نہ چاہو دونوں نے کہا: ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح۔

)غالب کمال(

جواب:

قرآن میں بیان کردہ وہ باتیں جو کہ کسی نہ کسی طرح سائنس سے متعلق ہیں اس کا انداز سائنسی نہیں ہے۔موجودہ دور کی سائنسی دریافتوں کو قرآن کے ساتھ map کرنے کا کام انسان کا اپنا تحقیقی کام ہے۔ اگر کوئی بلیک ہول یا بگ بینگ تھیوری کو قرآن کی کسی آیت کے ساتھ ملا دیتا ہے تو وہ اس کی اپنی تحقیق ہے۔ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے اور کوئی نہیں۔ کوئی اس طرح کی تحقیق پر فوکس کرتا ہے اور کوئی اس کو غیر ضروری جانتا ہے۔کل کو یہ ثابت ہو جائے کہ بگ بینگ تھیوری غلط ہے تو بھی ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے کیوں کہ یہ بالکل One is to one mapping کا معاملہ نہیں ہے۔

قرآن اگرچیکہ سائنسی کتاب نہیں ہے لیکن سادہ انداز میں جو بھی اس میں سائنسی حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہیں اور چونکہ قرآن سائنسی کتاب نہیں ہے اس لئے اس کا انداز بھی سائنسی نہیں ہے۔اس کا طرز بیان ایسا ہے کہ موجود دور کا جدید انسان بھی اس کو سمجھے اور چودہ سو سال پہلے والا ایک عام سے بدو بھی اس کو سمجھے۔قرآن کا مقصد سائنس سکھانا نہیں اس لئے آپ قرآن سے سائنسی انداز کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔اگر کوئی 'طے شدہ سائنسی تحقیق' اور قرآن کی کسی بیان کردہ واضح بات کو ایک دوسرے سے متضاد ثابت کیا جائے تو پھر سچ مچ قرآن کی حقانیت پر سوال اُٹھایا جا سکتا ہے۔اور اگر کوئی شخص اپنی کاوش سے قرآن میں بیان کردہ بات کو موجود سائنسی دریافتوں کے ساتھ مطابقت ثابت کرتا ہے تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ یہ مطابقت کتنی OBjective ہے۔اور اگر Objective نہیں ہے تو پھر معاملہ ڈھیلا ہی رہتا

ہے۔ مؤمنین ان آیات کو دیکھ کر اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہیں گے اور جب کوئی نئی تحقیق یہ ثابت کرے کہ پہلے والی مطابقت غلط تھی تو مؤمنین نئی مطابقت پیدا کر کے اپنے ایمان کو مزید تازہ کریں گے۔ اور کچھ ملحدین ان مؤمنین کی عقل کا ماتم کریں گے اور کچھ جلتے کڑھتے رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ آیا کلام پاک میں موجود رتق اور فتق کی بات بگ بینگ سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں، تو جناب میرا خیال یہی ہے کہ یہ مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن اس کا مطابقت رکھنا اتنا Objective نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی دوسرے مؤمنین اس بارے میں جذباتی ہوں اور اس کو کلام پاک کے بہت بڑے اعجاز کے طور پر پیش کریں تو ان سے نمٹنا ملحدین کا کام ہے۔

جہاں تک اس اعتراض کی بات ہے یہ کوئی خاص وزن نہیں رکھتا ہے۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ زمین اور آسمان باہم ملے ہوئے تھے تو آپ اس کا ایک لازمی مطلب یہ لیتے ہیں کہ جب زمین اس شکل میں بن چکی تھی تو وہ آسمان سے ملی ہوئی تھی۔ انسانی زبان میں اس بات کا احتمال پایا جاتا ہے کہ ہم اس کا یہ مطلب نکالیں کہ جس مادے سے زمین اور آسمان بنے ہیں وہ کبھی ایک ہی اکائی کی شکل میں تھے۔ اگر ہم یہ کہیں تو کیسے غلط ہے کہ جس مادے سے زمین بنی ہے وہ اسی parent مادے کا حصہ ہے جو دھویں، گرد و غبار کی شکل میں تھا، بگ بینگ کی وجہ سے سکیٹر ہوا لیکن ایک ٹھوس سیارے کی شکل میں وہ 4.7 ارب سال پہلے آئی وہ تخلیق کا آخری مرحلہ تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں آسمان و زمین دونوں کی خلقت کا آغاز تو ایک ہی ساتھ ہوا ہے لیکن جس طرح ایک وسیع الاطراف عمارت کے مختلف حصوں میں تعمیر کے مصالح کے تحت کبھی اس کے کسی گوشہ میں کام ہوتا ہے کبھی کسی گوشہ میں اسی طرح آسمان و زمین کی تعمیر کا کام بھی ہوا ہے اس وجہ سے یہ سوال غیر ضروری ہے کہ پہلے زمین پیدا ہوئی ہے یا آسمان؟ ایک مکان کی پلاننگ لازماً ایک ہی وقت میں

ہوتی ہے۔ آیت یہی بیان کر رہی ہے: کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا، 28 اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ 29 کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟

یہاں پر دیکھنے کا معنی غور و فکر کرنا اور جاننا ہے۔ کیا ان لوگوں نے جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ان نشانیوں کو نہیں دیکھا جو عیاں طور پر دلالت کرتی ہیں کہ آسمان اور زمین جیسے قوی الجثہ مخلوقات تک میں یہ قدرت کب تھی کہ اپنے ارادہ واختیار سے وہ کچھ کرنے لگیں؟ کیا ان لوگوں نے اس بات میں غور و فکر نہیں کیا؟ اگلی آیات سے بظاہر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک ہی تھی بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔ فلکیات کے شعبے میں انسانی علم جس قدر آگے بڑھتا ہے وہ قرآن کے اس فرمان کی توثیق کرتا ہے جو قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے کہی۔ آج تک انسانوں نے جو نظریات قائم کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سورج کی کہکشاں جس میں سورج، چاند، زمین اور ان کے تابع دوسرے سیارے ہیں وہ پہلے ایک ''سدیم'' تھے بعد میں جدا ہو کر ان اجرام نے موجودہ شکل اختیار کر لی۔

اسی طرح اگلی مذکور آیت میں ہے: پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ اس وقت دھویں کی شکل میں تھا (5) اور اس سے اور زمین سے کہا: چلے آؤ چاہے خوشی سے یا زبردستی۔ دونوں نے کہا: ہم خوشی خوشی آتے ہیں (سورۃ حٰمٓ السَّجدۃ آیت 5،6) اسکی تفہیم میں تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

اول یہ کہ آسمان سے مراد یہاں پوری کائنات ہے، جیسا کہ بعد کے فقروں سے ظاہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسمان کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات کی طرف متوجہ ہوا۔ دوم یہ کہ دھوئیں سے مراد مادے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزاء غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ کے سائنسداں اسی چیز کو سحابیے (Nebula) سے تعبیر کرتے ہیں اور آغاز کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے، اسی دخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا۔ سوم یہ کہ اس آیت اور بعد کی آیات میں ذکر اس وقت کا ہو رہا ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان تھا بلکہ تخلیق کائنات کی ابتدا کی جارہی تھی۔

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے طریق تخلیق کی کیفیت ایسے انداز سے بیان فرمائی ہے جس طرح ایک انسان کی تخلیق میں سللۃ من طین، نطفہ، علقہ، مضغہ، لحم اور خلق آخر کے مراحل آتے ہیں اور آپ ان میں سے کسی کو بھی انسانی تخلیق سے الگ نہیں کر سکتے، اسی طرح زمین کی تخلیق میں بھی بگ بینگ سے ملکی وے گلیکسی، پھر سولر سسٹم اور پھر زمین یہ تمام مراحل آتے ہیں، ایک سادہ سی مثال ہے کہ ایک درخت کی لکڑی سے اگر ایک میز اور کرسی بنائی جائے اور پھر کہا جائے کہ یہ پہلے درخت کی شکل میں اکٹھے تھے اور پھر کاٹ کر ان کو علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا۔ اس بات سے کوئی عقل کا اندھا ہی انکاری ہو گا۔

اگر تو آپ اس آیت سے یہ مفہوم نکال رہے ہیں کہ زمین اور آسمان جس حالت میں اب موجود ہیں اسی حالت میں جڑے ہوئے تھے اور پھر علیحدہ ہو گئے تو آپ کو دوبارہ سمجھنے کی ضرورت ہے، آپ تخلیق کا پورا عمل ہی درمیان سے کھا گئے ہیں۔۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک بچہ ماں کے پیٹ میں یا ماں کا حصہ تھا تو انسانی فہم خود سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے جس مرحلے کی بات ہو رہی ہے اس مرحلے میں وہ بچہ حقیقت میں بچہ بنا ہی

نہیں تھا۔ یہاں پر آپ ایک خاص معنی لے کہ زبردستی Contradiction پیدا کر رہے ہیں۔ ممکن کہ آپ مؤمنین پر زبردستی کے Concoctattion کا الزام لگائیں۔ لیکن آپ انہیں سے Concoctationاور Contradiction کا کھیل کھیلتے رہیں۔

یہ اس مسئلہ کی موجودہ نظریات کی روشنی میں قابل قبول وضاحت ہے، اگر خدانخواستہ کسی نظریاتی معاملے میں قرآنی بیان سے سائنسی تضاد بھی سامنے آتا ہو تو وہ ویلیو نہیں رکھتا۔ سائنسی فالسفیکیشن (اپنے نظریات کی تردید کیے جانا) کے اصول پر ترقی کرتی ہے چنانچہ نظریاتی سائنس میں کچھ بھی حتمی نہیں ہوتا، ایک چیز کو ایکسپلین کرنے کے لیے بدلتے وقت کے ساتھ تشریحات بھی بدلتی جارہی ہیں پرانی رد ہوتی جارہی ہیں اور نئی آتی جارہی ہیں۔ ابھی بہت کچھ دریافت ہونا ہے، انفلیشن، بگ بینگ اور سٹڈی سٹیٹ، ملٹی ورس تھیوریز صرف معلوم کرنے کی انسانی کوششیں ہیں، اصل میں ہوا کیا تھا کسی کو نہیں معلوم۔ سٹیفن ہاکنگ نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ ہم بالکل بھی نہیں جانتے کہ شروعات میں ہوا کیا تھا، اور نہ ہی ہمیں معلوم ہے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اور کائنات کا نظام کیوں شروع ہوا: ''ہم کائنات کی بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے، عین ممکن ہے کہ کل کو کائنات کے بارے میں ہماری قائم کردہ تھیوریز پانی پر بنی تصویر ثابت ہوں'' جب ان تھیوریز کو بنانے والے خود اتنے uncertain ہیں تو ہم کیسے ان کی بنیاد پر کسی کو غلط یا ٹھیک ثابت کر سکتے ہیں؟ سائنس اگر آج کچھ اور کہہ رہی ہے تو وہ پہلے بھی اور بہت کچھ کہتی آئی ہے، یہ کنفرم بات ہے کہ اگلی چند دہائیوں میں بہت کچھ نیا سامنے آجائے گا اور آپ اس کو لیکر قرآن کو غلط ثابت کرنے لگ جائیں گے۔ جب آپ خود مانتے ہیں کہ ابھی سائنس کائنات کے بارے میں بہت اندھیرے میں ہے تو اتنے لمٹیڈ علم کے ساتھ آپ باقی چیزوں کا رد کرنے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟ سائنسی نظریات اور

سائنسی حقائق میں فرق ہوتا ہے۔ کسی ثابت شدہ سائنسی حقیقت سے قرآن کا تضاد آج تک سامنے نہیں آسکا۔

مزید قرآن کریم علمی نظریات کی کتاب نہیں ہے نہ قرآن کریم اس لیے نازل ہوا ہے کہ سائنس کی طرح اس کے تجربے کیے جائیں۔ قرآن کریم کبھی کبھار کائناتی حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً آسمان وزمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان دونوں کو جدا کیا''۔ ہم اس حقیقت پر محض اس لیے یقین کرتے ہیں کہ یہ قرآن میں مذکور ہے 'اگرچہ تفصیلات کا ہمیں علم نہیں ہے کہ یہ کیونکر ہوا؟ زمین آسمان سے کیسے جدا ہوئی یا آسمان زمین سے کیسے جدا ہوئے۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ فلکیاتی نظریات کو سامنے رکھ کر آیات قرآنیہ کو ان کے پیچھے دوڑائیں اور قرآن کی صداقت کا سرٹیفکیٹ ان نظریات سے لیں کیونکہ یقینی حقیقت قرآن ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کے فلکیاتی نظریات اس آیت کے اس مجمل مضمون کے خلاف نہیں ہیں جو آیت میں آج سے صدیوں پہلے بیان کر دیا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس دان جب اس حقیقت تک پہنچے تو یہ بہت بڑا انکشاف تھا لیکن قرآن مجید میں جو بات آئی ہے یہ ہمارے لیے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے اور نہ سائنس دانوں کے انکشاف اور تجربے سے قرآن پر ایک مسلمان کے عقیدے میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن پر ہمارے اعتقاد کی بنیاد یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ بنیاد نہیں ہے کہ جدید سائنسی نظریات قرآن کریم میں دیئے گئے حقائق کو ثابت کرتے ہیں۔

مذہب اور سائنس دو علیحدہ علمی پیراڈائم ہیں۔ آپ نیچرل سائنس کی علمیت کے اصول نہ مذہب پر لاگو کر سکتے ہیں، نہ سوشل سائنس پر اور نہ ہی فلسفہ پر۔ مذہب کا اصل واسطہ فلسفہ اور سوشل سائنس سے متعلق ہے۔ لیکن چونکی بہت زیادہ ریسرچ کی وجہ سے نیچرل سائنس اپنا دائرہ کار بڑھا رہا ہے اس لئے یہ

تھوڑی بہت Confrontation ہو رہی ہے۔ سائنس کی اہمیت کے پیش نظر آپ نے یہ مان لیا ہے کہ علم بس سائنس ہی ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ خواہ مخواہ کی سائنس گردی ہے۔ ایک ملک میں کیا قانون ہونا چاہیئے اس قسم کی چیزیں طئے کرنے کے لئے فی الحال کوئی سائنسی ماڈل نہیں بنا۔ آپ یہاں پر operational reseacrh کا Transport Model اپلائی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ابھی یہی طئے نہیں ہوا کہ علم نفسیات سائنس ہے بھی یا نہیں۔ تو جناب سائنس ہے تو زبردست لیکن یہی کل کا کل Epostemology نہیں ہے۔

جواب: عزالدین دکنی، ہمایون ناصر

16

قرآن میں شہاب ثاقب کا تذکرہ اور اسکی حقیقت

شہاب ثاقب عربی زبان کا لفظ ہے شہاب کا معنٰی ہے دہکتا ہوا شعلہ اور ثاقب کا معنٰی ہے سوراخ کرنے والا ۔ہمارے نظام شمسی میں مریخ اور مشتری کے مدار کے درمیان چکر لگانے والے خلائی پتھر جنہیں ” سیارچے (Asteroids) “ کہا جاتا ہے بعض اوقات زمین کی طرف آجاتے ہیں اور زمین کی فضا سے رگڑ کھانے سے ان میں اتنی حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں اور اس کی روشنی ہمیں نظر آتی ہے اس کو ہم تارا ٹوٹنے سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ شہاب ثاقب کا یہی معنٰی سائنسی و فلکیاتی اصطلاح میں ہے.

شہاب ثاقب کو شہاب ثاقب کیوں کیا جاتا ہے ؟ شہاب کا معنٰی ہے دہکتا ہوا انگارہ: شہاب ثاقب جب زمین کی فضا سے ٹکراتا ہے تو انگارہ بن کر روشن ہوتا ہے اور جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ ثاقب کا معنٰی سوراخ کرنے والا

ہے: شہاب ثاقب زمین کی فضا سے ٹکرا کر ایسے روشن ہوتے ہیں گویا تاریکی میں سوراخ کر دیا ہو یا وہ اتنی زور سے ٹکراتے ہیں کہ گویا زمین کی فضا میں سوراخ کر دیں گے.

قرآن میں شہاب ثاقب کا ذکر ان سے آسمانوں کی حفاظت کا کام لینے کے طور پر آیا ہے۔ سورۃ الجن میں جنوں کا بیان ہے: ''اور یہ کہ: ہم پہلے سن گن لینے کے لیے آسمان کی کچھ جگہوں پر جا بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن اب جو کوئی سننا چاہتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ایک شعلہ اس کی گھات میں لگا ہوا ہے۔(الجن، آیت 9)

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم آسمان میں جاری فرماتے ہیں تو سب فرشتے بغرض اطاعت اپنے پر مارتے ہیں اور جب کلام ختم ہو جاتا ہے تو باہم تذکرہ کرتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ اس تذکرہ کو آسمانی خبریں چرانے والے شیاطین سن لیتے ہیں اور کاہنوں کے پاس اس میں بہت سے جھوٹ شامل کر کے پہنچاتے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھا۔ شیاطین فرشتوں سے سن لیا کرتے تھے۔ مگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے وقت آپ کی آسمانی وحی کی حفاظت کے لئے اس سلسلہ کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان یہ خبریں سننے کے لئے اوپر آتا تو اس کی طرف شہاب ثاقب کا انگارہ پھینک کر اس کو دفع کر دیا جاتا۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جب پہرے سخت ہو گئے تو جنات کو تشویش ہوئی انہوں نے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ زمین کے مشرق و مغرب میں گھوم پھر کر دیکھتے ہیں کہ کیا بات ہوئی ہے کہ اب ہم اوپر نہیں جا سکتے۔ چنانچہ جنات کی مختلف جماعتوں کو زمین کے اکناف و اطراف کی طرف بھیجا گیا تا کہ معلوم

کریں کہ دنیامیں کون سی نئی بات ہوئی ہے۔جنات کاایک گروہ جن کی تعداد نو یاسات تھی اسی تفتیش میں وادی نخلہ سے گزر رہا تھاوہاں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صبح کی نماز میں تلاوت فرمارہے تھے۔جب ان جنات نے قرآن سنا تو اسے غور سے سننے لگے۔ پھر انھوں نے (آپس میں) کہا، اللہ کی قسم! جو چیز تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان حائل ہوئی ہے وہ یہی ہے، پھر وہاں سے جب وہ اپنی قوم کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اے ہماری قوم! (اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَ لَنۡ نُّشۡرِکَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا) [الجن: ۱، ۲] ''بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔جو سیدھی راہ کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور (اب) ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو کبھی شریک نہیں کریں گے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ قرآن سن کر سارا گروہ ایمان لے آیا اور واپس چلا گیا مگر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کا علم نہ ہوا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجن کے ذریعے آپؐ کو اس واقعے سے آگاہ کیا اور آپؐ پر جنوں کی بات چیت وحی کی گئی۔ [بخاری، کتاب الأذان، باب الجھر بقراءۃ صلوۃ الصبح: ۷۷۳۔ مسلم، کتاب الصلوۃ، باب الجھر بالقراءۃ فی الصبح والقراءۃ علی الجن: ٤٤٩]

شہاب ثاقب جس کو عرف میں ستارہ ٹوٹنا یا عربی میں انقضاص الکوکب کہتے ہیں' دنیامیں قدیم زمانہ سے ظاہر ہوتا آرہا ہے۔ان آثار وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں ان سے دفع شیاطین کا کام بھی لیا جانے لگا۔ یہاں یہ ضروری نہیں کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو۔تاریخ عرب سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب شہاب ثاقب کو بہت حیرت سے دیکھتے تھے، شہاب ثاقب کا گرنا معروف تھا لیکن انکے نزدیک یہ پہلے اس وقت ہوتا تھا جب کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہوتا تھا، کوئی بڑا مرتا یا پیدا ہوتا تھا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث میں نبیؐ نے انکے اس عقیدے کی یوں تصحیح کی کہ یہ شہاب ثاقب نہ

کسی کی موت کی وجہ سے گرائے جاتے ہیں نہ کسی کی حیات کی وجہ سے، یہ لغو خیال ہے ان کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں یہ شعلے شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔(صحیح مسلم حدیث 1322)

ان لوگوں کی رائے کا تعلق چونکہ عقیدے سے تھا اس لیے آپؐ نے تصحیح بھی عقیدے کے حوالے سے کردی۔ قرآن و حدیث نے شہاب ثاقب کی اس خصوصیت کا ہی ذکر کیا جس کا تعلق شریعت سے تھا کہ ان کے ذریعے سرکش شیاطین کو مارا جاتا ہے ان کی دیگر خصوصیات کہ یہ زمین کی کشش کی وجہ سے زمین کی فضا سے ٹکرا کر بھسم ہو جاتے ہیں یا یہ کیسے جلتے ہیں، اصل میں کیا چیزیں ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور بنے کیسے ہیں وغیرہ کی سائنسی تفصیل کا شریعت کیساتھ تعلق نہیں اس لیے اسکا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ یہ سائنسی بیان کہ فضا میں چکر کھاتے وزنی پتھر جب زمینی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو ہوا سے رگڑ کھا کر روشن ہو جاتے اور کہیں زمین پر ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں' قرآن کی بتائی ہوئی حکمت کے منافی نہیں۔ قرآن کو ان کی ترکیب، ساخت وغیرہ سے مطلق بحث نہیں، وہ اپنے موضوع کے اندر رہ کر صرف اتنا بیان کرتا ہے کہ ان سے کام شیطان کے بھگانے کا بھی لیا جاتا ہے۔

یہ ضروری نہیں یہ بے حدو حساب شہابِ ثاقب جو کائنات میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں، اور جن کی بارش زمین پر بھی ہوتی رہتی ہے' صرف شیطانوں کو ہی مارے جاتے ہیں یا یہ جب شیطانوں کو مارے جاتے ہیں تو تب ہی گرتے نظر آتے ہیں بلکہ ان سے حفاظت کا کام بھی لیا جاتا ہے، یہ اس امر میں مانع ہیں کہ زمین کے شیاطین عالمِ بالا میں جا سکیں۔ اگر وہ اوپر جانے کی کوشش کریں بھی تو فرشتے ان شہاب کے ذریعے انہیں مار بھگاتے ہیں۔ اس چیز کو خصوصی طور پر بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے

کہ عرب کے لوگ کاہنوں کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے اور یہی خود کاہنوں کا دعٰوی بھی تھا، کہ شیاطین اُن کے تابع ہیں، یا شیاطین سے اُن کا رابطہ ہے، اور اُن کے ذریعہ سے اُنہیں غیب کی خبریں حاصل ہوتی ہیں اور وہ صحیح طور پر لوگوں کی قسمتوں کا حال بتا سکتے ہیں۔ اس لیے قرآن میں متعدد مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین کے عالمِ بالا میں جانے اور وہاں سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ، جلد دوم، الحجر، حواشی ۹تا۱۲۔ جلد چہارم، الصافات، حواشی ۷،۶)۔

17

سورج چاند گرہن اور ملحدین

ملاحدہ کا اعتراض:

اسلام خوف کا مذہب ہے۔ مثلاً سورج اور چاند گرہن عام واقعات ہیں جن کی سائنس نے قابلِ فہم توجیہ پیش کی ہے جس کو پانچ سال کا بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ سائنس نہ ہونے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ مسلمانوں کو ڈرا کر سورج اور چاند گرہن کی نماز پڑھانے پر اکساتے تھے، جبکہ یہ کوئی خوفناک واقعہ نہیں ہے۔

الجواب:

ہمارے لئے تو وہی بات قابلِ قبول ہے جو کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایادی۔۔ تفصیل اس بابت یہ ہے کہ دورِ جہالت میں گرہن سے متعلق فضول توہمات موجود تھے۔۔ مثلاً یہ سمجھا جاتا تھا کہ آسمان میں ایک اژدھا ہے، وہ جب غصے میں چاند کو نگل لیتا ہے تو چاند گرہن ہوتا ہے۔۔ اسی طرح زمین پر جب کسی اہم شخصیت کی موت ہوتی ہے تو سورج پر اندھیرا چھاجاتا ہے تو سورج گرہن ہوتا ہے، وغیرہ۔۔ اسلام حقائق کا دین ہے اور توہمات کا مخالف ہے۔۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد نبی کریم ﷺ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ مدینہ میں پیدا ہوئے اور ڈیڑھ سال کی عمر (شوال-10 ہجری) میں انکا انتقال ہو گیا۔۔ اتفاق سے اسی دن سورج کو گرہن پڑ گیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ پیغمبر ﷺ کے بیٹے کی وفات کی وجہ سے ہے۔۔ آپ ﷺ کو یہ بات ناپسند ہوئی تو آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ''سورج اور چاند میں کسی انسان کی موت کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا بلکہ یہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں۔ جب تم ایسا دیکھو تو نماز پڑھو''۔(صحیح البخاری-کتاب الکسوف)۔۔ یہ تو تھا ہم مومنین کیلئے جواب۔۔ اب 'عقلمند' ملحدین کیلئے سائنسی جواب ملاحظہ ہو۔۔

کائنات میں واضح طور پر ایک ذہین منصوبہ بندی (Intelligent Planning) پائی جاتی ہے جس کا دوٹوک مطلب ہے کہ ذہین ترین منصوبہ ساز (Intelligent Planner)موجود ہے۔۔ اس منصوبہ ساز (خدا) نے آپکی اب تک دریافت شدہ 125 بلین کہکشائیں تخلیق کیں جس میں سے ہر ایک کے اندر تقریباً 200 بلین ستارے ہیں۔۔ ان عظیم کہکشاؤں میں صرف ایک ہمارے ملکی وے گلیکسی (Milky Way Galaxy)کا نظامِ شمسی (Solar System) ایسا ہے جو ایک استثنائی مثال(Unique Case) ہے۔۔ ملکی وے کا درمیانہ حصہ ناقابلِ برداشت حد تک گرم ہے۔۔ اسکا صرف ایک کنارہ اُس پُر خطر درمیانی ماحول کے اثر سے بچا ہوا ہے جہاں ہمارا سولر سسٹم موجود ہے۔۔ اور

پھر اس میں سے صرف سیارہ زمین پر ہی Life Supporting System موجود ہے۔۔ مزید برآں، گرہن (Eclipse) ایک فلکیاتی مظاہرہ ہے جو باقی کائنات کی نسبت ایک عجیب طور پر ہمارے نظامِ شمسی کا حصہ ہے۔۔ گرہن دراصل سایہ پڑ جانے کو کہتے ہیں جو کہ دو اجسام کے درمیان ایک تیسرا جسم آجانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔۔ سورج اور چاند گرہن ایک انوکھا تخلیقی معجزہ ہے جو کہ صرف زمین پر رونما ہوتا ہے۔۔ وہ ایسے کہ ان تینوں جسموں (سورج، زمین، چاند) کے سائز میں بہت زیادہ فرق ہے۔۔ چاند کو اگر مکئی کے دانے کے برابر سمجھا جائے تو اسکے مقابلے میں زمین فٹ بال کے برابر اور سورج کوہ ہمالیہ سے بھی زیادہ بڑا ہوگا۔۔ یہ تین مختلف سائز کے اجسام حرکت کرتے ہوئے ایسے خوبصورت تناسب سے ایک سیدھ میں آجاتے ہیں کہ زمین سے دیکھنے والے کو یہ یکساں سائز کے نظر آتے ہیں۔۔ جب تینوں کے درمیان چاند ہو تو سورج گرہن ہوتا ہے اور جب تینوں کے درمیان زمین ہو تو چاند گرہن ہوتا ہے۔۔ یہ اِس وسیع ترین خلاء میں ایک انتہائی انوکھی پوزیشننگ ہے۔۔ کیا اتنی بڑی کائنات میں صرف زمین پر یہ انوکھا واقعہ ہونا محض اتفاق ہے یا کسی عزیز اور علیم خدا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے؟ (ذالک تقدیر العزیز العلیم)۔۔ ایسا خوبصورت اندازہ کہ آپ گرہنوں (Eclipses) سے پہلے ہی انکی قطعی پیشن گوئی کر لیتے ہیں۔۔ ان گرہنوں کے زمین پر کیا اثرات ہیں، اور یہ کیسے افزائشِ حیات کیلئے مفید ثابت ہوتے ہیں، اسکی تفصیل پر سائنسدانوں کی تحقیقات اور حیرانیاں آپ گوگل سے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں۔۔ کیا یہ نادر اتفاق خود بخود ہونا ممکن ہے؟ کون ہے جسے اس بے ارادہ کائنات پر کامل کنٹرول حاصل ہے؟

"بلکہ یہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں"۔۔ یہ کوئی سادہ سی بات نہیں ہے، بلکہ ہمیں دعوتِ فکر دی جا رہی ہے کہ اس معجزانہ صناعی پر غور کرو تاکہ تمہیں خدا کی معرفت نصیب ہو۔۔ یہ معرفت ہمیں

خدا کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کا ایک اظہار 'نماز' ہے۔۔ صلاۃ کسوف و خسوف اس بات کا اعتراف ہے کہ گرہن ایک زبردست حکمت والے کا ایک خدائی مظاہرہ ہے، نہ کہ محض ایک فلکیاتی ظاہرہ۔۔ جس بات کو آپ 'خوف' سے تشبیہ دے رہے ہیں اسے ہم مسلمان وہ کیفیت کہتے ہیں کہ اپنی بے بسی محسوس کرتے ہوئے خدا کی عظمتوں کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جانا۔۔ لیکن یہ اُسکے لئے ہے جس کے دل میں ایمان ہو۔۔(بے شک ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب لرز جاتے ہیں، اور جب اللہ کی آیات/نشانیاں ان پر تلاوت/بیان کی جاتی ہیں تو انکا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں—الانفال-2)۔۔!

اب آخری بات سمجھ لیں،، شاید آپکو فائدہ ہو جائے۔۔ سائنس خدا کے وجود یا مذہب کو درست ثابت کرنے کیلئے کوئی علم نہیں،، بلکہ مادہ اور مظاہرِ فطرت کی پہچان کیلئے تحقیق کا علم ہے۔۔ عجیب بات ہے کہ آپ مادی علم کے ذریعے غیر مادی حقائق پرکھنے کیلئے سائنس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔۔ حالانکہ سائنس (مادہ کا علم) جب بے بس ہو جاتی ہے تو کسی سپریم پاور کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہے۔۔

The most in-comprehensive fact about the nature is that it is comprehensible which means a very intelligent and mathematical planner that created zero defect universe.

''فطرت کے بارے میں سب سے ناقابلِ فہم حقیقت یہ ہے کہ وہ قابلِ فہم ہے۔۔ جس کا مطلب ہے کہ ضرور کوئی ذہین ترین ریاضیاتی منصوبہ ساز ہے جس نے بے نقص کائنات تخلیق کی''

پس اسلام امن، عقل اور تقویٰ کا مذہب ہے،، بے عقلی والی باتوں کا نہیں۔۔!!

(خیر اندیش: محمد نعمان بخاری)

18

آفتاب کے زیر عرش سجدہ کرنے کی روایت - تحقیقی جائزہ

عرش کے نیچے سجدہ کرنے کے متعلق روایت کی سیاق وسباق اور سورت یس کی آیت اڑتیس کی روشنی میں تحقیق پیش ہے۔اس روایت کو مخالفین اسلام خصوصاعیسائی مشنریز نے اسلام پر حملے اور منکرین حدیث نے حدیث کے الہامی ہونے پر سوالیہ نشان لگانے کے لیے استعمال کیا۔اس حدیث کو پڑھ کر عام مسلمان کے ذہن میں بھی جو سوالات اٹھتے ہیں اس تحریر کا مقصد انکا جواب مہیا کرنا بھی ہے۔

حدیث:

حضرت ابوذر (رض) روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ میں آفتاب غروب ہونے کے وقت مسجد میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اے ابوذر! کیا تم جانتے ہو کہ آفتاب کہاں غروب ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول زیادہ جانتے

ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ وہ جاتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اللہ تعالٰی کے قول (وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ) کے یہی معنی ہیں۔ (صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر 2011)

صحیح مسلم میں اس حدیث کی مزید تفصیل موجود ہے:

حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ سورج (غروب ہونے کے بعد) کہاں جاتا ہے صحابہ (رض) نے عرض کیا: اللہ تعالٰی اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سورج چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے جب وہ اپنی مقررہ منزل تک پہنچتا ہے تو سجدہ کرتا ہے اور اسی حالت میں رہتا ہے یہاں تک کہ اسے کہا جاتا ہے، بلند ہو اور جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ جا، پس وہ لوٹ جاتا ہے اور اپنے مطلع سے طلوع ہوتا ہے، پھر سورج (حسب سابق) چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے جب وہ اپنی مقررہ منزل تک پہنچتا ہے تو سجدہ کرتا ہے اور اسی حالت میں رہتا ہے یہاں تک کہ اسے کہا جاتا ہے، بلند ہو اور جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ جا، پس وہ لوٹ جاتا ہے اور اپنے مطلع سے طلوع ہوتا ہے، پھر یہ معمول جاری رہے گا اور لوگ اس میں کچھ فرق محسوس نہیں کریں گے یہاں تک کہ ایک دن جب سورج عرش کے نیچے اپنی مقرہر منزل تک پہنچے گا تو اسے کہا جائے گا: بلند ہوا اور اپنے مغرب سے طلوع ہو، تو اس صبح کو سورج اپنے مغرب سے طلوع ہو گا، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ وہ کون سا دن ہو گا؟ یہ وہ دن ہو گا جس دن کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان لانا فائدہ نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان کے ساتھ

کوئی نیکی نہ کرلی تھی۔(مسلم:399: کتاب الایمان: باب 72، بخاری:3199: کتاب بدء الخلق: ب ٤)

چند اصولی باتیں اور نقاط

اس کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ جہاں تک آیت مذکورہ کی تصریح ہے اس پر اٹھائے جانے والے شبہات واشکالات میں سے قرآن پر کوئی بھی اشکال نہیں ہوتا۔اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ آفتاب کو حق تعالیٰ نے ایک ایسی منظم اور مستحکم حرکت پر لگایا ہوا ہے کہ وہ اپنے مستقر کی طرف برابر ایک حالت پر چلتا رہتا ہے۔اگر اس مستقر (ٹھکانہ) سے مراد تفسیر قتادہ کے مطابق مستقر زمانی لیا جائے، یعنی روز قیامت، تو معنی اس کے یہ ہیں کہ آفتاب کی یہ حرکت قیامت تک دائمی ایک حال پر چلتی رہے گی پھر اس روز ختم ہو جائے گی۔اور اگر مستقر مکانی مراد لیں تو بھی اس کا مستقر مدار شمسی کے اس نقطہ کو کہا جا سکتا ہے جہاں سے اول تخلیق کے وقت آفتاب نے حرکت شروع کی اسی نقطہ پر پہنچ کر اس کا شبانہ روز کا ایک دورہ مکمل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی نقطہ اس کا انتہا سفر ہے، اس پر پہنچ کر نئے دورہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ اس عظیم الشان دائرہ کا وہ نقطہ کہاں اور کونسا ہے جہاں سے آفتاب کی حرکت ابتداء آفرینش میں شروع ہوئی، قرآن کریم اس قسم کی فضول بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا جس کا تعلق اس کے کسی دینی یا دنیوی فائدے سے نہ ہو۔ یہ اسی قسم کی بحث ہے، اس لئے اس کو چھوڑ کر قرآن کریم نے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی۔ اور وہ مقصد حق تعالیٰ کی قدرت وحکمت کاملہ کے خاص مظاہر کا بیان ہے، کہ اس جہان میں سب سے بڑا اور سب سے روشن ترین کرہ آفتاب کا ہے، وہ بھی نہ خود بخود بن گیا ہے اور نہ خود بخود اس کی کوئی حرکت پیدا

ہوتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے، اور وہ اپنی اس شبانہ روز کی حرکت میں ہر وقت حق تعالیٰ کی اجازت و مشیت کے تابع چلتا ہے۔

جتنے اشکالات اٹھائے گئے ہیں آیات مذکورہ کے بیان پر ان میں سے کوئی بھی شبہ اور اشکال نہیں، البتہ احادیث مذکورہ جن میں یہ آیا ہے کہ وہ غروب کے بعد زیر عرش پہنچ کر سجدہ کرتا ہے اور اگلے دورے کی اجازت مانگتا ہے یہ سب اشکالات اس سے متعلق ہیں۔ اور اس آیت کے ذیل میں یہ بحث اس لئے چھڑی کہ حدیث کے بعض الفاظ میں اس آیت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ اس کے جوابات محدثین و مفسرین حضرات نے مختلف دیئے ہیں، ظاہر الفاظ کے اعتبار سے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ آفتاب کا یہ سجدہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ بعد الغروب ہوتا ہے، جن حضرات نے حدیث کو اسی ظاہری مفہوم پر محمول کیا ہے انہوں نے غروب کے متعلق تین احتمال بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ معظم معمورہ کا غروب مراد ہو، یعنی اس مقام کا جہاں کے غروب پر اکثر دنیا کی آبادی میں غروب ہو جاتا ہے، یا خط استواء کا غروب، یا افق مدینہ کا غروب۔ اس طرح یہ اشکال نہیں رہتا کہ آفتاب کا غروب و طلوع تو ہر وقت ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں ایک خاص افق کے غروب پر کلام کیا گیا ہے، لیکن صاف و بے غبار جواب وہ معلوم ہوتا ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقالے ''سجود الشمس'' میں اختیار فرمایا ہے، اور متعدد ائمہ تفسیر کے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے سمجھنے سے پہلے پیغمبرانہ تعلیمات و تعبیرات کے متعلق یہ اصولی بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ آسمانی کتابیں اور اس کے لانے والے انبیاء (علیہم السلام) خلق خدا کو آسمان و زمین کی مخلوقات میں غور و فکر اور تدبر کی طرف مسلسل دعوت دیتے ہیں، اور ان سے اللہ تعالیٰ کے وجود، توحید، علم و قدرت پر استدلال

کرتے ہیں، مگر ان چیزوں میں تدبیر اسی حد تک مطلوب شرعی ہے جس حد تک اس کا تعلق انسان کی دنیوی اور معاشرتی ضرورت سے یا دینی اور اخروی ضرورت سے ہو۔ اس سے زائد نری فلسفیانہ تدقیق اور حقائق اشیاء کے کھوج لگانے کی فکر میں عام خلق اللہ کو نہیں ڈالا جاتا۔ کیونکہ اول تو حقائق اشیاء کا مکمل حقیقی علم خود حکماء و فلاسفہ کو بھی باوجود عمریں صرف کرنے کے نہیں ہو سکا، بیچارے عوام تو کس شمار میں ہیں، پھر اگر وہ حاصل بھی ہو جائے اور اس سے نہ ان کی کوئی دینی ضرورت پوری ہو اور نہ کوئی صحیح مقصد دنیوی اس سے حاصل ہو تو اس لایعنی اور فضول بحث میں دخل دینا اضاعت عمر اور اضاعت مال کے سوا کیا ہے۔

قرآن اور انبیاء کا استدلال آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان کے تغیرات و انقلابات سے صرف اس حد تک ہوتا ہے جو ہر انسان کو مشاہدہ اور ادنیٰ غور و فکر سے حاصل ہو سکے۔ فلسفہ اور ریاضی کی فنی تدقیقات جو صرف حکماء و علماء ہی کر سکتے ہیں نہ ان پر استدلال کا مدار رکھا جاتا ہے نہ ان میں غور و خوض کی ترغیب دی جاتی ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ پر ایمان اور اس کے پیغام پر عمل ہر انسان کا فرض ہے۔ عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، کسی پہاڑ اور جزیرہ میں رہتا ہو یا کسی متمدن شہر میں، اس لئے پیغمبرانہ تعلیمات عوام کی نظر اور ان کی عقل و فہم کے مطابق ہوتی ہیں جن میں کسی فنی مہارت کی ضرورت نہ ہو۔

نماز کے اوقات کی پہچان، سمت قبلہ کا متعین کرنا، مہینوں اور سالوں اور تاریخوں کا ادراک، ان سب چیزوں کا علم ریاضی کے حسابات کے ذریعہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، مگر شریعت اسلام نے ان میں سے کسی چیز کا مدار ریاضی کی فنی تحقیقات پر رکھنے کے بجائے عام مشاہدات پر رکھا ہے۔ مہینے اور سال اور ان کی تاریخیں قمری حساب سے رکھیں اور چاند کے ہونے نہ ہونے کا مدار صرف رویت ہلال اور مشاہد پر رکھا۔ روزے اور حج کے ایام اسی بنیاد سے متعین کئے گئے۔ چاند کے گھٹنے، بڑھنے، چھپنے اور پھر طلوع ہونے کا راز

بعض لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا، تو اس کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ قل ھی مواقیت للناس والحج، یعنی آپ کہہ دیں کہ چاند کے یہ سب تغیرات اس مقصد کے لئے ہیں کہ تم ان سے مہینے کا شروع اور ختم اور اس کی تاریخیں معلوم کر کے حج وغیرہ کے دن متعین کر سکو۔ اس جواب نے ان کو اس پر تنبیہ فرمادی کہ تمہارا سوال لایعنی اور فضول ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنے پر تمہارا کوئی کام دین یا دنیا کا اٹکا ہوا نہیں، اس لئے سوال اس چیز کا کرو جس کا تعلق تمہاری دینی و دنیوی ضرورت سے ہو۔

حدیث میں مذکور آیت کا سیاق وسباق

اس تمہید کے بعد اصل معاملہ پر غور کیجئے، کہ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے چند مظاہر کا ذکر کر کے انسان کو اللہ کی توحید اور علم و قدرت کاملہ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اس میں سب سے پہلے زمین کا ذکر کیا، جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے (آیت) وایۃ لھم الارض، پھر اس پر پانی برسا کر درخت اور نباتات اگانے کا ذکر کیا، جو ہر انسان دیکھتا اور جانتا ہے، احیینا ھاالایۃ۔ اس کے بعد آسمان اور فضائے آسمانی سے متعلق چیزوں کا ذکر شروع کر کے پہلے سے لیل و نہار کے روزانہ انقلاب کا ذکر فرمایا (آیت) وایۃ لھم الیل الآیۃ، اس کے بعد سورج اور چاند جو سیارات وانجم میں سب سے بڑے ستارے ہیں ان کا ذکر فرمایا۔ ان میں پہلے آفتاب کے متعلق فرمایا والشمس تجری لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم، اس میں غور کیجئے کہ مقصد اس کا یہ بتلانا ہے کہ آفتاب خود بخود اپنے ارادے اور اپنی قدرت سے نہیں چل رہا بلکہ یہ ایک عزیز و علیم یعنی قدرت والے اور جاننے والے کے مقرر کردہ نظام کے تابع چل رہا ہے۔

حدیث کے بیان کی حقیقت

1. آنحضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غروب آفتاب کے قریب حضرت ابوذر غفاری کو ایک سوال وجواب کے ذریعہ اسی آیت میں مذکور حقیقت پر متنبہ ہونے کی ہدایت فرمائی، جس میں بتلایا کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد عرش کے نیچے اللہ کو سجدہ کرتا ہے اور پھر اگلا دورہ شروع کرنے کی اجازت مانگتا ہے، جب اجازت مل جاتی ہے تو حسب دستور آگے چلتا ہے، اور صبح کو جانب مشرق سے طلوع ہو جاتا ہے۔اس کا حاصل اس سے زائد نہیں کہ آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت عالم دنیا میں ایک نیا انقلاب آتا ہے، جس کا مدار آفتاب پر ہے۔رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس انقلابی وقت کو انسانی تنبیہ کے لئے موزوں سمجھ کر یہ تلقین فرمائی کہ آفتاب کو خود مختار اپنی قدرت سے چلنے والا نہ سمجھو، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اذن ومشیت کے تابع چل رہا ہے۔اس کا ہر طلوع وغروب اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتا ہے، یہ اس کی اجازت کے تابع ہے، اس کے تابع فرمان حرکت کرنے ہی کو اس کا سجدہ قرار دیا گیا۔کیونکہ سجدہ ہر چیز کا اس کے مناسب حال پر ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن نے خود تصریح فرمادی ہے کل قد علم صلوتہ وتسبیحہ، یعنی ساری مخلوق اللہ کی عبادت اور تسبیح میں مشغول ہے، مگر ہر ایک کی عبادت وتسبیح کا طریقہ الگ الگ ہے، اور ہر مخلوق کو اس کی عبادت وتسبیح کا طریقہ سکھلا دیا جاتا ہے۔جیسے انسان کو اس کی نماز وتسبیح کا طریقہ بتلادیا گیا ہے، اس لئے آفتاب کے سجدہ کے یہ معنی سمجھنا کہ وہ انسان کے سجدہ کی طرح زمین پر ماتھا ٹیکنے ہی سے ہوگا صحیح نہیں۔قرآن کے مطابق پہاڑ اور درخت بھی سجدہ کرتے ہیں مگر ہم نے انہیں کبھی اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جاتے نہیں دیکھا۔ساری کائنات میں انسان اور جن ہی مکلف مخلوق ہیں اور انھیں کو قوت ارادہ واختیار دیا گیا ہے باقی مخلوق تکوینی طور پر اللہ کے حضور ہر وقت سجدہ ریز رہتی ہے اور ان کے سجدہ کا

مطلب یہ ہے کہ جس کام پر اللہ نے انھیں لگا دیا ہے یا جو خدمت ان کے ذمہ کر دی ہے اور جو قوانین ان کے لئے مقرر کر دیئے ہیں ان سے وہ سر مو تجاوز نہیں کرتے

2 . قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق عرش خداوندی تمام آسمانوں، سیاروں، زمینوں پر محیط ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ آفتاب ہر وقت ہر جگہ زیر عرش ہی ہے۔ اور جبکہ تجربہ شاہد ہے کہ آفتاب جس وقت ایک جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہے، اس لئے اس کا ہر لمحہ طلوع وغروب سے خالی نہیں، تو آفتاب کا زیر عرش رہنا بھی دائمی ہر حال میں ہے، اور غروب وطلوع ہونا بھی ہر حال میں ہے۔ اس لئے حاصل مضمون حدیث کا یہ ہوا کہ آفتاب اپنے پورے دورے میں زیر عرش اللہ کے سامنے سجدہ ریز رہتا ہے، یعنی اس کی اجازت اور فرمان کے تابع حرکت کرتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح قریب قیامت تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کی بالکل قریبی علامت ظاہر کرنے کا وقت آجائے گا، تو آفتاب کو اپنے مدار پر اگلا دورہ شروع کرنے کی بجائے پیچھے لوٹ جانے کا حکم ہو جائے گا، اور وہ پھر مغرب کی طرف سے طلوع ہو جائے گا۔ اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، کسی کا ایمان وتوبہ اس وقت مقبول نہیں ہو گا۔

3 . خلاصہ یہ ہے کہ غروب آفتاب کی تخصیص اور اس کے بعد زیر عرش جانے اور وہاں سجدہ کرنے اور اگلے دورے کی اجازت مانگنے کے جو واقعات اس روایت میں بتلائے گئے ہیں وہ پیغمبرانہ موثر تعلیم کے مناسب بالکل عوامی نظر کے اعتبار سے ایک تمثیل ہے۔ نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ انسان کی طرح زمین پر سجدہ کرے، اور نہ سجدہ کرنے کے وقت آفتاب کی حرکت میں کچھ وقفہ ہونا لازم آتا ہے۔ اور نہ یہ مراد ہے کہ وہ دن رات میں صرف ایک ہی سجدہ کسی خاص جگہ جا کر کرتا ہے، اور نہ یہ کہ وہ صرف غروب کے بعد تحت العرش ہو جاتا ہے۔ مگر اس انقلابی وقت میں جبکہ سب عوام یہ دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب ہم سے

غائب ہو رہا ہے اس وقت بطور تمثیل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ در حقیقت آفتاب کے زیر عرش تابع فرمان چلنے رہنے سے ہو رہا ہے، آفتاب خود کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتا، تو جس طرح اس وقت اہل مدینہ اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب آفتاب سجدہ کر کے اگلے دورے کی اجازت لے گا اس طرح جہاں جہاں وہ غروب ہوتا جائے گا سب کے لئے ہی سبق حاصل کرنے کی تلقین ہو گئی اور حقیقت معاملہ یہ نکلی کہ آفتاب اپنے مدار پر حرکت کے درمیان ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ بھی کرتا ہے اور آگے چلنے کی اجازت بھی مانگتا رہتا ہے، اور اس سجدہ اور اجازت کے لئے اس کو کسی سکون اور وقفہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس تفصیل پر حدیث مذکورہ میں نہ مشاہدات کی رو سے کوئی شبہ ہوتا ہے نہ قواعد ہیئت و ریاضی کے اعتبار سے اور نظام شمسی اور حرکت سیارات میں بطلیموسی تحقیق صحیح ہو یا فیثا غورث والی تحقیق جو آج کل نئی تحقیقات سے موید ہو گئی ہے، دونوں صورتوں میں حدیث مذکورہ پر کوئی شبہ اور اشکال باقی نہیں رہتا۔

رہا یہ سوال کہ حدیث مذکور میں جو آفتاب کا سجدہ کرنا اور اگلے دورے کی اجازت طلب کرنا مذکور ہے، یہ کام تو حیات اور علم و عقل کا ہے، آفتاب و ماہتاب بے جان بے شعور مخلوقات ہیں، ان سے یہ افعال کیسے صادر ہوئے؟ تو اس کا جواب قرآن کی آیت وان من شئ الا یسبح بحمدہ کے تحت میں ہے

)ترجمہ: ساتوں آسمان اور زمین اور ان کی ساری مخلوقات اس کی پاکی بیان کرتی ہیں، اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم لوگ ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔ (سورۃ الاسراء آیت 44(

کہ ہم جن چیزوں کو بے جان اور بے عقل و بے شعور سمجھتے ہیں، وہ بھی درحقیقت روح اور جان اور عقل و شعور کا ایک خاص حصہ رکھتے ہیں، البتہ ان کی حیات اور عقل و شور انسان وحیوان کے مقابلہ میں کم اور اتنی کم ہے کہ عام احساسات اس کا ادراک نہیں کر سکتے، مگر اس کی نفی پر بھی کوئی شرعی یا عقلی دلیل موجود نہیں اور قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں ان کا ذی حیات اور ذی عقل و شعور ہونا ثابت کر دیا ہے، اور نئی تحقیقات نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔

ایک مشہور سابقہ منکر حدیث اس حدیث پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں اگر ہم رات کے دس بجے پاکستان ریڈیو سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے نیچے سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ دیں۔(دو اسلام ص ۳۲۴) کیا ہم دن کے بارہ بجے ریڈیو سے یہ آیت دنیا کو سنائیں اور کہیں کہ اس وقت سورج سجدہ میں پڑا ہوا ہے، اور ہمالیہ پہاڑ بھی سجدہ میں پڑا ہوا ہے، درخت بھی سجدہ کر رہے ہیں تو بھی کوئی ہنسے گا یا نہیں۔؟ صاحب نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس طرح ہم سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح تمام مخلوق سجدہ کرتی ہے، یہی اصلی غلط فہمی ہے۔حالانکہ ہر ایک مخلوق کی نماز، تسبیح، سجدہ علیحدہ علیحدہ ہے، اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہےُ ترجمہ: ہر چیز اپنی نماز اور تسبیح کو جانتی ہے۔(سورت نور(

قرآن وحدیث کی مذکورہ تصریحات سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوئی کہ شمس و قمر دونوں متحرک ہیں۔ ایک میعاد کے لئے چل رہے ہیں جدید سائنسی نظریات بھی آفتاب کی حرکت کو تسلیم کرتے ہیں کہ سورج مرکز ہونے کے باوجود اپنی فیملی (سیاروں) کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ حدیث میں اصل حقیقت کی طرف ذہنوں کو موڑنے کے لیے استعارہ (Metaphor) کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مقصود یہ واضح

کرنا ہے کہ سورج اپنی ضیا پاشیوں کے بعد جن نظروں سے غائب ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کے زیر اقتدار ہی رہتا ہے اور اس کے اس قانون کی تابعداری کرتے ہوئے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اللہ ہی کے آگے جھکا ہوا ہے۔ جو لوگ بات کو اس کے محل پر رکھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ الفاظ کو پکڑ کر بحثیں کھڑی کر دیتے ہیں اور نافہمی کی بنا پر حدیث ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔

19

کائنات محدود یا لا محدود؟

کائنات کے محدود یا لا محدود ہونے کا مسئلہ بہت ہی عجیب ہے۔ سب سے پہلے لا محدود ہونے کا مطلب سمجھ لیا جائے تو بات کرنے میں آسانی ہو۔

جب ہم کہتے ہیں کہ کائنات لا محدود ہے، یا محدود ہے تو سوال ہو گا کہ اسے محدود یا لا محدود کن معانی میں کہا جا رہا ہے؟

دو باتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ آیا کائنات قدیم اور زمانی لحاظ سے محدود یا لا محدود ہے؟

یا پھر یہ کہ کائنات مکانی اعتبار سے محدود یا لا محدود ہے؟

پھر یہ بھی سمجھ لینا بہتر ہے کہ محدود اور لا محدود کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

ایک لا محدود یا لا متناہی وہ ہوتا ہے جو ہم اپنی عام زندگی میں محاوراتی مفاہیم میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسے سمندر کا پانی لا محدود ہے، سورج کی روشنی لا محدود ہے۔ یا پھر ماں کی محبت لا محدود یا متناہی ہے، علی ہذا القیاس۔

لیکن درست بات یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں اس لا محدود یا لا متناہی کا مطلب ''بہت زیادہ'' ہوتا ہے۔ اور یہ ''بہت زیادہ'' چاہے کتنا ہی زیادہ ہو، کبھی لا محدود نہیں ہو سکتا۔

لا محدودیت کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کسی بھی محدود شمارِ عدد میں سما نہ سکتا ہو۔

اس کا مطلب کیا ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی نمبر، چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو لیکن ہو گا محدود ہی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کو کتنا وقت کسی ایک نمبر کو لکھنے کے لیے درکار ہے۔ پھر ریاضیاتی لا محدود اور فی الواقع لا محدود کے فرق کو ملحوظِ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً ایک لا محدود وہ ہے جو repeating decimal کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک تقسیم تین (3/1) کا جواب ....0.3333 اس میں تین کی تعداد لا محدود ہے، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ یہ سارے تین جمع ہو کر بھی کبھی 0.4 نہیں بن سکتے۔

اسی طرح نیچرل یا ہول نمبر کے سیٹس کی لامحدودیت (1,2,3,4,5....)۔ یہ نمبرز گنتے جائیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ البتہ واقعہ میں لامحدودیت جیسی کوئی چیز اس مادی کائنات میں تصور کی نہیں جاسکتی۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی بہت بڑا نمبر فرض کر لیا جائے، مثلاً:

^10^1070

یہ نمبر شاید اتنا بڑا ہے کہ آپ اور آپ کی آنے والی نسلیں بھی نہ لکھ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود مطلقاً لامحدود نہیں ہے۔

لامحدود کا ایک اور مطلب بھی ہے۔ یعنی کسی چیز کا طبیعیاتی قوانین سے آزاد ہونا۔ اس پر آگے بات کرتے ہیں۔

بہرحال، زیادہ تفصیلی ریاضی میں جانے کا محل نہیں۔ لامحدود کے حوالے سے جو میرا مدعا تھا وہ عرض کر دیا ہے۔ اب آگے بڑھتے ہیں۔

تاحال جو کچھ ہم کائنات کے بارے میں جانتے ہیں اس میں پہلے سوال کا جواب تو واضح طور پر موجود ہے کہ کائنات زمانی اعتبار سے محدود ہے۔ یہ سائنسی توجیہہ ہے۔ بگ بینگ یا ابتدائے کائنات کا زمانہ تقریباً بارہ سے چودہ ارب سال پہلے کا ہے۔ یعنی کائنات کی موجودہ عمر تقریباً چودہ ارب سال ہے۔ اب چودہ ارب سال کا اندازہ آپ کس طرح لگائیں گے؟ اس کا دار و مدار تو آپ پر ہی ہے لیکن میں تھوڑی سی مدد کر دیتا ہوں۔ حضرت مسیح کو دو ہزار سال ہو گئے ہیں۔ اور چودہ ارب کے اندر ستر لاکھ مرتبہ دو ہزار آتا ہے۔

اس کے بر عکس کائنات کے رقبے کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔ تاحال اس پر کوئی واضح بات سامنے نہیں ہے۔ لیکن اس حوالے سے قیاس ضرور کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بات تو یقینی ہے کہ کائنات اپنی ''وسعت'' میں لامحدود نہیں ہو سکتی۔ اس کے پیچھے سائنسی اور فلسفیانہ وجوہات ہیں۔

یہاں آکر لامحدود کا وہ آخری مطلب بھی سمجھ لیجیے۔

ہم جانتے ہیں کہ کائنات کے اندر طبیعیاتی قوانین موجود ہیں۔ اور ان کا اصل دار و مدار زمان و مکان (Space and Time) پر ہے۔ چنانچہ ایسی جگہ، جو زمان و مکان کے ان اصول سے آزاد ہو گی اس پر طبیعیاتی قوانین لاگو نہیں ہو سکیں گے۔ نتیجتاً وہاں سائنس کا کوئی بھی پیمائشی نظام لاگو نہیں ہو سکتا، اس لیے چاہے ایسی کوئی جگہ ایک ملی میٹر جتنی بھی ہو، اسے لامحدود کہا جاسکے گا۔ اب کائنات کے اندر رہتے ہوئے چونکہ ایسا ممکن نہیں، چنانچہ مکمل کائنات، باوجود اپنی تمام تر وسعت کے، قابل پیمائش ہی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اسے ناپنے کے لیے کتنی ترقی، کتنے وسائل اور کتنا وقت درکار ہو گا۔ لیکن کائنات کا رقبہ یا حجم یا جس شکل میں بھی کائنات ہے، وہ لامحدود نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کا لامحدود ہونا عقلی طور پر ہی بعید از قیاس ہے۔

ڈاکٹر مزمل شیخ بسمل

20

تقدیر کیا ہے؟!!

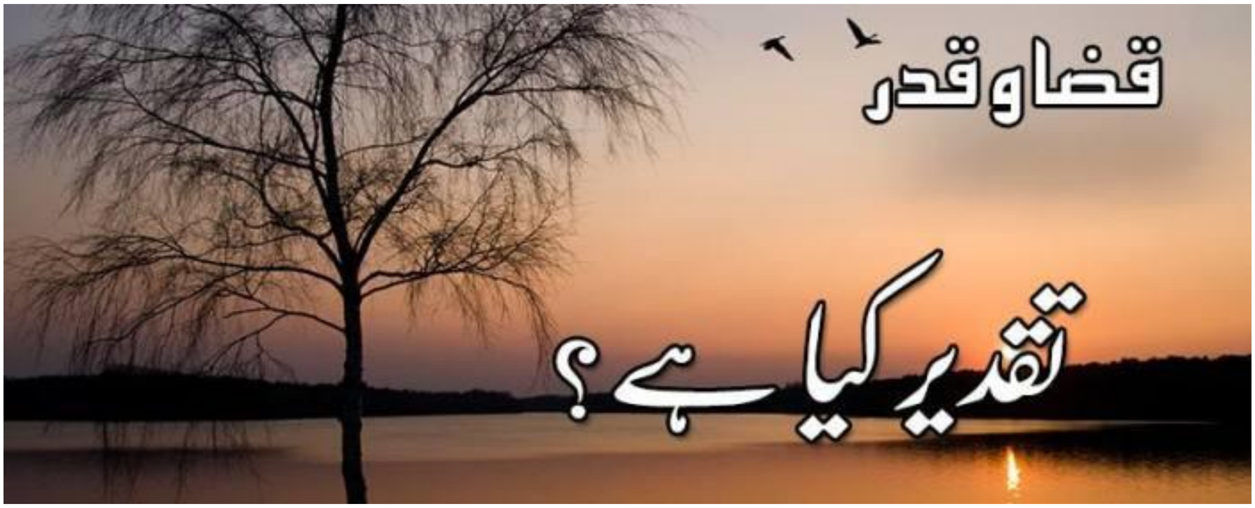

اس سوال سے پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ انسان کہاں تک آزاد اور کس جگہ مجبور ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ انسان آزاد ارادہ رکھتا ہے تو اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ انسان ہر طرح کے ارادے میں آزاد اور کسی بھی طرح مجبور نہیں ہے۔ اگر انسان کو مکمل طور پر آزاد مان لیا جائے تو تقدیر کا انکار ہوتا ہے۔ اور اگر بالکل مجبور مان لیا جائے تو آزادی سے کسی عمل کے اختیار کرنے پر سوالیہ نشان اٹھتا ہے، جو سزا اور جزا کے سارے معاملے کو بے معنی کر دیتا ہے۔

معتدل قول یہ ہے کہ انسان نہ مختارِ کل ہے نہ مجبورِ محض۔ دیکھنا یہ ضروری ہے کہ انسان کہاں کہاں اختیار رکھتا ہے اور کہاں مجبور ہے۔

کچھ چیزیں انسان کے اختیار میں بالکل نہیں۔ مثلاً: اس کا رنگ و نسل، پیدائش کا وقت، موت کا وقت اور علی ہذا القیاس۔ یہاں انسان بالکل مجبور ہے اور وہ یہ کبھی بھی طے نہیں کر سکتا کہ اسے کب پیدا ہونا چاہیے، کس رنگ و نسل کا ہونا چاہیے وغیرہ۔

اکثر معاملات ایسے ہیں جہاں انسان کا اختیار ہے۔ جیسے کھانا، پینا، بھاگنا، دوڑنا، اچھلنا، کودنا، حرکت کرنا وغیرہ۔ یا جو بھی ایسی حرکات ہیں جو بالارادہ ہوں وہ انسان کے کافی حد تک اختیار میں ہوتی ہیں۔ یہاں کافی حد تک اختیار کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بعض حالات میں انسان کی حرکات کچھ ارادی اور کچھ غیر ارادی کا مرکب ہوتی ہیں۔، یا پھر ان دونوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ اب چونکہ یہ موضوع بہت حساس ہے اس لیے میں زیادہ تفصیلی طور پر نہیں لیکن تقدیر کے حوالے سے ایک خاکہ بنانے کی کوشش کروں گا۔

تقدیر کائنات میں رونما ہونے والے مجموعی مظاہر، اور انسانوں کے مجموعی اکتساب کا اوسط نتیجہ ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اکتساب ہمارے کُلی اختیار میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں صرف کسب کا اختیار مکمل طور پر حاصل ہے۔ اور سزا و جزا کا معاملہ دراصل اسی کسب کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔ اس کسب کے نتیجے میں اگر شر وجود میں آئے گا تو سزا اور خیر کا حاصل جزا ہو گی۔

یہاں ایک بنیادی نکتہ یہ سمجھ لیجیے کہ کسب کا نتیجہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ جس خیر کے کام کے لیے کسب کیا جا رہا ہو وہ پوری زندگی کی محنت کے بعد بھی حاصل نہ ہو پائے۔ اور جس شر کے لیے کسب کیا جا رہا ہو اس کا حصول بھی ممکن نہ ہو پائے۔ تاہم جو بھی نتیجہ اس کسب کے ذریعے نکلے گا اسی کے لائق حساب و کتاب ہو گا۔

اس کے بعد تقدیر کے کئی مدارج ہیں جس میں انسان اپنے گھر، خاندان، ماحول، محلہ، علاقہ، آب و ہوا، شہر اور ملک کے حساب سے مجبور ہوگا۔ مثلاً کچھ مجبوریاں گھریلو ہوتی ہیں جن کے خلاف انسان کسی خاص وقت میں کوئی خاص کام نہیں کر سکتا۔ (خاص وقت سے مراد یہ ہے کہ گھریلو حالات بدلنے پر ممکن ہے وہ کام ممکن ہو جائے)۔

اسی طرح بعض حدود خاندان اور کسی خاص رنگ و نسل میں پیدا ہونے کی وجہ سے، یا کسی خاص علاقے، شہر یا خطے میں رہنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی پورے علاقے کا حالتِ قحط میں ہونا، یا کسی ایک علاقے کا حالتِ غلامی میں ہونا۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت پر لاگو ہوتی ہیں۔ اور وہ ایک انسان کی جگہ سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی بیک وقت ''مشترکہ تقدیر'' ہوتی ہیں۔ مشترکہ تقدیر سے مراد یہ ہے کہ ان سب میں ہر کوئی اپنی اپنی حدود میں اپنی اس حالت میں مجبور بھی ہوتا ہے۔ اور اجتماعی طور پر ہر شخص اپنی اس حالت کا ذمہ دار بھی۔

اسی کو مزید آگے بڑھا لیجیے تو ایک تقدیر پوری دنیا کے انسانوں کے لیے بھی مشترک ہو سکتی ہے، جیسے کرنسی اور سکّہ اس میں کوئی بھی خاص ملک یہ اختیار نہیں رکھتا کہ اپنے ملک سے کرنسی کا نظام ختم کر دے۔ کیونکہ انسانیت نے اسے مجموعی طور پر قبول کر لیا ہے۔ اور اس فیصلے کی بنیاد پر کوئی انسان اگر اس معاشرے کا حصہ رہنا چاہتا ہے تو اسے اپنی تقدیر میں اس کرنسی کے نظام کو قبول کرنا ہوگا۔ بصورتِ دیگر اسے انسانوں کے معاشرے سے علیحدگی اختیار کرنی پڑے گی۔

دراصل دنیاوی معاملات میں انسان کی جو جو معاشرتی مجبوریاں ہیں ان میں ہر کوئی ایک دوسرے کا مقروض اور سب آپس میں ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ میں اکیلا جن حرکات کا مرتکب ہوتا ہوں اس کا اثر میرے آس پاس ایک وسیع رقبے پر بھی پڑ سکتا ہے۔ علت و معلول میں بندھی اس دنیا میں جہاں ہم سب کی انفرادی طور پر کوئی حیثیت نہیں وہیں جب ہماری انفرادی حرکات جمع ہو کر اجتماعی شکل اختیار کرتی ہیں تو اس سے ایک پورے حالات کا مجموعہ وجود میں آتا ہے جس میں ہر ایک شخص کا عمل گنا جا رہا ہوتا ہے۔ اور وہ حالات ہر ایک کے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

کسب یا اکتساب کیا ہے ؟

میں گزشتہ قسط میں لکھ چکا ہوں کہ کسب انسان کے اختیار میں ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اختیار میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی حالات میں ایک ہی جیسے اسباب اور قابلیت رکھنے والے دو لوگوں کے مراتب مختلف ہو جاتے ہیں۔ زیادہ قابلیت والے لوگ پیچھے بھی رہ جاتے ہیں، کم قابلیت رکھنے والے نااہل لوگ آگے بھی نکل جاتے ہیں۔ ایک انسان سارا دن محنت کر کے بھی پانچ سو روپے کماتا ہے۔ اور دوسرا بغیر محنت کیے بھی پانچ ہزار روزانہ کما لیتا ہے۔ سب وسائل موجود ہونے کے باوجود کہیں چوری نہیں ہو پاتی۔ اور بعض اوقات ساری احتیاطی تدابیر کے بعد بھی چوری ہو جاتی ہے۔

دراصل اس کی تین وجوہات ہیں۔

پہلی: مناسب اسباب کا موجود ہونا

دوسری: صحیح وقت کا ہونا

تیسری: کسب کا حالات سے مطابقت میں ہونا جب یہ تین چیزیں جمع ہو جائیں تو جو بھی کسی نتیجے کے کسب میں اس وقت مصروفِ عمل ہو گا اور اس کا کسب حالات سے مطابقت میں ہو گا، اسی کے ہاتھوں وہ کام سرزد ہو جائے گا۔ اگر کسی جگہ چوری ہونی ہے تو جو بھی انسان مناسب اسباب کی موجودگی میں صحیح وقت پر درست تدبیر کے ساتھ چوری کی جگہ پر پہنچ جائے گا اسی کے ہاتھوں چوری ہو جائے گی۔

حصولِ نتائج کے مزید چار مدارج ہیں:

پہلا: جس میں انسان کسی چیز کی خواہش کرے اور اسے مطلوب حاصل ہو جائے۔

دوسرا: جس میں انسان مناسب کسب کی صورت میں مطلوب حاصل کر لے۔

تیسرا: جس میں انسان بہت مشقت اور سخت محنت کر کے مطلوب حاصل کرے۔

چوتھا: تمام محنت و مشقت اور ہر تدبیر کے باوجود مطلوب حاصل نہ ہو سکے۔

یہاں تک آتے آتے ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ کسب کا اختیار انسان رکھتا ہے۔ نتیجہ انسان کے اختیار میں نہیں ہو سکتا۔

تقدیر میں نتیجے طے کیے جاتے ہیں، کسب کی صورت طے نہیں ہوتی۔۔۔!!

اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر خدا کی ذات غیب اور ماضی، مستقبل اور حال سب کا علم رکھتی ہے تو پھر انسان کو اختیار کیسا؟

پوچھنے والوں کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر خدا ہمارے مستقبل کے بارے میں پہلے ہی ہر چیز سے آگاہ ہے تو انسان کی آزاد مرضی (Free will) کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔اس سے جبر لازم آتا ہے۔مثال کے طور پر اگر خدا کے علم میں ہے کہ میں اگلے گھنٹے چوری کرنے والا ہوں تو مجھ پر یہ لازم ہے کہ میں چوری کروں، کیونکہ میرے پاس اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔اور اگر میں چوری نہیں کرتا تو خدا کے علم میں نقص یا عیب ثابت ہو گا۔حالانکہ اس کے علم کا بے عیب ہونا بھی مانا جا چکا ہے۔تو اب میرے لیے بجز چوری کے ،اور کوئی دوسری صورت باقی نہیں ہے۔اس حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر انسان مجبور محض ہے تو پھر سزا اور جزا کا کوئی سلسلہ کیوں رکھا گیا ہے؟

میں اپنی پچھلی تفصیلی پوسٹ، جو علتِ اولی کے حوالے سے تھی، عرض کر چکا ہوں کہ ان اعتراضات کی حیثیت دراصل فلاسفہ کے درمیان اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ فلسفیانہ اعتراضات ہیں۔جو دراصل یہ حل نکالنے کے لیے کیے جاتے ہیں کہ آیا کوئی ایسی ہستی ممکن بھی ہے جو ہر چیز کا کلی علم رکھتی ہو، اور بے عیب ہو۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسب پر انسان اختیار رکھتا ہے۔اور سزا و جزا کا سارا معاملہ اسی کسب سے وجود میں آتا ہے کہ اس کے ذریعے نتیجہ شر کی صورت میں نکلتا ہے یا خیر کی۔تاہم خدا کی ذات چونکہ عالمِ غیب ہے اس لیے وہ ہر ایک چیز کی طرف نظر رکھتی ہے۔اور وہ جانتی ہے کہ کون کس وقت کیا کر رہا ہے۔یہاں یہ سمجھ لیجیے کہ عالمِ غیب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا مستقبل کا علم رکھتا ہے۔بلکہ یہ ہے کہ خدا ہر اس چیز کا علم رکھتا ہے جس کا کا ہم سے پردہ ہے۔یہ پردہ وسائل کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے، زمانے کی شکل میں بھی اور اسباب کی شکل میں بھی۔ایسی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم ان چار جہات (تین جہاتِ مکان جمع وقت بطور چوتھی

جہت) میں قید رہتے ہوئے نہ تو سمجھ سکتے ہیں نہ ان تک ہمارا درست قیاس پہنچ سکتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی سوچ میں کسی بھی واقعے کی تقدیم وتاخیر کے اوراسی وجہ سے علت و معلول کے پابند ہیں۔جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جو میں "کل" کرنے والا ہوں وہ خدا تعالی کی ذات "آج" ہی جانتی ہے اس لیے مجھ پر جبر لازم آیا، وہ یا تو ناواقف ہیں یا بھول جاتے ہیں کہ خدا تعالی کی ذات کا زمانے سے بالا تر ہونا لازم ہے۔اس لیے خدا کے لیے نہ کوئی کل ہے نہ آج ہے۔ بلکہ وہ ایسے مقام پر موجود ہے جہاں طبیعات کے سارے قوانین ٹوٹ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً گزشتہ کل اور آنے والا کل، یا گزشتہ سال اور صدی اور آنے والے سال اور صدی کسی معنی کے حامل نہیں ہیں۔زیادہ سے زیادہ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہم کشادگیٔ زمان (Time Dilation) تھیوری سے تھوڑی مدد لے سکتے ہیں، جس کے مطابق یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جگہ پر جو عرصہ پچاس سال کے برابر ہو دوسری کے لیے وہی عرصہ صرف بیس سال کے برابر ہو۔ تو مدعا یہ ہے کہ ہم زمانے کی قید سے آزاد ہو کر سوچ نہیں سکتے۔اور خدا کے لیے زمانہ خود ایک تخلیق ہے جو اسے قید نہیں رکھتی۔اس صورت میں علت و معلول، تقدیم وتاخیر، پہلے اور بعد، آج اور کل کی کوئی حیثیت نہیں۔اور جب ان کی کوئی حیثیت نہیں تو ممکن ہے کہ ہمارے آج اور کل، ہمارا جینا اور مرنا وغیرہ یا پہلے سے آخری انسان تک پوری انسانیت کی ابتدا اور انتہا اور سورج اور دوسرے ستاروں کا بجھ جانا، کائنات کا بننا اور تباہ ہو جانا، سب کچھ بیک وقت ہی خدا کی ذات کے سامنے رونما ہو رہا ہے۔ایسے میں ہمارا کسبِ آئندہ خدا کی نظر کے سامنے تو ہے لیکن اس کے جبر کا پابند نہیں بلکہ اسکی مشیت کی وجہ سے آزاد ہے۔

آخری بات جس پر میں گفتگو کا اختتام کرتا ہوں وہ یہ کہ الہیات میں ہر چیز کی منطقی توجیہہ اگر ممکن نہ بھی ہو تو یہ اس کے غلط ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم جس مطابقت کی دنیا میں رہ کر یہ مسائل حل کرنے کی

کوشش کرتے ہیں وہ تمام قوانین وہاں لائقِ اطلاق نہیں ہوتے جس کی بنیاد پر ہم الجھتے اور سلجھتے رہتے ہیں۔ یہی بات منطقی تضادات کی وجہ بنتی ہے اور غلط استدلال تک لے جاتی ہے۔اس حوالے سے اپنی تحریر ''علتِ اولی کی بحث'' میں تفصیلی بات کر چکا ہوں۔

تحریر مزمل شیخ بسمل

21

انسان مجبور یا بااختیار؟ مثنوی مولانا روم

مولانا روم نے اپنی مشہور کتاب مثنوی میں جس طرح تقدیر کے پیچیدہ مسئلہ کو اشعار (فارسی) میں بیان فرمایا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی. طرز بیان بہت دل آویز ہے اور طریق استدلال ایسا عجیب و غریب کہ دل میں اثر کرتا چلا جاتا. احباب کی خدمت میں مولانا ے روم کے ان اشعار کا ترجمہ بطور ہدیہ پیش ہے.

0 .بندہ کا تردد میں ہونا خود اس کے مختار ہونے کی دلیل ہے تردد اختیاری ہی چیز میں ہو سکتا ھے تردو کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کو یہ سوچ ہے کہ میں کس جانب کو اختیار کروں۔

1 .امر و نہی اور اعزاز و اکرام کے لیے انسان کو مخصوص کر لینا اور پتھروں کو کسی قسم کا امر و نہی یا اعزاز و اکرام نہ کرنا یہ بھی دلیل ہے کہ انسان مختار ہے اور پتھر مجبور محض.

2 .دشمن پر غصہ آنا اور چھت سے اگر لکڑی گر جاے اس پر غصے کا خیال تک نہ آنا یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ آپ دشمن کو مختار اور لکڑی کو مجبور محض سمجھتے ہیں۔

3 . جبر واختیار کا مسئلہ اس قدر بدیہی ہے کہ جانور بھی اس سے بے خبر نہیں اونٹ کو اگر لکڑی مار دی جائے تو وہ بھی مارنے والے کی جانب توجہ کرتا ہے۔ لکڑی کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ کتے کو اگر پتھر مارا جاے تو وہ مارنے والے پر حملہ کرتا ھے۔ پتھر پر حملہ نہیں کرتا جس سے صاف ظاہر ہے کہ کتا اور اونٹ مارنے والے کو مختار سمجھ کر اس سے طرز کرتے ہیں اور پتھر اور لکڑی کو مجبور محض سمجھ کر اس سے کوئی تعریض نہیں کرتے۔

4 . بندہ کا یہ کہنا کہ میرا ارادہ یہ ھے کہ کل کو یہ کروں گا اور پرسوں کو یہ کروں گا۔ یہ بھی اس کے مختار ہونے کی صریح دلیل ہے.

5 . انسان کا اپنے کیے ہوے پر پشیمان اور ندامت ہونا یہ بھی اس کے مختار ہونے کی دلیل ہے.

6 . بحالت بیماری آہ زاری کرنا، اپنے کیے ہوے پر پشیمان ہونا، گناہوں سے توبہ اور استغفار کرنا۔ آیندہ کے لیے عہد و پیمان کرنا یہ اختیار کی علامتیں ہیں۔ اگر وہ معاصی قدرت و اختیار میں نہ تھے تو ان پر یہ شرم اور ندامت، حسرت و خجالت کس لیے ؟؟

7 . اگر مخلوق اور بندے کا فعل درمیان میں ہو تو پھر کسی کو ہرگز نہ کہنا چاہیے کہ تو نے یہ کام کیوں کیا۔

8 . اگر بندہ اور اجہتاد کو تقصیر میں کوئی دخل نہ ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام "ربنا ظلمنا انفسنا الخ" کہہ کر اپنی تقصیر کا اعتراف کیسے فرماتے"

9 . بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ گناہ تو قسمت اور تقدیر سے تھا۔ جب قضا ہی ایسی تھی تو ہماری احتیاط کیا نفع دیتی"۔

10 . قضا پر بہانہ مت رکھو اپنا جرم دوسرں پر کیوں ڈالتے ہو"۔

11 .خون تو کرے زید اور قصاص کیا جاے عمرو سے ، شراب تو پیے بکر اور حد خمر جاری ہو احمد پر۔ گناہ تو کرے آپ اپنی کوشش اور جد وجہد سے اور بہانہ رکھیں قضاو قدر پر۔

12 .تو نے کس کام میں کوشش کی تھی اس کا نتیجہ تجھ کو حاصل نہ ہوا تو نے کب کاشت کی تھی اور اس کا ثمر تجھ کو نہ ملا ہو"۔یعنی جس کام میں بھی تو نے کوشش کی اس کا نتیجہ اور ثمرہ تجھ کو ضرور ملا اسی طرح اپنے برے اور اچھے اعمال کے اخروی نتایج ثمرات کو بھی سمجھو۔

13 .جو فعل تیری جان اور تن سے پیدا ہوتا ھے وہ قیامت کے دن فرزند کی طرح تیرا دامن گیر ہو گا"۔

جس طرح دنیا میں ایک مجازی حاکم کی سزا عین عدل وانصاف ھے تو اس احکم الحاکمین کی جزا کیسے عدل اور انصاف کے خلاف ہو سکتی ھے

تمثیل:۔

1 .اے دل ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ جبر واختیار کا فرق معلوم ہو سکے۔

2 .ہاتھ کی ایک ارتعاشی اور اضطراری حرکت ھے اور ایک اختیاری اور ارادی حرکت ھے۔دونوں حرکتیں حق تعالی کی پیدا کی ہوئی ہیں مگر ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کر سکتے ہو شخص جانتا ھے کہ ارتعاشی حرکت میں بندہ کا اختیار وارادہ کو دخل نہیں۔اور جب ہاتھ کو اپنے ارادہ سے حرکت اور جنبش دی جاے تو وہ حرکت اختیاری حرکت سمجھی جاتی ھے۔

3 . یہی وجہ ھے اختیاری حرکت پر کبھی پشمانی اور ندامت ہوتی ھے مگر ارتعاشی حرکت والا کبھی نادم اور پشمان نہیں دیکھا گیا۔انسان نادم اس فعل پر ہوتا ھے کہ جس کو اپنے اختیاری وارادہ سے کیا ہو۔اضطراری فعل پر کبھی نادم نہیں ہوتا۔پس انسان کا اپنے افعال پر نادم اور پشمان ہونا اس کے مختار ہونے کی دلیل ھے۔

4 . ہماری یہ زاری دلیل اضطرار کی ھے اور شرمندگی کی دلیل اختیار کی ھے۔

5 . اگر اختیار نہ ہوتا تو یہ شرم اور حسرت اور ندامت اور ذلت کیوں ہوتی۔

6 . جس کام میں تیری خواہش ہوتی ھے اس میں اپنی قدرت اور اختیار کو خوب ظاہر دیکھتا ہے"۔

7 . اور جس کام میں تیری خواہش نہیں ہوتی اس کام میں تو جبری بن جاتا ھے اور کہتا ھے کہ یہ خدا کی جانب ھے"۔

((مثنوی دفتر اول صفحہ 54, مثنوی دفتر ششم جلد 2 صفہ 40

جب سب کچھ اللہ کی چاہت سے ہوتا ہے تو پھر بندے کو سزا کیوں ؟

قرآن میں خدا کہتا ہے کہ ''ماتشاءون الاان یشاءاللہ ''(یعنی اللہ کے چاہے بنا تم کچھ چاہ ہی نہیں سکتے)۔ معلوم ہوا انسان خدا کی چاہت کے سواء کچھ نہیں چاہ سکتا، تو پھر اعمال کی بندے کی طرف نسبت اور اسے سزا دینے کا کیا مطلب؟ نیز قرآن میں ایک جگہ آیا '(اچھائی و برائی) سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے '(قل کل من عند اللہ، نساء 78)، دوسرے مقام پر آیا'' ''تمہیں جو اچھائی پہنچتی ھے وہ اللہ کی طرف سے ھے اور جو برائی تمہیں پہنچتی ھے وہ تمہارے نفس کی طرف سے ھے ''(ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک، نساء 79)۔ یہ تو گویا کھلا تضاد بھی ہوا۔

تبصرہ:

آیات کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ انہیں سمجھنے کے لئے ''خدا کی مشیت وارادے ''اور'' خدا کے حکم و رضا ''میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جب کہا جاتا ہے کہ ''سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے ''تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز خدا کی مشیت وارادے کے تابع ہے، اچھائی ہو یا برائی ان میں سے ہر دو اپنی اثر پزیری کیلئے خدا کے ارادے، مشیت واذن ہی کی محتاج ہے، خود سے مؤثر نہیں۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ 'اچھائی اللہ کی طرف سے نیز برائی تمہارے نفس کی طرف سے ہے 'تو اسکا معنی یہ ھے کہ اللہ نے اچھائی کا حکم دیا ہے اور وہ اس پر راضی ھے لیکن برائی کرنے کا اسنے حکم نہیں اور نہ ہی وہ اس پر راضی ھے۔ چنانچہ 'اچھائی خدا کی طرف سے ھے 'کا مطلب یہ ھے کہ خدا کے حکم ورضا کے تحت ہے اور' برائی تمہارے نفس

کی طرف سے ہے "کا مطلب یہ ھے کہ خدا نے تمہیں اسکے کرنے کا حکم نہیں دیا لہذا یہ تمہارے اپنے نفس کی پسند ھے۔ پس ان آیتوں کا معنی یہ ھوا:

—اچھائی و برائی دونوں اللہ کی مشیت وارادے سے مؤثر ہیں، از خود نہیں

—اچھائی اللہ کے ارادے و مشیت کے ساتھ ساتھ اسکے حکم اور رضا سے بھی ھے

—برائی اللہ کے ارادے و مشیت سے اثر پزیر تو ھے مگر اس کے کسب میں اسکا حکم اور رضا شامل نہیں

اس بات کو سمجھنے کیلئے ایک مثال لیتے ہیں۔ ایک سپر سٹور کا تصور کریں جہاں ایک باپ اپنے بچے کے ساتھ کھڑا اپنے بچے کو ھر شے کا فائدہ اور نقصان سمجھا رھا ھے۔ پھر اپنے بچے کو اچھی طرح بتا دیتا ھے کہ فلاں فلاں چیز کے انتخاب میں میں راضی ھونگا اور فلاں فلاں میں میں ناراض ھو جاؤں گا، لہذا تم پہلی قسم کی چیز کا انتخاب کرنا اور دوسری سے بچنا۔ پھر وہ بچے کو انتخاب کا حق دے دیتا ھے۔ اب بچہ سپر سٹور میں چاھے جس بھی شے کا انتخاب کرلے ان معنی میں باپ کے ارادے و مشیت سے ھے کہ انتخاب کا یہ اختیار بذات خود باپ ہی نے دیا ھے اور اگر باپ اسے یہ اختیار نہ دے تو بچہ اچھے یا برے میں سے کسی بھی شے کی چاہت نہیں کر سکتا (ماتشاء ون الا ان یشاء اللہ کا یہی مفہوم ہے)۔ اگر بچہ وہ شے پسند کرے جس کا باپ نے حکم دیا اور جس پر وہ راضی ھے تو اب اس انتخاب میں باپ کے ارادے و مشیت کے علاوہ اسکی رضا و حکم بھی شامل ھو گیا اور اگر ایسی چیز کا انتخاب کیا جس سے باپ نے منع کیا تھا تو اس انتخاب میں اگرچہ باپ کا ارادہ و مشیت تو لامحالہ شامل حال ھو گی مگر اسکی رضا اور حکم نہیں۔

مسئلہ تقدیر کے باب سے متعلق بہت سی آیات کو سمجھنے کے لئے ''خدا کی قدرت و خدا کی سنت'' نیز ''خدا کی مشیت و خدا کی رضا'' کے فرق کو ذہن نشین رکھنا نہایت ضروری ہے، بصورت دیگر ایسے بہت سے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

23

جب اللہ کو ہر چیز کا علم تھا تو پھر ایسے لوگوں کو پیدا کیوں کیا جو جہنم میں جائیں گے ؟

جب آپ کے بقول خدا کو ماضی، حال و مستقبل سے متعلق ہر چیز کا علم ہے، تو پھر خدا کو صرف ان لوگوں کو پیدا کرنا چاہیے تھا جو کسی نہ کسی درجہ میں کامیاب ہو جاتے اور آگ سے محفوظ رہتے۔ جب اللہ کو پتہ تھا کہ فلاں فلاں اس امتحان میں فیل ہو گا تو پھر ان کا پیدا کرنا کیا معنی رکھتا ہے، یعنی جب اسے لوگوں کا ارداہ بھی معلوم تھا کہ ''وہ اپنے ارادے سے'' ایسا کریں گے تو پھر پیدا کرنا کیا معنی رکھتا ہے سواء اس کے کہ جہنم بھرنے کا سامان کیا جائے ؟

تبصرہ:

اس سوال پر گفتگو کی دو جہات ہیں،

(الف)''خدا سے بندے کی طرف''،

(ب)''بندے سے خدا کی طرف''۔

دونوں پر باری باری گفتگو کی جاتی ہے۔

(الف)خدا سے بندے کی طرف:

اس میں پہلی اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ بندہ ''خدا کی طرف سے کھڑا ہو کر'' اس معاملے کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا کیونکہ اسکے لئے اس پوزیشن پر جانا لازم ہے جو ''خدا کی پوزیشن'' (ازلی، قدیم، قائم بالذات، زمان و مکاں سے ماوراء) ہے۔ ظاہر ہے ''مخلوق بندے'' (جو کہ حادث، محتاج، زمان و مکان میں مقید و مخلوق ہے) کے لئے یہ ممکن نہیں، ان ''جہات مخلوقیت سے ماوراء'' کے بارے میں وہ جو بھی رائے قائم کرے گا ہر حال میں قیاس آرائی پر ہی مبنی ہو گا۔ یہ نہایت اہم مقدمہ ہے جسے ذرا تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ درج ذیل تصویر میں دی گئی صورت پر غور کریں۔ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں مادی اعتبار سے یہ تین جھاتی ہے (لمبائی، چوڑائی و گہرائی)۔ اب کسی ''دو جہاتی'' دنیا کا تصور کریں (جہاں اشیاء صرف لمبائی و چوڑائی میں ہوں، گھرائی کا کوئی تصور نہ ہو)۔ اس دنیا میں دو افراد کو دو الگ الگ دائروں میں قید کر دیا جاتا ہے (جیسے یھاں دکھایا گیا ہے)۔ کیا اس دنیا کے یہ دو انسان ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں؟ بالکل نہیں کیونکہ ان کے پاس تیسری جہت (گھرائی) موجود نہیں (جس سے ھم انھیں دیکھ رھے ہیں)۔ اسی طرح ان افراد کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس دائرے کو توڑے بغیر اس سے باھر آجائیں۔ اس کے مقابلے میں ھم انہیں دائرہ توڑے بغیر سامنے سے پکڑ کر باھر نکال سکتے ہیں۔ مگر دو جہات والے ان انسانوں کے لئے اس تیسری جہت کا تصور ممکن نہیں کیونکہ وہ اسی میں مقید ہیں۔ ہم اس بات کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کسی بوتل کے اندر ایک قنچہ ڈال کر بوتل بند کر دی جائے تو کیا آپ کے لئے یہ متصور کرنا ممکن ہے کہ بوتل ٹوٹے بنا قنچہ باہر آجائے؟ نہیں، بالکل اسی طرح دو جہاتی دنیا کے انسانوں کے لئے بھی اس دائرے سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی چوتھی جہت پر قدرت رکھتا ہو تو بوتل توڑے بنا قنچہ باہر نکال سکتا ہے، مگر ھمارے لئے اس کا عقلی ادراک کر سکنا ممکن نہیں کہ ھم تین جھاتی دنیا میں مقید

ہیں (ممکن ہے شیطان ہمیں کسی چھوتھی جہت سے دیکھتا ہو، جیسے قرآن میں آیا 'یرونہم من حیث لاترونہم')۔

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ ان تین مادی جہات کی طرح ''وقت یازمانہ'' بھی ایک جہت ہے جو ''ہم'' سے متعلق ہے، خدااس سے ماوراء ہے بلکہ زمانہ بذات خود خدا کی تخلیق ہے۔ چنانچہ معترضین کا اشکال زمانے (تقدیم و تاخیر) کی موجودگی کے ''ہم سے متعلق'' ایک سادے تصور کو مفروضے کے طور پر قبول کئے ہوا ہے لیکن خدا کے لئے ''پہلے جاننے'' اور ''بعد میں تخلیق'' کرنے جیسے تصورات ہی لایعنی ہیں (سوال کی بناہی اس پر ہے کہ 'جب خدا جانتا تھا تو اسنے پیدا کیوں کیا؟'۔ یعنی تقدیم وتاخیر کا تصور فرض کیا جارہا ہے)۔ خدا چونکہ زمانے سے ماوراء ہے لہذا اس کے حضور یہ سب اس طرح وقوع پزیر ہورہا ہے جس میں وقت کا کوئی تصور نہیں اور چونکہ وھاں زمان کا تصور اپلائی نہیں ہوتا لہذا علت و معلوم، ماقبل ومابعد جیسے تمام تصورات (جن پر یہ سوال مبنی ہے) وھاں موجود نہیں۔ ظاہر ہے ہم اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے لئے چوتھی یا پانچویں مادی جہت کا تصور ممکن نہیں۔ مثلا ممکن ہے اس کی کیفیت یہ ہو کہ خدا کے حضور یہ سب کچھ بیک وقت ہورہا ہو، مگر یہاں دھیان دیجئے کہ ہم انسانوں کے پاس وہ زبان ہی نہیں جس کے ذریعے ہم زمان و مکان سے ماوراء خدا کی پوزیشن کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہوں، مثلا یہاں بھی 'بیک وقت' کا لفظ زمانے پر دلالت کررہا ہے جو ''ھماری پوزیشن'' کے مطابق ہمارے فھم کے لئے ہے (اس تناظر میں وہ حدیث مبارکہ کس قدر بامعنی ہے جس میں نبی علیہ السلام نے ''قدر و قضاء کی کیفیت'' کو سمجھنے کے لئے گفتگو سے منع کیا کہ اسکا فہم وبیان ممکن نہیں)۔ پس خدا کی نسبت سے اس اشکال کے بامعنی

ہونے کے لئے جس مفروضے کا درست ہونا لازم ہے خدا کی پوزیشن سے وہ مفروضہ درست نہیں، لہذا خدا پر یہ اشکال درست نہیں۔

الغرض کہنے کا مقصد یہ کہ ہماری عقل گواہی دیتی ہے کہ خدا کی جہت سے ہم اس مسئلے کو سمجھنے کی پوزیشن مین ہی نہیں۔ اس گفتگو پر ملحد کوئی اشکال نہیں کھڑا کر سکتا کیونکہ یہ اہل مذھب کی داخلی پوزیشن سے ھم آھنگ ہے۔ اہل مذھب نے یہ دعوی ہی نہیں کیا کہ ھم خدا کو مکمل طور پر سمجھ اور بیان کر سکتے ہیں۔ اس گفتگو پر اشکال کھڑا کرنے کے لئے لازم ہے کہ ملحد عقلا ثابت کرے کہ انسان کے لئے اس مسئلے میں خدا کی جہت سے کوئی پوزیشن لینا ممکن ہے، چونکہ ایسی پوزیشن کا وجود ناممکن ہے لہذا ہماری گفتگو پر اشکال بھی ممکن نہیں (مسئلہ جبر و قدر میں سوالات کھڑے ہی تب ہوتے ہیں جب ہم اسکی کیفیت کو سمجھانے کے لئے کوئی پوزیشن لیتے ہیں)۔

(ب) بندے کی جہت سے

اب اس سوال (جو دراصل جبر و قدر سے متعلق ہے) پر ''بندے سے خدا کی طرف'' جہت سے غور کریں۔ اس پر اگر اس نکتہ نگاہ سے غور کیا جائے کہ کائنات خدا کی صفات کا اظہار ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی صفت ''ارادہ'' بھی ہے جس کا اظہار انسان جیسی مخلوق کی صورت میں ہوا جو ''متحرک بالارادہ'' ہے (اگرچہ اسکے ارادے کی حدود ہمیں مکمل طور پر معلوم نہیں)۔ یہ گویا انسانی ارادے کے وجود کی دلیل ہوئی۔ اب بندے کی نسبت سے محض ''کسی کا پیدا کیا جانا'' اسکے جہنم میں جانے کی بنیاد نہیں بلکہ اس ارادے کے تحت اعمال کے کسب پر ہے (جیسا کہ خدا نے واضح کیا)۔

یہاں بندے کی جہت سے یہ بات سمجھنا اہم ہے کہ ''اللہ کے علم میں کیا ہے'' اسکی ہم میں سے کسی کو خبر نہیں، ہماری (حادث و مخلوق کی) جہت سے ہمیں عمل کا اختیار دیا گیا ہے (اور یہ ایک ایسی شے ہے جسے ہم شعوری طور پر محسوس کرتے ہیں)۔ اگر تو ہم جو کرتے ہیں وہ ''اللہ کے علم کی طرف دیکھ کر'' کریں کہ ''چونکہ مجھے معلوم ہے کہ اللہ کے علم میں ایسا ہے لہذا میں یوں کر رہا ہوں کہ کہیں اسکا علم غلط نہ ہو جائے'' تو پھر بندے کی جہت سے اللہ کے علم کی وجہ سے جبر کا اعتراض درست ہوتا۔ لیکن چونکہ یہاں معاملہ اس طرح نہیں لہذا بندے کی جہت سے یہ اعتراض ویلڈ نہیں کہ میں وہ کرنے پر مجبور ہوں جو علم الہی میں مقدر ہو چکا۔ دراصل اس قسم کا استدلال کرتے وقت ہم دونوں جہات کو خلط ملط کر دیتے ہیں، بندے کے عمل کا کسب (حادث و مخلوق کے اعتبار سے) تقدیم و تاخیر کے تصورات پر مبنی ہے مگر اس جہت میں بندے کو 'کسب کرتے وقت 'علم الہی کی تقدیر معلوم نہیں ہوتی لہذا وہ کسب کرتے وقت خود کو اس سے ''شعورا'' متعین ہوتا محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنے ارادے سے ایسا کرتا ہے (یعنی ''اللہ کا علم'' ان معنی میں ایسی قوت نہیں جو مجھے فیس بک پر ٹائپ کرنے کے لئے بٹن دبانے پر مجبور کر رھا ھے اور میں اس قوت کو محسوس کر رہا ہوں کہ چاہتے ہوئے بھی اسکے علاوہ کچھ نہ کر سکوں نہ ہی میں اس کیفیت میں ہوں کہ اللہ کے علم کو جان کر ایسا کر رہا ہوں)، اسکے مقابلے میں علم الہی سے جبر ثابت کرنے کے لئے تقدیم و تاخیر کے جن تصورات کی ضرورت ہے ''خدا کی جہت سے'' وہ تصورات ہی موجود نہیں (جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا)۔ پس علم الہی سے جبر کا اثبات ''خدا کی بندے کی طرف جہت'' کے اعتبار سے لا متصور مفروضے پر مبنی ہے لیکن ''بندے کی جہت سے'' یہ جبر (اگر خدائی جہت سے کسی معنی میں ہے بھی) اس پر حاکم نہیں (کہ بندے کو چونکہ اسکی خبر ہی نہیں اور وہ ارادہ محسوس کرتا ہے، تو کسب کرتے وقت یہ ''نامعلوم علم'' اسے کس طرح

متعین کر سکتا ہے؟)۔ الغرض یہ اشکال کہ ''میں وہ کرنے پر مجبور ہوں جو خدا کے واجب و ازلی علم میں ہے'' ان دو جہات پر بیک وقت مبنی ہے۔

''بندے کی جہت سے'' اس معاملے پر اگر خود ملاحدہ کے تصور اخلاقیات کی رو سے غور کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حضرات کسی بھی معاملے میں ''نفس اصول ازمائش'' کے قائل ہیں یا نہیں؟ انکے اس اشکال کے مطابق تو سرے سے ہر قسم کی آزمائش ہی غیر اخلاقی قرار پاتی ہے، کیونکہ آزمائش اسی صورت میں بامعنی ہوتی ہے جب کامیابی یا ناکامی کا امکان ساتھ ہو۔ اگر سب نے ناکام یا سب نے کامیاب ہونا ہے تو پھر آزمائش کیسی؟ اگر ''نفس آزمائش'' کا اصول انکے یہاں اخلاقی ہے تو پھر بعض افراد کے متعلق پیشگی یہ معلوم ہونے سے کہ وہ ناکام ہوں گے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ آزمائش کی بنیاد اختیار پر ہے جو انسانوں کو حاصل ہے۔ اور اگر نفس آزمائش ہی ان حضرات کے نزدیک غیر اخلاقی تصور ہے تو پھر اسے صرف خدا تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں، اسے انسانی سطح کے معاملات پر بھی لاگو ہونا چاہیے اور اس فلسفیانہ تصور کو اس کے تمام عملی مضمرات کے ساتھ قبول کرنا چاہیے (یعنی انہیں دنیا کے تمام معاملات سے آزمائش کے اصول کو ختم کر دینا چاہئے جبکہ یہ ایسا نہیں کر رہے)۔

اعتراض آیت 'اللہ جس کو گمراہ کردے اسکو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا'

اعتراض: آیت اللہ جس کو گمراہ کردے اسکو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

جواب:۔اسکا ایک سادہ ترین جواب یہ ہے کہ ان ایات میں خدا کی قدرت طاقت کا بیان ہے نہ کہ سنت و قانون کا!!..

یعنی وہ چاہے تو کوئی اسکے ارادے کو کوئی پلٹ نہیں سکتا۔اسے سورہ بقرہ میں بیان کردہ بات سے سمجھا جا سکتا ہے. جہاں کہا گیا کہ 'ماھم بضارین بہ من احد الا باذن اللہ ("اپنے جادو منتر سے وہ کسی کو اللہ کے اذن کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے")۔یعنی ایسا نہیں تھا کہ جادو منتر کی اثر انگیزی ارادہ الٰہی سے ماوراء یا کائنات میں کسی دوسرے خدا کے اذن سے ہوتی ہے، اسباب کا یہ سلسلہ بھی تمام سلسلوں کی طرح اذن الٰہی ہی کا اظہار تھا، اسکی قدرت سے باہر کچھ نہیں۔اسی طرح ان آیات میں خدا کی قدرت کا بیان ہے کہ خدا کی قدرت وطاقت یہ ہے کہ اگر وہ کسی کو ہدایت یا گمراہی دے دے تو کوئی اسکے فیصلے کو اسکی مرضی کے خلاف پلٹ نہیں سکتا۔

باقی ہدایت و گمراہی کے سلسلے میں خدا کی سنت و طریقہ کیا ہے 'اس کا بیان دیگر آیات میں آیا ہے جیسے

)وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم یقیناانھیں اپنی راہیں دکھادیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ یقینا اچھے کام کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ العنکبوت/69

25

تقدیر اور آزمائش کی بحث

اعتراض: جب اللہ جانتا ہے کہ کونسا طبقہ جہنم میں جائے گا تو ہم ذمہ دار کیوں ہیں؟ اللہ نے شر کو تخلیق کیوں کیا؟

تمہیدی طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ دو مختلف چیزیں ہیں ان میں فرق ضروری ہے:

ا (ایک اللہ تعالیٰ کا علم ہے ۲) دوسرا اللہ تعالیٰ کی مشیت/رضا ہے

ان دونوں میں فرق ہے، باری تعالیٰ کا علم ازل سے لے کر ابد تک کے ہر ہر لحظہ کو شامل ہے، چاہے وہ علم دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے اچھے حالات سے متعلق ہو یا برے حالات سے متعلق ہو، خیر سے متعلق ہو یا شر سے متعلق ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی چاہت مشیت/رضا ہمیشہ خیر میں ہے شر میں نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک ہے صفتِ تخلیق اور دوسرا ہے منشأ تخلیق، اللہ تعالیٰ خالقِ مطلق ہے، وہ اپنے خالق ہونے کی صفت کے لحاظ سے ہر چیز کو پیدا کرتا ہے لیکن ہر چیز کو پیدا کرنے کے پیچھے اس کی منشا کیا ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے، وہ خیر کو پیدا کرتا ہے، تاکہ لوگ اس خیر کو اپنائیں، وہ شر کو پیدا کرتا ہے تاکہ لوگ شر سے بچ کر اس کی وفاداری کا ثبوت دیں۔ باری تعالیٰ نے خیر کو بنایا لیکن مسلط کسی پر نہیں کیا، اسی طرح شر کو بنایا لیکن مسلط کسی پر نہیں کیا، بلکہ بندوں کو اختیار دے دیا، خیر کے فوائد بھی بتائیں اور شر کے نقصانات بھی اور اختیار دے دیا کہ جسے چاہو چن لو۔

اس کے ساتھ باری تعالیٰ اپنے علم ازلی کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ کون کون اس کی بنائی ہوئی خیر کو اپنائے گا اور کون کون شر کے نرغے میں کر اس کی نافرمانی کرے گا؟ اسی کو لکھ دیا جائے تو اسے تقدیر میں لکھا ہوا کہتے ہیں۔

اب اگر باری تعالیٰ اپنے علم ازلی سے بتادے کہ ایک طبقہ جہنم میں جائے گا تو کیا یہ کہنا عقلاً درست ہے کہ وہ جہنم میں اس لئے گئے کہ وہ مجبورِ محض ہیں؟ بعینہ اسی طرح یہ کہنا بھی عقلاً درست نہیں کہ شر کو پیدا کر کے باری تعالیٰ نے کھلے عام چھٹی دے دی کہ لوگ شر میں مبتلا ہوں، بلکہ اس نے تو اختیار دیا ہے، اب جو جس کو چاہے چن لے۔ آزمائش جس طرح انسانوں کے لیے ہے شیطان کے لیے بھی تھی

اللہ شر کے خالق تو ہیں فاعل نہیں ہیں۔ اللہ کی پیدا اشیاء کا غلط استعمال انہیں شر بناتا ہے وہ اصلا شر نہیں ہو تیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زبان جیسی نعمت عطا کی، جس سے انسان گفتگو (اچھی یا بری) کر سکتا ہے۔ اگر انسان اسی زبان سے جھوٹ بولے، فحش کلامی یا غیبت کرے، کسی پر تہمت لگائے تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کی نسبت اللہ کی طرف ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ زبان کے خالق ہیں اور اللہ نے ہمیں سچ اور جھوٹ دونوں کا اختیار دیا تھا۔ لیکن اس اختیار کا غلط استعمال انسان نے کیا، یہ انسان کا فعل ہے اور ورغلانے والا شیطان ہے، اس اعتبار سے جھوٹ اور غیبت وغیرہ کی نسبت انسان یا شیطان کی طرف ہونی چاہیئے۔

قرآن کا پیش کردہ تصور بھی یہی ہے کہ خدا نے انسان کو ایک محدود نوعیت کی آزادی و خود مختاری دے کر اس دنیا میں امتحان کے لئے پیدا کیا ہے اور شیطان کو خود اس کے مطالبے پر آزادی عطا کی ہے کہ وہ اس امتحان میں انسان کو ناکام کرنے کیلئے جو کوشش کرنا چاہے کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ صرف ترغیب و تحریص کی

حد تک ہو، زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جانے کے اختیارات اسے نہیں دیئے گئے ہیں۔اس کے ساتھ اللہ تعالی نے خود بھی انسان کو جبراً راہ راست پر چلانے سے احتراز فرمایا ہے اور صرف اس بات پر اکتفا فرمائی ہے کہ انسان کے سامنے انبیاء اور کتابوں کے ذریعہ سے راہ راست کو پوری طرح واضح کر دیا جائے۔اس کے بعد خدا کی طرف سے آدمی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو خدا کی پیش کردہ راہ کو اپنے لیئے چن لے اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرے اور چاہے تو شیطان کی ترغیبات قبول کر لے اور اس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنے پر آمادہ ہو جائے جو شیطان اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ان دونوں راہوں میں سے جس کو بھی انسان اپنے لیئے انتخاب کرتا ہے اللہ تعالی اسی پر چلنے کے مواقع اسے دیتا ہے کیونکہ اس کے بغیر امتحان کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔اب کیا آپ چاہتے ہیں کہ خدا اس کے مقابلے میں مداخلت کر کے زبردستی انسان کو کامیاب کرائے؟

جواب مولانا محمد ابراھیم

26

آخرت۔ عقلی دلائل کی ضرورت۔۔

خدااور آخرت کا معاملہ بظاہر غیبی دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ انسان کی فطرت خدا اور آخرت کے معاملہ کو ایک معلوم صداقت کے طور پر جان لیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ خدا کی معرفت کے دو درجے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فطری۔ خدااور آخرت کے وجود کو عقلی سطح پر ماننا اس معرفت کا صرف ابتدائی درجہ ہے جب کہ خدااور آخرت کے وجود پر فطری سطح پر یقین کرنا اس کا انتہائی درجہ۔

خدااور آخرت کے معاملہ میں عقلی دلائل کے استعمال کا مقصد صرف یہ ھوتا ہے کہ انسان کے اوپر سے شک کے پردے کو ہٹا دیا جائے۔ انسان کو اس مقام تک لایا جائے جہاں وہ خدااور آخرت کے معاملہ کو کم از کم امکانی صداقت اور نظریہ کے طور پر قبول کرلے۔ جب آدمی اس حالت تک پہنچ جائے تو وہ اس قابل ھو

جاتا ہے کہ اس نظریہ کو لینے کے لیے اس کی فطرت کے دروازے کھل جائیں اور وہ اس کو ایک فطری سچائی کے طور پر پہچان کر اپنا لے۔

ہر انسان کے پاس وہ آنکھ موجود ہے جو خدا اور آخرت کو دیکھ سکے مگر اس آنکھ کے اوپر کنڈیشننگ کا پردہ پڑا ھوا ہے۔ منطقی دلیل یہ کام کرتی ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ یا اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کو توڑ کر اس مصنوعی پردہ کو فطرت کی آنکھ سے ہٹا دے۔ اس کے بعد انسان خدا اور آخرت کو صاف دیکھنے لگتا ہے۔ اب انسان بظاہر نہ دکھائی دینے والے خدا کے وجود پر اسی طرح کامل یقین کر لیتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے وجود پر کامل یقین رکھتا ہے حالانکہ اس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ھوئے نہیں دیکھا۔

خدا اور آخرت کا معاملہ صرف اس وقت تک منطقی بحث کا موضوع رہتا ہے جب تک کہ آدمی کے ذہن کا مصنوعی پردہ ہٹا نہ ھو۔ غور و فکر یا منطقی استدلال کے ذریعہ جب یہ پردہ ہٹ جائے تو انسان اپنے خدا کو خود اپنی داخلی معرفت کے تحت پہچان لیتا ہے۔ اب خدا اس کے لیے تمام معلوم چیزوں سے زیادہ معلوم واقعہ بن جاتا ہے۔ منطقی دلیل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے دروازے تک پہنچا دے۔ فطرت کا دروازہ کھلتے ہی انسان خدا کو اس طرح پا لیتا ہے جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کو جانتا تھا۔

انسان کی آنکھ پر پٹی بندھی ھوئی ھو تو ضرورت ھوتی ہے کہ سورج کے وجود کو اس کے لیے دلائل سے ثابت کیا جائے لیکن جب آنکھ کی پٹی ہٹا دی جائے تو اس کے بعد سورج کو ماننے کے لیے اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ھوتی۔ یہی معاملہ خدا کا ہے۔ خدا کا شعور انسان کی فطرت میں آخری حد تک سمایا ھوا ہے

اصل ضرورت صرف فطرت کا پردہ ہٹانے کی ہے۔ دلیل کے ذریعہ جب فطرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو انسان خدا کو اس سے زیادہ یقین کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے جتنا کہ ایک کھلی آنکھ والا آفتاب کو۔

پروفیسر فلپ ہٹی نے اپنی کتاب، ہسٹری آف عربس میں قرآن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کے سب سے زیادہ پراثر حصے وہ ہیں جو آخرت کے معاملات سے بحث کرتے ہیں—(صفحہ 130)

The most impressive parts of the Koran deal with eschatology.

جن غیر مسلموں نے قرآن پڑھا ہے وہ عام طور پر اسی قسم کے تاثر کا اظہار کرتے ہیں— مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کو سب سے کم جو چیز قرآن میں ملتی ہے وہ یہی آخرت ہے۔ مسلمان ہر چیز قرآن میں پا لیتے ہیں مگر اسی چیز کو نہیں پاتے جو قرآن میں سب سے زیادہ بلکہ ہر صفحہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم عام طور پر خالی الذہن ہوتا ہے۔ وہ صرف یہ جاننے کے لئے پڑھتا ہے کہ قرآن میں جو کچھ لکھا ہے وہ کیا ہے۔ چنانچہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ اس کو کسی کمی بیشی کے بغیر پا لیتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مسلمان زیادہ تر دو جذبے کے تحت قرآن پڑھتے ہیں یا ثواب کے لئے یا فخر کے لئے۔

کچھ لوگ قرآن کو سب سے زیادہ مقدس کتاب سمجھ کر بس اس کی ''تلاوت'' کر لیتے ہیں تاکہ اس کا ثواب انھیں مل جائے۔ اس کے بعد کچھ لوگ وہ ہیں زمانہ میں جن چیزوں کو اہمیت حاصل ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پر فخر کتاب ضرور اس کا مجموعہ ہوگی۔ اب جس کے ذہن میں سوشلزم سب سے بڑی چیز ہے وہ قرآن میں سوشلزم کو پڑھنے لگتا ہے۔ جس کے ذہن میں سائنس کہ اہمیت ہے وہ قرآن کی عظمت کو سائنس کی

صورت میں پالیتا ہے اسی طرح جس کے ذہن میں سیاست اور قانون کی اہمیت ہے۔ وہ قرآن میں جو سب سے اھم بات دریافت کرتا ہے وہ سیاست اور قانون ھوتی ہے۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن آخرت کی کتاب ہے۔ قرآن اس لئے آیا ہے کہ وہ آنے والے دن سے پہلے آنے والے دن کے بارہ میں لوگوں کو خبردار کردے۔ قرآن مادی صور سے پہلے لفظی صور ہے جو لوگ لفظی صور سے جاگ جائیں وہ کامیاب ہیں ۔جو لوگ مادی صور سے جاگیں گے ان کے لئے ان کا جاگنا کچھ کام نہ آئے گا۔

آخرت کا مسئلہ چونکہ غیب سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اسکی صحیح شناخت عقل سائنس اور فلسفہ سے ممکن ہی نہیں، ہزاروں لوگوں نے اسے عقل کے راستے سے جاننا چاہا لیکن عقل چونکہ ہر مسئلے میں دورائے سامنے کرتی ہے اس لیے تمام بڑے فلسفی تشکیک میں مرے۔ شروع دن سے تمام فلسفیوں کا کیس ایک ہی تھا،اسی حقیقت کی تلاش۔ماضی قریب کے مشہور ترین برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل کا معاملہ بھی یہی تھا۔ تمام عمر کی غور و فکر / مطالعہ کے باوجود اس سچائی کو دریافت کرنے میں ناکام رہا، دوسرے فلسفیوں کا کیس بھی یہی ہے۔ مگر دوسرے فلسفیوں نے اس حقیقت کا بہت کم اعتراف کیا، جب کہ برٹرینڈ رسل نے کھلے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ رسل کا یہ اعتراف اس کی خود نوشت سوانح عمری میں دیکھا جا سکتا ہے لکھتا ہے:

’’جب میں اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ھوں تو مجھے ایسا محسوس ھوتا ہے کہ میری زندگی ضائع ھو گئ۔ میں ایسی باتوں کو جاننے کی کوشش کرتا رہا، جن کو جاننا ممکن ہی نہیں تھا۔ میری سرگرمیاں بطور عادت جاری رہیں۔ میں بھلاوے میں پڑا رہا۔ جب میں اکیلا ھوتا ھوں تو میں اس کو چھپا نہیں پاتا کہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں، اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ نیا مقصد حیات کیا ہے، جس میں میں اپنی بقیہ عمر کو وقف کروں۔ میں

اپنے آپ کو کامل تنہائی میں محسوس کرتاھوں، جذباتی اعتبار سے بھی اور مابعد الطبیعیاتی اعتبار سے بھی، جس سے میں کوئی مخرج نہیں پاتا"

)p.395 . The Autobiography of Bertrand Russell , 1950(

جیسا کہ اوپر لکھا مابعد الطبیعاتی امور کا صحیح علم عقل فلسفہ و سائنس کے ذریعے حاصل کیا جانا ممکن ہی نہیں، اسی لیے اللہ نے اسکے لیے ایک نئے ذریعہ علم وحی کو متعارف کروایا، انسانوں ہی میں سے ہی پاک اور صفات والے لوگوں کو منتخب کیا گیا اور فرشتوں کے ذریعے ان پر وحی بھیجی گئی۔ کائنات اور انسان کی مقصدیت، آغاز و انجام کے سارے فلسفے کو کھول کر بیان کیا گیا۔ان سب امور کے متعلق اسلام کی پیش کی گئی تفصیل و توجیہہ اتنی معقول ہے کہ آج تک کوئی اسکا معقول رد نہیں کرسکا اور نا اسکے مقابلے میں کوئی بہتر توجیہہ پیش کرسکا ہے، متبادل طریقوں سے حقیقت ڈھونڈنے والے سارے ناکام ہوگئے، انہوں نے ساری زندگی کی تلاش کے بعد یہ تو جان لیا کہ عقل انسانی کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچنا ممکن نہیں، متبادل مذہبی سورس اور تفصیل و توجیہہ کو پھر بھی اہمیت نادی اور شک میں ہی دنیا سے چلے گئے۔

الرسالہ

27

مسئلہ آخرت- عقلی استدلالات

عقلی استدلال کے لیے ہمارے پاس کیا مواد موجود ہے؟ ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے، اور دوسرے یہ نظامِ کائنات۔ ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دیکھیں گے کہ جو کچھ انسان میں ہے آیا اس کے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز بچی رہ جاتی ہے جس کے لیے کسی دوسری نوعیت کے نظام کی ضرورت ہو۔؟

دیکھیے، انسان ایک تو جسم رکھتا ہے، جو بہت سے معدنیات، نمکیات، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نمک، گیسیں، دریا اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لیے جتنے قوانین کی ضرورت ہے وہ سب کائنات کے اندر کارفرما ہیں، اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں اور ہواؤں کو اپنے حصے کا کام پورا کرنے کا موقع دے رہے ہیں، اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے اور گھاس پھونس کائنات میں بھی موجود ہیں، اور وہ قوانین بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو نشو و نما پانے والے اجسام کے لیے درکار ہیں۔

پھر انسان ایک زندہ وجود ہے جو اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے، اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سے قسمیں موجود ہیں۔ خشکی، تری، اور ہوا میں بے شمار حیوانات پائے جاتے ہیں۔ اور وہ قوانین بھی تمام و کمال یہاں کارفرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرہ عمل پر حاوی ہونے کے لیے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے جس کو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اس کے اندر نیکی اور بدی کرنے کا شعور ہے، نیک اور بد کی تمیز ہے، نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے، اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حق اور ناحق، رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت اور اسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرق کرتا ہے۔ یہ صفات عملاً اس کی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اس کے افعال کے طبعی نتائج رونما ہوتے ہیں اسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیے، کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟؟؟

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں کم از کم ہمارے علم کی حد تک کوئی دوسری مخلوق ایسی نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو۔ سارا نظام کائنات طبعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اخلاقی قوانین اس میں کسی طرف کار فرما نظر نہیں آتے۔

یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے، مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت۔

یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے، مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی بلکہ اکثر جوتیوں کی۔

یہاں مادی عناصر کے لیے مقرر قوانین ہیں جن کے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں مگر اخلاقی عناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ ان کی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے۔

طبعی قوانین کی فرماں روائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت طبعی قوانین دے دیں، اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضا کرتا ہے، مگر طبعی قوانین کے مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔

انسان نے خود اپنے تمدنی و سیاسی نظام کے ذریعے سے تھوڑی سی کوشش اس امر کی کی ہے کہ انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج ایک مقرر ضابطے کے مطابق برآمد ہو سکیں۔ مگر یہ کوشش بہت محدود پیمانے پر ہے اور

بے حد ناقص ہے۔ایک طرف طبعی قوانین اس کو محدود اور ناقص بتاتے ہیں،اور دوسری طرف انسان کی اپنی بہت سی کمزویاں اس انتظام کے نقائص میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی ہیں۔

نیکی اور بدی کا بدلہ کب اور کیسے ؟

ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص کا دشمن ہو اور اس کے گھر میں آگ لگادے تو اس کا گھر جل جائے گا۔یہ اس کے فعل کا طبعی نتیجہ ہے۔اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا اس نے ایک خاندان کو نقصان پہنچایا ہے۔ مگر اس نتیجے کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آگ لگانے والے کا سراغ ملے، وہ پولیس کے ہاتھ آسکے، اس پر جرم ثابت ہو، عدالت پوری طرح اندازہ کر سکے کہ آگ لگنے سے اس خاندان کو اور اس کی آئندہ نسلوں کو ٹھیک کتنا نقصان پہنچا ہے،اور پھر انصاف کے ساتھ اس مجرم کو اتنی ہی سزا دے۔اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہوتی ہو تو اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ہی ظاہر نہ ہو گا یا اس کا صرف ایک تھوڑا حصہ ظاہر ہو کر رہ جائیگا۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے حریف کو برباد کر کے وہ شخص دنیا میں مزے سے پھلتا پھولتا رہے۔

اس سے بڑے پیمانے پر ایک اور مثال لیجیے۔ چند اشخاص اپنی قوم میں اثر پیدا کر لیتے ہیں اور ساری قوم ان کے کہے پر چلنے لگتی ہے اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں میں قوم پرستی کا اشتعال اور ملک گیری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ گرد و پیش کی قوموں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں، لاکھ ہا آدمیوں کو ہلاک کرتے ہیں، ملک کے ملک تباہ کر ڈالتے ہیں اور کروڑوں انسانوں کو ذلیل اور پست زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں۔انسانی تاریخ پر اُن کی اِن کاروائیوں کا ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جس کا سلسلہ آئندہ سینکڑوں برس تک پشت در

پشت اور نسل در نسل پھیلتا چلا جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ چند اشخاص جس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں اس کی مناسب اور منصفانہ سزا ان کو کبھی اس دنیوی زندگی میں مل سکتی ہے؟؟؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی بوٹیاں بھی نوچ ڈالی جائیں، اگر ان کو زندہ جلا ڈالا جائے یا کوئی اور ایسی سزا دی جائے جو انسان کے بس میں ہے تب بھی کسی طرح وہ اس نقصان کے برابر سزا نہیں پا سکتے جو انہوں نے کروڑوں انسانوں کو اور ان کی آئندہ بے شمار نسلوں کو پہنچایا ہے۔ موجودہ نظام کائنات جن طبعی قوانین پر چل رہا ہے ان کے تحت کسی طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کے برابر سزا پا سکیں۔

نیکی کی مثال

اسی طرح ان نیک انسانوں کو لیجیے جنہوں نے نوع انسانی کو حق اور راستی کی تعلیم دی اور ہدایت کی روشنی دکھائی، جن کے فیض سے بے شمار انسانی نسلیں صدیوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں اور نہ معلوم آئندہ کتنی صدیوں تک اٹھاتی چلی جائیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کا پورا صلہ ان کو اس دنیا میں مل سکے؟ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ موجودہ طبعی قوانین کی حدود کے اندر ایک شخص اپنے اس عمل کا پورا صلہ حاصل کر سکتا ہے جس کا رد عمل اس کے مرنے کے بعد ہزاروں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیل گیا ہو؟؟؟

جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں، اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب ہو سکیں، دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل بھی کرتا ہے اس کے رد عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور اتنی مدت تک جاری

رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے، اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لیے تو موجودہ طبعی دنیا (Physical World) اور اس کے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرا نظامِ عالم درکار ہے جس میں حکمران قانون (Covering law) اخلاق کا قانون ہو اور طبعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو۔ جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مترتب ہونے سے رہ گئے ہوں، یا الٹے مترتب ہوئے ہوں، اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مترتب ہو سکیں۔ جہاں سونے اور چاندی کے بجائے نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایک ایسا نظامِ عالم ضرور ہونا چاہیے۔

وحی کی روشنی

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف ''ہونا چاہیے'' کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظامِ عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی۔ پھر

اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے دوبارہ پیدا کر دے گا، اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کرے گا۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک اک قوم کا اور پوری انسانیت کا ریکارڈ ہر غلطی اور ہر فرگذاشت کے بغیر محفوظ ہوگا۔ ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردعمل دنیا میں ہوا ہے اس کی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہوں گی جو اس ردعمل سے متاثر ہوئیں۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے تھے اپنی داستان سنائے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے اور کون کتنی سزا کا۔

انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہوں گی جس کا کائی اندازہ موجودہ نظامِ عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہوں گے۔ وہاں کی مقداریں کچھ اور ہوں گی۔ وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے۔ انسان کی جن نیکیون کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں، وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کر سکے گا بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں۔ اور اسی طرح انسانوں کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیلتے رہے، وہ ان کی پوری سزا بھگتے گا، بغیر اس کے کہ موت اور بے ہوشی آکر اسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں، مجھے ان کے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہمارے موجودہ عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظامِ عالم

کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہوا؟ البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہو گا، تو اس کا یقین نہ دلیل سے ہو سکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے۔ اس کے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔

"(مستفاد از اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات" از مودودی صاحبؒ)

28

موت کے بعد زندگی

موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کیسی ہے؟

یہ سوال حقیقت میں ہمارے علم کی رسائی سے دور ہے۔ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں ہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اس پار جھانک کر دیکھ سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں ہیں جن سے ہم اُدھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعے سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جا سکے کہ ادھر کچھ ہے یا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اس کے

دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے وہ بالکل ایک غیر سائنٹفک بات کہتا ہے۔ سائنس کی رو سے نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی زندگی ہے اور نہ یہ کہ کوئی زندگی نہیں ہے۔ جب تک ہم کوئی یقینی ذریعہ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اس سائنٹفک رویے کو نباہ سکتے ہیں؟

شاید نہیں، بلکہ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اس کے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں، لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرز عمل قائم کریں یا اقرار پر۔

مثلاً ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر اس کے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو تو آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس کے ایمان دار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپ کو اس سے معاملہ کرنا ہو تو آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایمان دار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اس کا ایمان دار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کریں گے۔ مگر اس کی ایمان داری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کریں گے، عملاً اس کی صورت وہی تو ہو گی جو اس کی ایمان دار کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے یا تو اقرار یا انکار بہر حال ناگزیر ہے۔

یہ بات تھوڑے ہی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارے اخلاقی رویے کا سارا انحصار ہی اس سوال پر ہے۔ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہو گا۔۔۔ اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے، جس میں مجھے اپنی موجودہ زندگی کا حساب دینا ہو گا، اور وہاں میرا اچھا یا برا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہو گا، تو یقیناً میرا اخلاقی طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہو گا۔

اس کی مثال یوں سمجھیے جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس یہاں سے کراچی تک جانا ہے اور کراچی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا بلکہ وہ وہاں پولیس اور عدالت اور ہر اس طاقت کی دسترس سے باہر ہو جائے گا جو اس سے کسی قسم کی بازپرس کر سکتی ہو۔۔ اور اس کے برعکس ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے کراچی تک تو اس کے سفر کی صرف ایک ہی منزل ہے، اسکے بعد اسے سمندر پار ایک ایسے ملک میں جانا ہو گا جہاں کا فرمانروا وہی ہے جو پاکستان کا فرمانروا ہے اور اس کے دفتر میں میرے اس پورے کارنامے کا خفیہ ریکارڈ ہے جو میں نے پاکستان کے اس حصے میں انجام دیا ہے، اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کس درجے کا مستحق ہوں۔۔۔

آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرز عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہو گا۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے کراچی پہنچنے تک ہے، آگے کچھ نہیں، یہ شخص اپنے افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو کراچی تک کے سفر میں نکل سکتے ہیں۔ جبکہ دوسرے شخص کی نگاہ ان

نتائج پر ہو گی جو سمندر پار دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلیں گے۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی بعد موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائیں گے، اس کی صحت کا تعین اس بات پر منحصر ہو گا کہ آیا ہم اسی زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں یا کسی بعد کی زندگی اور اس کے نتائج کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت اٹھے گا اور دوسرے صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہو گی۔ میتھو ہیل لکھتا ہے

"یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے، ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرتا ہے جن سے سماجی نظم کو برقرار رکھا جاتا ہے (Religion without revelation. Page 115) "

اسی طرح والٹئیر ایک جگہ لکھتا ہے:

"خدا اور دوسری زندگی کے تصور کی اہمیت سے اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے لئے مفروضے کا کام دیتے ہیں، صرف اسکے ذریعے بہتر اخلاق کی فضاء پیدا کی جاسکتی ہے، اگر یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو حسن عمل کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہتا اور اس طرح سماجی نظم کا برقرار رہنا ناممکن ہو جاتا ہے"۔(History of philosophy by Windelband, Page 496)

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے۔ بلکہ عملی زندگی کا سوال ہے۔ اور جب بات یہ ہے تو ہمارے لیے اس معاملے میں شک اور تردد کے مقام پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں۔ شک کے ساتھ جو رویہ ہم زندگی میں اختیار کریں گے وہ بھی لا محالہ انکار ہی کے رویے جیسا ہو گا۔ لہٰذا ہم بہر حال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں۔ اگر

سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتی تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیے یا کوئی اور سورس تلاش کرنا چاہیے۔

مولانا مودودی

خدانے ہمیں پیدا ہی کیوں کیا؟ ہمارا امتحان لینے کا کیا مقصد؟

خدانے ہمیں پیدا ہی کیوں کیا؟ ہمارا امتحان لینے کا کیا مقصد؟

تبصرہ:

یہ سوال صفت اور اسکے اظہار کے مابین ناگزیر بیانیہ تعلق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ صفت اور اسکے اظہار کے بارے میں 'کیوں' کا سوال ہی غیر متعلقہ ھوتا ھے کیونکہ انکے درمیان تعلق ''وجہ'' کا نہیں بلکہ ''ہے (to be)'' کا ہوتا ہے، یعنی صفت کا اظہار ہی صفت کی تعریف (یعنی ڈسکرپشن) ہوتی ہے۔ مثلا سماعت کا معنی ھے سنائی دینا، یعنی سنائی دینے کا عمل صفت سماعت کا اظہار یا اسکی تعریف ھے اور اس اظہار سے علی الرغم اسکا کوئی معنی نہیں۔

چنانچہ خدا کی ایک صفت 'خالق' ھونا ھے، پس مخلوق کا ھونا خدا کی صفت خلاقیت کا 'اظہار' ھے، یہاں وجہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال ایسا ہی ھے جیسے کوئی کہے کہ صفت بینائی سے دکھائی کیوں دیتا ھے یا صفت سماعت سے سنائی کیوں دیتا ھے۔ ظاھر ھے یہ سوال ھی غلط ھے کیوں کہ دکھائی دینے اور بینائی کے درمیان تعلق صفت اور اسکے اظہار کا ھے، یعنی دکھائی دینا صفت بینائی کی تعریف ھے اس پر ''مقصد'' کا سوال غیر متعلق ھے۔ بالکل اسی طرح خدا کی مخلوق کا ھونا خدا کے خالق ھونے کا اظہار ھے، یہاں اصولا ''کیوں'' کا سوال ہی پیدا نہیں ھوتا۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ خدا امتحان کیوں لے رہا ہے، تو اسکا جواب بھی یہی ہے کہ خدا کی صفات 'حق' و ''عادل'' ہونا بھی ہیں، پس حق و باطل کا معرکہ اسی صفت ''حق'' اور جزا و سزا کا نظام صفت ''عادل'' کا اظہار ہے، لہذا یہاں بھی کیوں کا سوال بے محل ھے۔

شبہ نمبر: آپ کے بقول کائنات کو پیدا کر کے خدا نے اپنی صفت خلاقیت کا اظہار کیا نیز ایسا کرنے سے قبل بھی خدا ''صفت خلق'' سے متصف تھا، تو آخر اپنی ان صفات کے اظہار کا مقصد کیا تھا؟ ان صفات کا اظہار کرنے کی کیا وجہ پیش آگئی تھی؟

تبصرہ:

پہلے واضح کیا گیا کہ صفت کے اظہار پر 'کیوں' کا سوال پیدا نہیں ھوتا۔ گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل اھل مذھب کا یہ اصولی مقدمہ یاد رکھنا چاھئے کہ خدا کو بس اسی حد تک پہچانا جا سکتا ھے جس قدر خود اس نے اپنے نبی کے ذریعے اپنا اظہار کیا، اس سے زیادہ عقل کے سامنے کوئی سوال رکھنا عقل پر ایسا بوجھ ڈالنا ھے جسکی وہ متحمل نہیں ھو سکتی۔ چنانچہ خدا نے بتایا کہ میں 'خالق' ھوں تو ہمیں پتہ چلا کہ کسی مخلوق کا ھونا اس صفت کا اظہار ھے۔

اب یہ سوال کہ صفات بالقوہ کو بالفعل میں 'کس سبب و مقصد سے' تبدیل کیا گیا؟ جب ہم انسان ''مقصد'' کا سوال اٹھاتے ھیں تو وہ ''ذات سے بیرون'' کسی شے کی جستجو کا تصور ھوتا ھے۔ اب خدا سے یہ توقع رکھنا کہ ''اس سے الگ'' کوئی مقصد ھوگا جسکی وہ جستجو کرے گا یہ خدا کی صفت صمدیت (self-determined and contained) کے تناظر میں خود سے ایک تضاد ہے، یعنی خدا کے کسی

عمل کا کوئی ''بیرونی مقصد'' نھیں ھو سکتا کہ جسکے حصول کا خدا یا اسکا عمل گویا ذریعہ بنے۔ اب لا محالہ یہ مقصد کا سوال ''خدا کے اندرون'' سے متعلق ھی ھو سکتا ھے اور اس اندرون کو ھم اسی قدر جان سکتے ہیں جس قدر وہ اپنی شان کے مطابق ظاھر کرے۔ خدا کے اندرون سے متعلق ھم صرف اسقدر ہی جانتے ہیں کہ اس نے اپنا تعارف ''فعال للما یرید'' (جو چاھتا ھے کر گزرتا ھے) سے کروایا ہے۔ تو گویا یوں سمجھئے کہ ''یوں عدم کو وجود بخشنا بھی'' اسکی ''صفت ارادہ'' ہی کا اظھار ھے۔ اس کے علاوہ ھم کوئی دوسری بات قطعیت کے ساتھ خدا کے اندرون کے بارے میں نھیں جانتے۔ اب اس صفت کے اظہار پر بھی اصولا 'کیوں' کا سوال پیدا نہیں ھوتا۔

یہاں یہ اھم بات بھی ذھن نشیں رھنا چاھئے کہ خدا کی ذات کے حوالے سے اس قسم کے بھت سے سوالات اسکی صفات کو الگ الگ تصور کرنے سے بھی پیدا ھوتے ہیں۔ اھل مذھب کے یہاں خدا فعال للما یرید، خالق، عادل، علیم، حکیم وغیرھم سب ''ایک ساتھ'' ہے۔ چنانچہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''خدا اپنے ارادے سے اپنی صفات کا (اپنی شان کے مطابق) پر حکمت اظھار کرتا ھے۔''

اس مقام پر اگر کوئی کہے کہ خدا کی یہ صفات کیوں ہیں تو یہ بھی غیر متعلق سوال ھوگا کیونکہ ''خدا تو یوں ھے'' (یعنی یہ اسکی ڈسکرپشن ھے)۔ 'کیوں' کا سوال مقصد کو فرض کرتا ھے، ایک ایسی چیز جو اس وجود سے کہیں باھر ھوتی ھے اور وہ وجود اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ھوا کرتا ھے۔ اب خدا کی صفات پر یہ سوال اٹھانا کہ 'خدا ایسا کیوں ھے' فرض کر رھا ھے کہ خدا'' قائم بالذات'' نہیں بلکہ اپنے سے بالاتر یا ماوراء کسی مقصد کا ذریعہ ھے۔ ظاھر ھے خدا کے حوالے سے یہ سوال اٹھانا اسکی ''صمدیت'' کا انکار ھے۔ پس خدا کے حوالے سے یہ سوال ہی غیر متعلق و غیر عقلی ھے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہئے کہ ہر وجود سے متعلق بہت سے سوالات غیر متعلق ھوتے ہیں اور بہت سے متعلق۔ مثلاً اگر میں اپنا چشمہ اپنے کمرے میں رکھ کر جاؤں اور جب واپس آؤں تو وہ کمرے کے بجائے باھر ٹیرس پر ھو تو اس پر ذھن میں سوال آئے گا کہ 'چشمہ باھر کیسے چلا گیا'؟ اب فرض کریں چشمے کے بجائے میرا ایک دوست کمرے میں بیٹھا تھا اور میرے واپس آنے پر وہ ٹیرس میں کھڑا تھا۔ کیا اب میرے ذہن میں ''کیسے'' کا سوال پیدا ھوگا؟ نہیں، کیونکہ انسان کی ڈسکرپشن یہ ھے کہ وہ ''متحرک بالارادہ'' ھوتا ھے لیکن چشمہ نہیں۔ تو جو سوال چشمے کے تناظر میں عین عقلی تھا انسان کیلئے (اسکی صفت 'متحرک بالارادہ' کے سبب) غیر متعلق ھو گیا۔ پس یہی معاملہ خدا کا بھی ھے کہ اس کی ذات پر بہت سے سوالات بذات خود غیر متعلق ہیں جیسے یہ کہ 'خدا ایسا کیوں ھے' کیونکہ وہ الصمد (قائم بالذات ھستی) ھے، ایسی ھستی جو اپنے ھونے کا جواز خود اپنے اندر رکھتی ھے۔ چنانچہ خدا کی صفات پر 'کیوں' کا سوال اٹھانے کا مطلب ہی یہ ھے کہ ھم خدا کے الصمد ھونے سے سہو نظر کر لیں۔ پس خدا کی مقصدیت کی تلاش خدا کی صمدیت کا انکار اور اسے اپنے جیسی محتاج مخلوقات پر قیاس کرنا ہے۔

30

کیا رحمن اور رحیم ہونے کا یہ تقاضا نہیں کہ پیدا ہی نہ کیا جاتا یا امتحان نہ لیا جاتا؟

کیا رحمن اور رحیم ہونے کا یہ تقاضا نہیں کہ تخلیق نہ کی جاتی یا امتحان نہ لیا جاتا؟ آخر خدا کی پیدا کردہ اس صورتحال کی قیمت ناکامی کی صورت میں انسان کو ادا کرنی ہے خدا کو نہیں۔

تبصرہ:

یہاں گفتگو کے تین پہلو ہیں۔

اولا یہ کہ امتحان لینا کس چیز کا اظہار ہے،

ثانیا تصور رحمت کا تقاضا کیا ہے،

ثالثا انسان کا اسکے انجام کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

یہاں اختصار سے ان پر گفتگو کی جاتی ہے۔

یہاں یہ اصولی بات ذھن نشین رہنی چاہئے کہ اس پوری گفتگو میں خدا کی صفات کو زیر بحث لانا صرف خدا کی صفات کا ذکر کرنے کی غرض سے نہیں ہے بلکہ کائنات کا انکے ساتھ ربط بیان کرنے کیلئے ہے۔

چنانچہ پہلے پہلو پر یہ عرض ہے کہ اگر امتحان نہ ہو تو خدا کی خود اپنی بتائی ہوئی بہت سی صفات (مثلا حق، عادل، غفور، منتقم وغیر ہم) کا اظہار نہ ہو گا۔ پس یہ امتحان اور حق و باطل کی کشمکش انہی صفات کا اظہار ہے۔

دوسرے پہلو کی تفصیل یہ ہے کہ خدا صرف رحمان ہی نہیں بلکہ حق، عادل وغیرہ بھی ہے، لہذا صرف صفت رحمت کو ریفرنس پوائنٹ بنا کر خدا کے فیصلوں پر حکم لگانے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم خدا کی دیگر تمام صفات کو معطل کر کے اسے صرف ایک ہی صفت میں محدود کر دیں، ظاہر ہے خدا کی یہ ڈسکرپشن خود اسکی اپنی بتائی ہوئی ڈسکرپشن کے خلاف ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی درست نہیں کہ رحمت کا تقاضا امتحان نہ لینا ھے کیونکہ یہ بات اتنی ہی قوت کے ساتھ اسکے برعکس بھی کہی جاسکتی ھے، یعنی امتحان دینے والے کو جو sense of achievement ملتی ھے نیز نعمت کے حصول پر استحقاق کی کیفیت نیز دوسروں پر سبقت لیجانے کے سبب جو کیفیات پیدا ھوتی ھے وغیرہ وہ بغیر امتحان ممکن نہیں۔ پس یہ کہنا کہ 'امتحان نہ لینا صفت رحمت کا تقاضا ھے' ایک غلط بات ھے (سمجھنے کیلئے اس کی مثال یوں ھے کہ بظاھر ایسا تقاضا لگتا ھے کہ استاد کمرہ امتحان میں طالب علم کو جواب خود لکھوادے تو شاید یہ رحمت ھو گی مگر ظاھر ھے اسے کوئی بھی رحمت کا تقاضا نہیں سمجھتا)۔ چنانچہ اس اعتراض میں رحمت کا اپنی طرف سے ایک تصور قائم کر کے خدا کو اس پر فٹ کرنے کی کوشش کی جارہی ھے، خدا کے رحمان ھونے کا معنی کیا ھے یہ خود خدا بتائے گا۔

تیسرے پہلو کی بابت یہ عرض ھے کہ خدا خالق، صمد، فعال لما یرید اور رحمان ھونے کے ساتھ ساتھ عادل بھی ھے (اور خدا یہ سب کچھ ایک ساتھ ھے، بغیر کسی تضاد کے)۔ پس اسکی صفت عدل کا تقاضا ھے کہ آخرت میں جو انسان جو بھی قیمت ادا کرے گا اس میں خود اسکے اختیار کے استعمال کا بھی عمل دخل شامل ھوگا جیسا کہ اسنے بتایا۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ کس قدر اختیار ھے اور کس قدر نہیں تو اس پر بہت کچھ لکھا گیا (متکلمین نے یہاں خلق اور کسب کے فرق بیان کرنے کی کوششیں کیں)، مگر اصولی بات یہ ھے کہ ھم نے یہ کبھی دعوی نہیں کیا

کہ ھم جبر وقدر کی اس گھتی کو پوری طرح سلجھادیں گے، یعنی خدا کی مشیت وعلم کا خدا کے عدل کے ساتھ گوں نا گوں کیسا تعلق ھے یہ پوری طرح عقل کی گرفت میں لانا ممکن نہیں (اور نفس مسئلہ یہ نہیں کہ انسان ان مابعد الطبعیاتی سوالات کا جواب صرف خدا کے حوالے سے نہیں دے سکتا بلکہ حقیقت یہ ھے ان سوالات کا جواب وہ کسی بھی حقیقت اولی کے بارے میں حتمی طور پر نہیں دے سکتا، اور تو اور انسان مشاھدے میں آنے والی اس مادی دنیا کے بارے میں بھی بہت سے ایسے سوالات کا شافی جواب نہیں دے سکتا جو نبی اسے بتادیتا ھے)۔ اسی لئے کہا گیا کہ خدا کو بس اتنا ہی سمجھنا ممکن ھے جتنا خود اس نے اپنے بارے میں بتایا، اس سے زیادہ خدا کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بے محل ٹامک ٹوئیاں مارنا ھے۔ خدا نے آخرت کی کامیابی کو ان گھتیوں کو سلجھانے سے مشروط نہیں کیا۔

اس سب پر گھما پھرا کر یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ خدا یہ سب کیوں کر رھا ھے (یا خدا ایسا کیوں ھے)؟ مگر اس کا جواب اوپر عرض کیا جا چکا کہ خدا پر ''کیوں'' (مقصدیت) کا سوال اٹھانا خدا کی صمدیت کا انکار کرنا ھے۔ پس خود میری عقل مجھے بتاتی ھے کہ جس ھستی کو خدا کہا جاتا ھے اس پر کیوں کا سوال ہی غیر متعلق و غیر عقلی ھے۔ خدا پر کیوں کا سوال اٹھانا ایک rational category mistake ھے (یعنی ایک ایسے محل پر ایک چیز کو اپلائی کرنا ھے جو اسکا محل ھے ہی نہیں)۔

دنیا کی قلیل سی زندگی میں کفر و جرم اور بدلے میں اتنی طویل سزا؟

خدا، روز آخرت، حساب کتاب وغیرہ کے حوالے سے ملحدین بعض شبے ظاہر کرتے اور کمال مہارت سے ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جن سے تشکیک پیدا ہو، ایسے ہی چند شبہات اور تشکیک آمیز سوالات کے معقول جوابات پیش کیے جا رہے ہیں۔

شبہ نمبر 1: یہ کیا بات ہوئی کہ انسان دنیا کی قلیل سی زندگی میں کفر و جرم کرے اور بدلے میں آخرت کی انتہائی طویل سزا پائے، یہ کیسا عدل ہے؟

تبصرہ:

یہاں معترضین کا مفروضہ یہ ھے کہ 'عادلانہ سزا کے تعین کیلئے ضروری ھے کہ جرم میں صرف ھونے والے وقت اور سزا کے وقت میں راست تناست قائم ھونا چاھئے'۔ مگر ظاھر ھے یہ مفروضہ لغو ھے کیونکہ ایسی وقتی نسبت قائم کرنا نہ صرف یہ کہ سرے سے عقل اور عدل کے خلاف ھے بلکہ مضحکہ خیز نتائج کا باعث بھی بنتا ھے۔ مثلا

چور چند لمحوں میں چوری کرتا ھے مگر اس عمل کیلئے ساری دنیا اسے سالہا سال تک کی سزا دیتی ھے، کیوں؟

راشی چند لمحوں میں رشوت لیتا ہے مگر سالہا سال کیلئے جیل کی نظر کر دیا جاتا ھے، کیوں؟

ایک طالب علم چند لمحوں میں استاد کو گالیاں دیتا ھے مگر نتیجتا اسے ہمیشہ کیلئے یونیورسٹی سے نکال باہر کیا جاتا ھے، کیوں؟

امریکہ نے ایٹم بم کے ذریعے بہت قلیل وقت میں جتنے انسانوں کا قتل کیا چنگیز خان نے اس سے بہت زیادہ وقت لگا کر اس سے کم انسان قتل کئے، تو کیا چنگیز خان زیادہ وقت لگانے کی وجہ سے زیادہ بڑا مجرم اور زیادہ سزا کا مستحق ھونا چاہئے؟

قتل کرنے میں صرف ھونے والا وقت چوری میں صرف شدہ وقت سے کم ھوتا ھے مگر قاتل کی سزا چور سے زیادہ ھوتی ھے، کیوں؟

اس پر بہت سی مثالیں قیاس کی جاسکتی ہیں۔ پس مذہبی تصور سزا پر اعتراض کرنے والے لوگ جو جواب ان مثالوں کیلئے دینگے وھی اھل مذہب کی طرف سے بھی فرض کر لیا جائے۔

درحقیقت جرم اور سزا کا تعلق وقتی نسبت سے نہیں بلکہ جرم کے اثرات، ان اثرات کی اہمیت، اس میں صرف ھونے والی صلاحیتوں، مجرم کی نیت و احوال کی نسبت سے قائم ھوتا ھے، اسے وقتی نسبت کے تناظر میں دیکھنا کم عقلی کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ کافر اس دنیا میں خدا کی ان گنت نعمتوں اور صلاحیتوں سے محظوظ ھوتا ھے مگر اپنے رب کا انکار کر کے آخری درجے میں انکی ناشکری اور غلط استعمال کرتا ھے، وہ اپنی اس ناشکری اور صلاحیتوں کے غلط استعمال سے نجانے دیگر کتنے انسانوں کیلئے ایسی لاتعداد ناشکریوں و بغاوتوں کا باعث بنتا ھے، وہ اپنے اندر یہ جذبہ موجزن پا کر اس دنیا سے رخصت ھوتا ھے کہ اگر مجھے ہمیشہ کی زندگی بھی مل جائے تو بھی اس ناشکری و بغاوت کی روش پر قائم رھوں گا۔۔۔۔۔ لہذا وہ سزاوار ھے اس بات کا

کہ اسکا رب اسے اس سب کی ان گنت سزا دے دے (ہاں وہ چاھے تو کسی عذر کی بنا پر اپنے فضل سے اسے کم بھی کر سکتا ھے)۔

32

محدود جرم کی ''لامحدود'' سزا دینا غیر عقلی بات ہے؟(اس اعتراض میں فوکس' سزا کی لامحدودیت'' پر ہوتا ہے)

محدود جرم کی ''لامحدود'' سزا دینا غیر عقلی بات ہے؟(اس اعتراض میں فوکس' سزا کی لامحدودیت'' پر ہوتا ہے)۔

تبصرہ:

معترضین نے یہاں لامحدود کا معنی سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اصولی بات یہ کہ اصولا لامحدود اور محدود کا ' بالکل درست ' تصور قائم کر سکنا محدود انسانی عقل کی بساط ہی سے باہر ہے (یہاں اسکی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں)۔ چنانچہ لامحدود کا جو تصور ہم قائم کر سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ '' یہ ایک ان گنت، لاتعداد، اور ناقابل تصور بڑی شے ہے''۔ اب لامحدود کی اس وضاحت کو ذہن میں رکھیں اور اس بات کو اس کے ساتھ ملائیں کہ کافر اپنے رب کی لاتعداد نعمتوں کی (آخری درجے میں) ناشکری کرتا ہے لہذا ضروری ہے کہ اسے اس لاتعداد، ان گنت اور ناقابل تصور ناشکری کی اتنی ہی بڑی سزا دی جائے (اور یہ نسبت محض سزا ہی نہیں بلکہ اجر کیلئے بھی قائم کی گئی ہے)۔ اب اس بات پر کسی کو کیا اعتراض رہا؟

ملحدین لامحدود کو محض وقتی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ چلئے ایک لمحے کیلئے اس تصور لامحدود ہی کو بنیاد بنا لیتے ہیں۔ تو بھی اس سے یہی ثابت ہوا نا کہ ان گنت، لاتعداد اور ناقابل تصور بڑے جرم کی سزا کیلئے ان گنت، لاتعداد اور ناقابل تصور طویل زمانہ بھی موجود ھونا چاہئے، پھر قابل اعتراض بات کیا رہی؟

اس استدلال میں بنیادی غلطی یہ ھے کہ یہاں محض سزا کی وقتی طوالت کی طرف دیکھا جارھا ھے مگر جرم کی لامحدودیت (ناقابل تصور بڑے ھونے) کی طرف نہیں۔اسی یک جہتی سوچ کی وجہ سے یہ لوگ اپنے رب کی نعمتوں کا انتہائی ناقص تصور قائم کرتے ہیں جسکی وجہ سے یہ کافر کے جرم کی سنگینی کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسے ذرا بڑی جہت سے دیکھنے کی ضرورت ھے۔ انسان کا یہ چھ فٹ کا وجود خدا کی اس قدر ان گنت نعمتوں کا متقاضی ھے کہ انسان اسکا تصور بھی قائم نہیں کر سکتا۔ ذرا اپنے نفس جسم پر ہی غور کیجئے جو نجانے کتنے لاکھوں فنکشنز کے درست کام کرنے سے زندہ رہتا ھے، اپنی خوراک، سانس لینے کے نظام، کائنات میں روشنی کے انتظام الغرض اگر انسان غور کرتا چلا جائے تو معلوم ہوتا ھے کہ ایک چھپکلی کا وجود بھی انسانی وجود کے لئے نجانے کتنے انجان طریقوں سے مددگار ھے (یقینا اگر ھم خدا کی نعمتوں کا شمار کرنا بھی چاہیں تو شمار نہیں کر سکتے)۔ درحقیقت اس دنیا میں انسان کے سانس لینے کا عمل خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات اور اس میں بکھری ھوئی لاتعداد نعمتوں کا مرھون منت ھے۔ کافر اپنے رب کا انکار کرکے (آخری درجے میں) ان لاتعداد نعمتوں کی ناشکری کرکے ناقابل تصور بڑا جرم کرتا ھے۔ تو اگر اسکا رب اسے ایسے جرم پر ناقابل تصور بڑی سزا دے تو کیا غلط ھو گا؟

ویسے بھی، اگر دنیا میں چند لمحوں کے جرم پر خود ملاحدہ بھی کئی کئی سالوں پر محیط سزا دینے کو عقلی رویہ سمجھتے ہیں تو پھر یوم آخرت کے حوالے سے ایسا ماننے میں کونسی چیز امر مانع ھے؟

جب اخروی سزا کی ''لامحدودیت'' کی وضاحت کردی جائے کہ انسانی نسبت سے اس سے مراد ناقابل تصور بڑی شے اور ناقابل تصور طویل زمانہ ہے تو پھر ملاحدہ کی طرف سے یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ دنیاوی جرم (مثلا امریکہ کا ایٹم بم گرانا ہی کیوں نہ ہو) بہرحال متناہی (قابل تصور بڑا) ہوتا ہے لہذا اسکی سزا لامتناہی

(نا قابل تصور بڑی) نہیں ہونی چاہئے۔ (اس اعتراض میں فوکس جرم کی محدودیت ثابت کرنے کی طرف ہوتا ہے)

تبصرہ:

ملحدین جب کہتے ہیں کہ امریکہ کا ایٹم بم گرانا بہر حال ایک قابل تصور بڑا یعنی محدود جرم ھے تو یہ دعوی کرتے وقت یہ لوگ دو غلط مفروضات قائم کئے ھوئے ہیں:

(الف) ایک فعل کے تمام امکانی اثرات اور ڈائمنشنز کا احاطہ کرنا انسان کیلئے ممکن ھے

ب) جرم کی سنگینی ان تمام قابل احاطہ جہات کے اثرات کا سادہ حاصل جمع ھے (یعنی انہیں وزن دینے کی کوئ ضرورت نہیں)۔ یہ دونوں ہی مفروضے غلط ہیں۔ ذیل میں انکی مختصر وضاحت کی جاتی ھے:

الف) ایٹم بم کی جہت صرف یہی نہیں کہ اس کے چلنے سے بس چند لاکھ لوگ لقمہ اجل بن گئے، یہ محض اسکی 'ایک' جہت ھے۔ ذرا ان لاکھوں افراد کے لواحقین اور انکی آنے والی نسلوں پر اسکے اثرات پر غور کریں، اس عمل سے جو بے شمار بیماریاں نسل در نسل ان لوگوں میں در آئیں ذرا اس پر بھی توجہ رہے، پھر ذہن انسانی پر اس عمل کے جو انمٹ خوفناک اثرات آئے اسے بھی نہیں بھولنا چاھئے، پھر مختلف اقوام کے درمیان نفرت اور غضب کی جو کیفیات اس عمل نے طاری کیں یہاں تک کہ یہ ایک ڈسکورس کی شکل اختیار کر گیا اسے بھی یاد رکھیں، پھر اس عمل نے اقوام پر اپنے مد مقابل کو زیر کرنے کیلئے خوفناک ہتھیار بنانے کی جو ریس مسلط کر دی وہ بھی ذہن نشین رہے، اتنا ہی نہیں ایک ایسا اکیڈمک ڈسکورس بھی تیار کر لیا گیا جو اس سفاکانہ عمل کا جواز بھی فراھم کرنے کے کوشش کرتا ہے اور اس ڈسکورس سے نجانے کتنے انسان

کس کس طرح متاثر ہوئے، پھر اس عمل نے تاریخ کے دھارے پر بھی اثرات ڈالے وغیرہ۔ یہ مختصر تفصیل بتانے کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ امریکہ کا ایٹم بم چلانا ایک سادہ سا عمل نہیں ھے کہ جسے کوئی بڑی آسانی سے 'محدود' کہہ کر آگے بڑھ جائے۔ چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انسانی اعمال کے اثرات کی امکانی جہات اسقدر ہیں کہ انکا احاطہ کرنا سرے سے محدود انسانی ذہن کے بس کی بات ہی نہیں یہ صرف خدا اپنے لامحدود علم ہی سے کر سکتا ھے جو وہ آخرت میں کرے گا اور اسکی بنیاد پر سزا (وانعام) کا تعین ھو گا۔ پس جس کا جرم ناقابل تصور بڑا ھو گا اسے ایسی ہی سزا ملے گی اور وہ اسی کا حقدار ہے

ب) چلئے ایک لمحے کیلئے فرض کر لیتے ہیں کہ ایک فعل کی تمام امکانی جہات کا احاطہ انسانی ذہن کیلئے ممکن ھے۔ تب بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ فعل بذات خود متناہی و محدود ھے جب تک کہ یہ فرض نہ کرلیا جائے کہ فعل کا حجم یا سائز محض ان جہات کا سادہ حاصل جمع ھے (size of the action is a “simple sum” of its all possible dimensions)۔ ظاہر ہے یہ ایک غلط مفروضہ ھے، مثلاً ایٹم بم گرا کر دو لاکھ انسانوں کو قتل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اسکا حجم ایک متناہی عدد 'دو لاکھ' کے برابر ہے۔ اس جرم کا حجم متعین کرنے کیلئے یہ طے کرنا بھی ضروری ھے کہ ایک فعل کی ہر جہت کا وزن، اھمیت یا سنگینی (weight) کیا ھونا چاہئے اور سزا کے تعین میں یہ کلیدی حیثیت رکھتا ھے۔ اگر ایک معصوم انسانی زندگی کے قتل کو نوع انسانی کے قتل کے مساوی قرار دیا جائے تو یقیناً اسکی سزا کا تصور اس سزا سے یکسر مختلف ہو گا جو ایک انسانی جان کے قتل کو 'ایک انسان کا قتل' فرض کرنے سے نکلے گا۔ چنانچہ اگر جہات کو متناہی مان بھی لیا جائے مگر ہر جہت اور اسکے اندر شامل اثرات کی سنگینی کا تعین کرنے والے اوزان (یعنی ان سے متعلقہ حساسیت) ناقابل تصور بڑی ھو گی تو فعل کا حجم بھی لامحدود ہو گا (اگرچہ

جہات محدود مان بھی لی جائیں)۔یعنی size of the action is not simple sum, rather “weighted sum” of its all possible dimensions. If weights are infinitely large, so will be the size of the action”

اب اس مقام پر مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کس جہت کو کتنی حساسیت یعنی ویٹ کے ساتھ سزا کے تعین میں شامل بحث کرنا ھے، ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی محدود ذہنی صلاحیتوں سے یہ کرنے سے عاجز ھے یہ خدا ہی اپنے لامحدود علم کی بنا پر کرے گا۔ جس کے برے اعمال کا وزن ناقابل تصور بڑا ہو گا اسے یقیناً ایسی ہی سزا ملے گی اور وہ اسی کا حقدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز قیامت اعمال ‘‘تولے’’ جائیں گے، ‘‘گنے’’ نہیں جائیں گے۔

33

سزا کا مقصد اصلاح ہوتا ہے، آخرت کی سزا کا مقصد کیا ہے؟

سزا کا بنیادی مقصد مجرم کی اصلاح ھوتا ھے، چونکہ آخرت کی طویل اور لا محدود سزا میں یہ عنصر موجود نہیں لھذا یہ سزا غیر عقلی اور غیر عادلانہ ھے۔

تبصرہ:

معترضین نے یہاں جرم اور اسکی سزا کا بنیادی تعلق قائم کرنے کے سلسلے میں نہایت بنیادی نوعیت کی ٹھوکر کھائی ھے جسکی وجہ یہ ھے کہ انہوں نے دو مختلف دنیا یعنی لائف ورلڈز (state of the worlds) کے معاملات واحکامات کو آپس میں خلط ملط کر دیا ھے۔

اصولی بات یہ ھے کہ جرم اور سزا کے درمیان بنیادی تعلق "عمل اور اسکی جزا" (یعنی اسکے "نتیجے") کا ھوتا ھے، اصلاح یا عبرت (setting an example) وغیرہ کا نہیں، اس قسم کے پہلو اضافی (relative) حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اضافی جہات کا تصور پیشگی طور پر ایک ایسی لائف ورلڈ کو فرض کرتا ھے جہاں فرد کو اپنے جرم کی جزا کے علاوہ مزید عمل کرنے کا موقع دینا موجود و مقصود ھو یا پھر دیگر افراد کو اس سزا سے سیکھ کر خود کو سدھارنے کا موقع دینا موجود و مقصود ھو۔ ظاہر ھے ایک ایسی لائف ورلڈ جہاں یہ دونوں پہلو سرے سے موجود یا مقصود ہی نہ ھوں وہاں سزا کو اصلاح و عبرت وغیرہ کے تناظر میں دیکھنا بذات خود ایک غیر عقلی اور غیر متصور بات بن جاتی ھے۔

اس بات کو ایک آسان مثال سے سمجھا جاسکتا ھے۔ایک ایسے جہان کا تصور کریں جہاں صرف دو لائف ورلڈ ہیں، ایک دارالعمل (جہاں آپ عمل کر رھے ہیں)، دوسری دارالجزا (جہاں اعمال کے "نتیجے" نکل رھے ہیں)، چنانچہ اس دوسری لائف ورلڈ کے بارے اگر کوئ شخص یہ کہے کہ سزا کا تعین اصلاح کیلئے ھونا چاہئے تو اسکا جواب صرف یہی ہو گا کہ اس لائف ورلڈ کے اندر یہ ایک غیر متعلقہ بات ھے، یہاں صرف نتیجہ نکلے گا۔ پس آخرت کی سزا کو اصلاح وغیرہ کے اضافی پہلوؤں پر جانچنا ایک ایسی ہی غیر متعلقہ بات ھے کیونکہ وہ دارالجزا ھے۔ مجرم کی اصلاح وغیرہ دارالعمل سے متعلق تصورات ہیں جو دارالجزاء میں متصور نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں آخرت کے دن جرم اور سزا کے تعلق کا ظہور تمام اضافی امور سے علی الرغم اپنی اصل شکل(pure form) ،یعنی عمل اور اسکے نتیجے کی صورت، میں ھو گا۔ پس اس پر یہ اعتراض بے معنی ہے۔

34

اچھے کام کرنے والے غیر مسلم کو آخرت میں سزا کیوں؟

یک ایسا بندہ (ملحد) جو خدا پر ایمان تو نہیں رکھتا مگر بے شمار اچھے کام کر رھا ھے (مثلا غریبوں کی مدد کر رھا ھے، ھسپتال بنا رھا ھے وغیرہ) نیز اچھے اخلاق کا حامل بھی ھے، تو خدا اسکے اچھے کاموں کو نظر انداز کر کے اس کے کفر یا شرک کی وجہ سے اسے سزا کیوں دے گا؟

تبصرہ:

یہاں گفتگو کے کئی تناظر ہیں۔ ایک یہ کہ نیک اعمال کا اجر اسے ملے گا جو اجر ملنے کی امید سے کام کر رھا ھے، جسے اجر ملنے کی امید ہی نہیں یا وہ اسے حاصل کرنے کی آرزو ہی نہیں رکھتا تو اگر اسے اجر نہ دیا جائے تو پھر وہ شکایت کس بات کی کر رھا ھے؟

پس ثواب بھی اسے ملے گا جو اپنے رب کی طرف سے حصول ثواب کی نیت اور امید رکھتا ھے، جسے اس اجر کی پرواہ ہی نہیں تو اسکا رب اگر اسکی پرواہ نہ کرے تو اسے شکایت بھی نہیں کرنی چاہئے (یہ اس شخص کے لحاظ سے ہے جو روز قیامت اپنے کفر کا کوئی واقعی عذر نہ رکھتا ہو گا، جسکا عذر ویلڈ ہو گا اسکا معاملہ الگ ہے جیسے پہلے کہا گیا)۔

دوسری بات یہ کہ 'اچھا کام' کوئی پروسیجرل (procedural) تصور نہیں بلکہ اچھا کام وہ ھوتا ھے جسکا حکم خدا نے دیا ھے اور وہ اس نیت ہی سے کیا جائے کہ اسکا حکم خدا نے دیا ھے نیز وہ اس سے راضی ھوتا ھے۔

مثلاا گر کوئی یہ سمجھ کر سچ بول رھاھے کہ یہ مار کیٹنگ کااصول ھے، یااس سے نفع زیادہ ھوتاھے، یااس میں میری قوم کا بھلاھے، یایہ میرے ضمیر کی آواز ھے، یاایسا کرنا مجھے اچھالگتاھے، یالوگوں میں میری نیک نامی ھوگی وغیرہ تو یہ عمل ہرگز بھی اچھا نہیں۔ پس عمل کی ادائیگی کرتے وقت جسکی نیت ہی حصول رضائے الہی نہیں وہ عمل اچھاھے ہی کب کہ اسکا اجر دیاجاناچاہئے ؟

بوجہ کفر اعمال کے غیر نفع بخش ہوجانے کو یوں سمجھئے گویاجیسے ایک شخص عمدہ کھیر توپکائے مگر ساتھ تھوڑا زہر بھی ملادے تووہ کھیر صحت بخش نہیں بلکہ موت ہی کا باعث ہوگی۔ کفر بھی اعمال کے لئے گویابمنزل زہر ہے

35

بیماراور معذور لوگوں کو بوجہ کفر آخرت میں سزا؟

جوانسان اس دنیامیں ان صلاحیتوں (مثلابینائی) کے بناپیدا ھواجوآپ کے بقول خدا کی لامحدود نعمتوں سے محظوظ ھونے کیلیئے ضروری ہیں اسے بوجہ کفر سزادینے کا کیامطلب ؟اسکی توزندگی ہی ایک سزاھے ؟

تبصرہ:

اس اعتراض کی دوجہات ہیں،

اولاخدا کے گرینڈ پلان میں ایسے بیمار انسانوں کی اصولی حیثیت کیاہے (جب ایسے لوگوں کی زندگیوں کو سزا قرار دیاجاتاہے تواسکا تعلق اس پہلی جہت سے ہے، ظاہر ہے ہم مسلمان اسے اس تناظر میں نہیں دیکھتے)،

دوئم خدا کے قانون جزاو سزا کا ایسے انسانوں کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

کیونکہ یہ سلسلی گفتگو اس دوسری جہت سے متعلق ہے لہذا یہاں صرف اس ہی جہت پر گفتگو ہو گی۔ چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا اپنے علم سے جانتا ہے کہ کس شخص کے پاس حق کو سمجھنے اور اسے قبول کرنے کی کس قدر صلاحیتیں و مواقع میسر ہیں، پھر وہ ہر شخص کو روز آخرت اپنا دفاع کرنے کا پورا پورا موقع بھی دے گا۔ پس خدا ہر شخص سے اسکی صلاحیتوں اور مواقع کی مناسبت سے مواخذہ کرے گا، ہر شخص کا عذر بھی اسے معلوم ہے یہاں تک کہ اس کے قلب کے احوال، نیت و میلانات تک اسکی نظر میں ہیں، جسکا عذر درست (valid) ہو گا اسی کے مطابق اسکا فیصلہ ہو گا اور کس کا عذر کتنا ویلڈ ہے یہ طے کرنے کی کوئی مکمل بنیاد انسان کے پاس موجود نہیں، یہ صرف خدا اپنے لامحدود علم سے کرے گا۔ لہذا جو خدا کی لامحدود نعمتوں کی ناشکری کے لئے کوئی عذر نہ رکھتا ہو گا اسے ایسی ہی سزا ملے گی اور وہ اسی کا حقدار ہے۔ جس کے پاس عذر ہو گا (مثلاً اس تک کسی ھادی کا مکمل پیغام نہ پہنچا یا اس میں اسے سمجھنے کی پیدائشی صلاحیت ہی نہ تھی وغیرہ) بفضل الٰہی اسے رعایت مل جانے کی امید ہے۔

36

جدت پسندوں کے ملحدین کیلیے عذر کے دلائل

ملاحدہ کے ''حق جنت'' کو محفوظ رکھنے کے لیے ''جدید محققین'' کا اسلوب کچھ یوں ہوتا ہے: ''اگر کوئی شخص پورے خلوص کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد بھی وجود باری تعالی پر کوئی قابل اطمینان دلیل نہ ملنے کی وجہ سے اس کا انکار کرے تو اسے معاف کر دیا جائے گا.'' یعنی وجود باری تعالی کوئی ایسا خفیہ، پیچیدہ و مشکل امر ہے جس میں ''پورے خلوص'' اور ''تحقیق'' کے بعد بھی گمراہ رہنے کا امکان موجود ہے، سبحان اللہ۔ بھائی ذرا غور تو کرو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس قدر واضح مسئلے میں غلطی لگنے کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں، ایک بدنیتی (یعنی خلوص نہ ہونا) اور دوسرا بد فہمی و عدم تحقیق (یعنی تحقیق نہ کرنا)۔ جب دونوں ہی موجود تھے تو غلطی لگنے کا کیا مطلب؟ الغرض ''خلوص و تحقیق'' کے ساتھ خدا کے وجود کا انکار، ایں خیال است محال است و جنوں۔ خدارا وجود باری تعالی جیسے واضح مسئلے پر ایمان اور کفر کے امکان کو ''خلوص اور تحقیق'' کی صفوں میں مساوی تو نہ کھڑا کیجیے، کہ ان کی موجودگی کے باوجود دونوں کا امکان مساوی ہے۔

ایمان اپنی ذات میں عقل (rationality) ہے اور کفر حماقت (irrationality) ،اور ہمارے ان حضرات کا فرمانا ہے کہ خلوص و تحقیق کے باجود بھی دونوں کے ظہور کا امکان مساوی ہے، کیا کہنے ان کی فکری پیراڈئم کے۔ کفر (وہ بھی وجود باری تعالی جیسی بدیہی حقیقت کے انکار) کی کوئی ''پر خلوص اور محققانہ'' توجیہ ممکن نہیں، کفر (irrationality) اپنی ذات میں کج روی اور کج فہمی ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ جس طرح دن اور رات مساوی نہیں، اسی طرح خلوص اور تحقیق کے بعد ایمان اور کفر کا امکان مساوی نہیں، یہ بات خود اللہ تعالی کی بیان کردہ سکیم ہی کے خلاف ہے۔ جو کوئی خلوص نیت کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو، اس کا رب اسے گمراہیوں کی وادیوں میں بھٹکنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑا کرتا۔ پس اس معاملے میں جو کوئی یہاں گمراہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس کی نیت و تحقیق میں لازما کج روی شامل ہے۔ چنانچہ خلوص و تحقیق سے ماوراء کوئی تیسرا عذر تراشیے کیونکہ یہ دلیل اپنی وضع میں ہی باطل ہے۔

خدا (کائنات کا ایک خالق) ہے'' ان معنی میں اس کائنات کا ایک واضح ترین ثابت شدہ قضیہ ہے کہ یہ اس کائنات اور انسان کی سب سے زیادہ قرین قیاس توجیہ ہے۔ جو اس قضیے کا منکر ہے، بار ثبوت اس کے ذمے ہے کہ وہ انسانی ذہن و قلب کے لیے اس کائنات کے بارے میں اس سے زیادہ قرین قیاس و اطمینان بخش توجیہ پیش کرے۔ ایسی کوئی توجیہ کبھی موجود تھی اور نہ ممکن ہے، ایسی ہر توجیہ ایک وہم ہے اور اس توجیہ پر ڈٹے رہنا ضد و سرکشی کی علامت ہے۔ لوگ اس سرکشی کا شکار متعدد وجوہ کی بنا پر ہوتے ہیں، مثلا اپنے ماضی کے بعض برے تجربات کی بنا پر، اہل مذہب سے نفرت کی بنا پر، کسی غلط دلیل کی بنا پر اور یا پھر ''الحاد کے فیشن'' سے متاثر ہو کر (اکثریت کا تعلق اس آخری قبیل سے ہے)۔ خدا کا انکار کرنا اس کائنات کی سب سے بڑی حماقت ہے، یعنی یہ اپنی ذات میں حماقت (irrationality) ہے، کیونکہ یہ ''اپنے وجود کی

حقیقت ''(کہ میں مخلوق ہوں) کی نفی ہے،اور حماقت کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہیں، ہاں یہ بوجہ ''نفسیاتی عوارض'' ممکن ہے۔

پس جو شخص مثلاً ڈاکنز کی طرح سب کچھ پڑھ لکھ اور سمجھ چکنے کے بعد بھی یہ کہے کہ ''میں خدا کے وجود پر مطمئن نہیں ہو سکا'' تو یہ صرف اس کی فطرت و عقل کے مسخ ہو چکنے کا اظہار ہوتا ہے، نہ کہ کوئی ''عقلی ابہام'' وغیرہ۔ ایسا شخص بدنصیب ہونے کے ساتھ ساتھ ان معنی میں قابل رحم بھی ہے کہ اپنی فطرت کو یوں آخری درجے تک مسخ کر لینا، یہ کوئی آسان کام تھوڑی ہے۔ ایسے شخص کے ایمان کے لیے دل سے ''دعا'' کرنے کا حکم ہے نہ کہ اسے اپنے کفر والحاد پر مطمئن ہو کر خدا سے مناظرے کا موقع مل سکنے کی امید دلانے کا کہ گویا ''آپ ماشاءاللہ نہایت نارمل نفسی کیفیت کا شکار ہیں، کوئی ٹینشن کی بات نہیں ہے، بس اللہ سے مناظرے کی تیاری کر رکھو''۔ خدا کا وجود مذہب کے نزدیک ایک قطعی اور بدیہی (self evident) حقیقت ہے اور جس کا انکار صرف جہالت، بددیانتی، کج روی وضد وغیرہ ہی کی بنا پر ممکن ہے، کیونکہ یہ خود ''اپنی ذات (کہ میں اصلا مخلوق ہوں) کی نفی'' کے ہم معنی ہے۔ ذات کی اس نفی کی ایسی کوئی ''عقلی توجیہ'' ممکن نہیں جو خود بندوں ہی کے آگے چل سکے، چہ جائیکہ اس موضوع پر خدا کے حضور کامیاب مناظرہ کر کے خدا کو چپ کروا کر بچا جا سکے۔

*قرآنی آیات کے ساتھ مذاق

ایک افسوس ناک پوسٹ نظر سے گزری جس میں قرآن کی آیت وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا (آل عمران) کا خصوصی مصداق اسٹیون ہاکنگ کو قرار دے کر اسے ایک قرآنی ہیرو بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس پر یہی کہنے کو دل چاہتا ہے کہ یہ نہ صرف قرآن بلکہ خود اسٹیون ہاکنگ کے ساتھ بھی کسی مذاق سے کم نہیں۔ قرآن میں ہر جگہ ارض و سموات کی نشانیوں پر غور کرنے کا حاصل و مقصد ایمان کو قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق سے اگر ایک لمحے کے لیے سہو نظر کر بھی لیا جائے (ویتفکرون سے پہلے ہے: الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم۔ اور پھر آگے لمبی دعا ہے جس میں یہ بھی ہے: ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان آمنوا بربکم فآمنا۔) تو بھی خود اسی آیت میں کہا گیا ہے کہ ارض و سماوات پر غور و فکر کرنے والے وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! یقیناً تو نے یہ سب کچھ یونہی بلا وجہ پیدا نہیں کیا۔ اس کے برعکس مرحوم موصوف تمام عمر اپنے غور و فکر کے ذریعے اس کے برعکس نتیجہ ثابت کرنے میں گھلتے رہے کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں، نیز عقل کا تقاضا یہی ماننا ہے کہ یہ خود ہی بن گئی۔ تو ایسے غور و فکر کا بھلا قرآنی آیت کے غور و فکر سے کیا لینا دینا؟ اس کے برعکس ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کی زندگی پر ہی مر مٹے۔

ایک شخص ذہین ہے، مطالعہ کائنات کے کسی مخصوص شعبے کا ماہر ہے۔ اس علم میں ہونے والی تحقیقات کو اپنے مخصوص ملحدانہ رجحانات کی بنا پر اس طرح منظم انداز میں پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے اس علم کے بہت سے طالب علم فتنے میں پڑ جاتے ہیں اور گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسا ذہین شخص صرف اپنی گمراہی کے لیے ہی نہیں بلکہ خدا کی دی ہوئی اس ذہانت کو غلط استعمال کر کے دوسروں کی گمراہی کا سبب بننے کے

جرم میں بھی خدا کی عدالت میں جوابدہ ہو گا۔ شاید اس کے دل میں یہ ہو اور وہ ہو جیسے حیلے بہانے اس دوسرے جرم میں خدا کے حضور اس کی کفایت کرنے میں مددگار نہیں ہو سکتے۔

ایک عجیب وغریب دلیل یہ دی جاتی ہے کہ الحاد ایک شخص کا ذاتی مسئلہ ہے، اور یہ بس ایک نظریاتی اختلاف ہے۔ جاننا چاہیے کہ الحاد نہ کوئی ذاتی چیز ہے اور نہ ہی محض کوئی معمولی نوعیت کا نظریاتی اختلاف، کہ چلو کسی نے خدا کو مان لیا یا نہیں۔ یہ دنیا ومافیہ کو معنی دے کر زندگی بسر کرنے کے دو متضاد تصورات ہیں (اور ان معنی میں الحاد ایک مذہب ہی کی طرح ہے)۔ یہ الحاد یا عقیدہ کسی کا کوئی نجی معاملہ نہیں ہے خصوصا ایسا شخص جس نے الحاد کے فروغ کو زندگی کا مقصد بنا رکھا ہو۔

ملحدین ایک ایسی معاشرت وریاست تعمیر کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں جہاں خدا کا حکم اجتماعی سے لے کر انفرادی ہر سطح میں کھیل تماشا بن جائے۔ ایسے معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے کو پھر یہ سمجھ ہی نہیں آتی کہ آخر خدا کو ماننے یا نہ ماننے سے میری تعمیر کردہ دنیا ومافیہ میں ایسا کیا فرق پڑ جاتا ہے کہ اس پر سیخ پا ہوا جائے؟ جدید انسان اسی المیے کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور انسان کو اس کے رب کا باغی بنا کر اس المیے کا شکار کرنے والے اس نظریے کے مبلغین وعلمبردار انسانیت کے بدترین مجرم ہیں۔

ڈاکٹر زاہد مغل

37

اسٹیون ہاکنگ اور ایمان کے بغیر جنت؟

ابن انشاء نے ایک سکول ماسٹر کی کہانی لکھی۔ بد قسمتی سے اس سکول ماسٹر نے ریاست میں مثالی استاد کا ٹائٹل جیت لیا تھا۔ اپنی بے مثل محنت، اپنے پیشے سے بے مثال لگاؤ اور اپنی کبھی نہ ٹوٹنے والی باقاعدگی کے باعث پوری ریاست کے ماسٹروں میں یہ شخص اول رہا تھا۔ اس شخص کی حسنِ کارکردگی سے ریاست کا بادشاہ بہت خوش ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس شخص کو کسی سکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر ترقی دے دی جائے۔ اتفاق سے پورے شہر میں کوئی سکول ایسا نہ ملا، جہاں ہیڈ ماسٹر کی سیٹ خالی ہو۔ پورے صوبے اور پھر پوری ریاست میں بھی تلاش کر کے دیکھ لیا گیا۔ افسوس مگر پورا ملک بھی اس بے چارے نئے ہیڈ ماسٹر کو جگہ دینے کیلئے تیار نہ ہوا۔ بادشاہ بھی اپنی دھن کا پکا تھا، اس نے کہا، اسے کسی نہ کسی شعبے کا ہیڈ تو اب میں بنا کے ہی رہوں گا، لہذا اس نے ٹاسک ذرا سا وسیع کر دیا اور حکم صادر فرمایا کہ سکول تک محدود رہنے کی ضرورت نہیں، اب کوئی سا بھی ایسا شعبہ چلے گا، جہاں ہیڈ کی سیٹ خالی ہو۔ اب نئے سرے سے جامع تلاش شروع ہوئی تو بالآخر

ایک شعبے میں کامیابی نصیب ہو گئی۔ شہر کے سرکاری ہسپتال کے زچہ و بچہ ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ نرس کی سیٹ خالی مل گئی۔ یہ سیٹ خالی بھی تھی اور تھی بھی ہیڈ کی، چنانچہ بادشاہ نے فی الفور آرڈر جاری فرما دیئے کہ اس مثالی سکول ماسٹر کو اسی شعبے میں ہیڈ نرس کے عہدے پر ترقی دے دی جائے۔ گو سکول ماسٹر بہت سٹپٹایا کہ وہ صرف تعلیمی خدمات سرانجام دے سکتا ہے، زچہ و بچہ ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ نرس کی سروسز دینے کے تو وہ بالکل قابل نہیں۔ مگر بادشاہ نے اسے کارِ سرکار میں مداخلت سے باز رہنے کی تنبیہ کرتے ہوئے اگلے دن متعلقہ شعبے میں حاضر ہونے کی خوشخبری سنادی۔

ممکن ہے یہ لطیفہ ہی ہو۔ ہمارے ہاں مگر اس لطیفے کو سچ کرنے کی کوشش بہت پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ رواج سا چل نکلا ہے کہ جب بھی کوئی مشہور شخص فوت ہو جائے تو اس کی تعلیمی قابلیت دیکھے بغیر اسے کسی نہ کسی ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بنانے کی سر توڑ کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ سٹیفن ہاکنگ کی وفات کے موقع پر بھی دیکھنے میں آیا۔ ایک طرف ہمیں اپنے بعض مذہب پسند دوستوں سے شکوہ رہتا ہے کہ وہ کسی گنہگار مسلمان کی وفات پر اس کے بارے میں حتمی بات کہنے سے گریز نہیں کرتے تو دوسری طرف ہمارے غیر مذہبی دوست بھی حد ہی کر گزرتے ہیں۔ ایک طرف یہ احباب زور لگاتے رہتے ہیں کہ مذہب اور خدا کوئی وجود نہیں رکھتے، یہ نادانوں کے تراشے ہوئے تخیل ہیں تو دوسری طرف کسی بھی مشہور شخص کے فوت ہونے پر فوراً اس کے لیے مذہبی جنت الاٹ کروانے پر بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کی کاوش اور خواہش دیکھ کر واصف علی واصف یاد آتے ہیں، جن کا مقولہ مشہور ہے، زندگی ہم فرعون کی اور عاقبت ہم سیدنا موسیٰؑ کی پانا چاہتے ہیں۔ سوچنے پر پابندی نہیں، ایسا مگر ہوا نہیں کرتا۔ باقی باتیں چھوڑیئے، میں تو یہ سوچ کے پریشان ہو جاتا ہوں کہ آخر اس موقع پر لادینیت اور الحاد سے آپ جیسے اصول

پرستوں کا ایمان کیسے ہٹ جاتا ہے ؟ دیکھئے جنت اور دوزخ کے معاملات پوشیدہ ہیں، مگر ان کے راستے بالکل پوشیدہ نہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جن کو زبانِ نبوت سے جنت کی نوید یا جہنم کی وعید سنائی جا چکی، ہم صرف امید کر سکتے ہیں، کسی کو حتمی جنتی یا جہنمی نہیں کہہ سکتے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم مکمل اندھیرے میں ہوں یا اندھیر مچا دینے کا پروانہ بھی حاصل کر چکے ہوں۔ یقیناً ہم راستے بھی بخوبی پہچانتے ہیں اور راستوں کی منزلیں بھی جانتے ہیں۔

جنت کا راستہ ایمان کے دروازے سے شروع ہوتا ہے۔ اگر آپ کے خیال میں ایمان کی کوئی قدر ہی نہیں تو پھر اس سارے سلسلے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی، جو آدم کی آفرینش سے لے کر حضرت عبدالمطلب کے پوتے نبی محترمؐ تک آن پہنچا۔ اگر ایمان ایک اضافی چیز ہے تو پھر سیدنا موسیٰؑ کے فرعون، سیدنا عیسیٰؑ کے اپنے مخالفوں، جنابِ ابراہیمؑ کے نمرود اور نبیٔ رحمت کے کفارِ قریش کے خلاف ڈٹ جانے کا کیا مطلب رہ جاتا ہے ؟ ایک تواتر سے کچھ دوست سائنس کی خدمات سرانجام دینے والوں کو انسانیت کا مسیحا قرار دینے لگے ہیں۔ بعض احباب تو لکھ چکے کہ اللہ کے ولی بھی دراصل یہی ہیں، جو انسانیت کے لیے راحت کشید کرتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں، تب ایوب خان کے ملک کو قرض میں ڈبو دینے کو آپ کیوں برا سمجھتے ہیں، اس لیے ہی نا کہ انھوں نے وقتی آسودگی کے لیے ملک کا مستقبل قرض تلے دبا دیا۔ فرض کریں کوئی شخص سکول کے بچے کو کتابوں کی مشقت سے ہٹا کر کھیل کے میدان میں لے جائے، بیٹ پکڑائے اور کھلانے لگے ؟ بچہ اس سے خوش ہو سکتا ہے، مگر کیا دانا و بینا اور باشعور لوگ بھی اصلی مقصد کی تکمیل کی جگہ کھیل کود پسند کرنے لگیں گے ؟ اور کیا کھیل کے میدان میں سال گزار دینے والا طالب علم پاس بھی ہو جائے گا؟ فرض کریں ایک شخص ہر روز آپ کر دفتر جانے نہ دے اور گاڑی میں گھمانے لے جائے ؟ اور کیا

سارا مہینہ دفتر کو شکل نہ دکھانے والا شخص تنخواہ بھی پالے گا؟ تو کیا بچے کا کھیل اور گاڑی انجوائے کرنے کی سہولیات دونوں کے بہتر مستقبل کی ضامن بھی ہوں گی؟ قبرستان ہمیں بتاتے ہیں کہ اس جہاں کی راحت اصلی راحت نہیں۔ بھلا اس مسافر سے زیادہ بد قسمت کون ہو گا، جو مسافر خانے کی سہولیات دیکھ کر اپنی منزل ہی بھلا بیٹھے؟ تو کیا راہ کی خوبی و خوبصورتی پر ریجھ جانے والا شخص منزل بھی پالیتا ہے؟ حق یہ ہے کہ یہ دنیا ایک سواری ہے، کامیابی اس سواری کو سہولتوں اور آسائشوں سے بھر دینے کی نہیں، بات اسے درست راہ پر لگا دینے کی ہے۔

بات پھر وہی کہ جب آپ اس نظام کو ماننا نہیں چاہتے تو اس کی اصطلاح پر کیوں حق جمانا چاہتے ہیں؟ یہ سب کچھ اسی مذہب کا دیا ہے جو آپ کو پسند نہیں آتا۔ بہر حال خدا کی جنت پانے کے لیے خدا پر ایمان لانا پڑتا ہے، اور اس کے قاصدوں کو اور اس کے بھیجے ہوئے آئین کو مشعلِ راہ بنانا پڑتا ہے۔ ایمان ہی سے دراصل آخرت میں آپ کا اکاونٹ کھلتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے ایسا بھی کیا کہ جس بینک میں آپ کا اکاؤنٹ ہی نہ ہو، وہاں سے آپ روپے نکلوانے بھی جا پہنچے ہوں؟ جس سوسائٹی کی آپ کے پاس فائل ہی نہ ہو، وہاں آپ پلاٹ پانے بھی جا دھمکے ہوں؟ ایمان کا اکاؤنٹ ہونا پہلی بات ہے، اس میں نیکیوں کا بیلنس بھرنا اگلی بات ہے۔ اکاؤنٹ اگر موجود ہو تو ممکن ہے کسی سکیم سے آپ پھر بھی کچھ فائدہ اٹھالیں، اکاؤنٹ ہی اگر موجود نہیں اور آپ حصہ دار بننے پر بھی مصر ہیں تو پھر آپ یقیناً ہمارے ہاں کے لبرل کہلانے کے مستحق ہیں، یعنی خود کو اور دوسروں کو دھوکا دینے کے خبط میں مبتلا۔ یہ دھوکا مگر آپ کو کیا دے سکے گا؟

تحریر یوسف سراج

38

ملحد کو بھی جنتی کہو ؟

سیکولرز کا مذھب پسندوں کو عمومی طعنہ یہ بھی دیتے ہیں کہ تم مذھبی لوگ خود کو خدا کے مقام پر بٹھا کر گفتگو کرتے ہو کہ خدا یہ کہتا ہے اور وہ کہتا ہے۔ کسی ملحد کو کافر نہ کہو اس لئے کہ یہ اللہ اور بندے کے درمیان معاملہ ہے۔ خدا کسی کے ساتھ یوں کرے گا یا ووں، ایسا کہنا خدا کے اختیار میں مداخلت کرنا ہے۔ اللہ تعالی نے ''فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر'' میں انسانوں کو کفر کے انتخاب کا حق دیا ہے۔

جواب:

دین کو ''انفرادی سطح'' تک محدود کر کے لغو بنا دینے والے اس ڈسکورس کی منازل یوں ہیں:- کسی غیر مسلم کو کافر نہ کہو اس لئے کہ یہ اللہ اور بندے کے درمیان معاملہ ہے۔۔۔۔۔۔ کسی ملحد کو کافر نہ کہو اس لئے کہ یہ اللہ اور بندے کے درمیان معاملہ ہے۔۔۔۔۔ کسی کے عمل فسق پر کوئی حکم نہ لگاؤ اس لئے کہ یہ اللہ اور

بندے کے درمیان معاملہ ہے۔۔۔ خدا کیا چاہتا ہے اور بندے کے کس عمل سے خوش ہو گا یہ اللہ اور بندے کے درمیان معاملہ ہے۔۔۔۔۔۔ تم کون ہوتے ہو بندے اور رب کے درمیان مفتی بننے والے؟

گویا اللہ نے اپنی کتاب بندوں کے مابین حکم جاری کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے نازل کی تھی۔ فرماتے ہیں ''تم مذھبی لوگ خود کو خدا کے مقام پر بٹھا کر گفتگو کرتے ہو کہ خدا یہ کہتا ہے اور وہ کہتا ہے'' جناب یہ جو آپ خود کو خدا سے بھی اوپر مقام پر بٹھا کر خدا کے احکامات منسوخ کرتے ہیں کہ اجتماعی دائرے میں خدا کا حکم لائق عمل نہیں' وہ کیا ہے؟

''خدا کسی کے ساتھ یوں کرے گا یا ووں، ایسا کہنا خدا کے اختیار میں مداخلت کرنا ہے۔'' یہ ایک اور غلط دلیل ہے جو کسی ملحد کی گمراہی بیان کرنے سے روکنے کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ اگر کوئی اپنی طرف سے ایسا کہے تو یقیناً یہ خدا کی سلطنت میں مداخلت ہے۔ لیکن اگر وہ خدا کی نازل کی ہوئی دلیل کی بنیاد پر ایسا کہے کہ خدا بدکار کو عذاب دے سکتا ہے تو یہ مداخلت نہیں بلکہ سچ بولنا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ ''خدا فلاں کے ساتھ ایسا کرے گا''، اس میں بھی مراد خدا کے اس وعدے کی طرف حوالہ دینا ہوتا ہے جو خود اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ مثلاً خدا اگر کہتا ہے کہ ''میں فلاں گناہ یا نیک کام کرنے والے کے ساتھ ایسا کروں گا'' اور کوئی شخص ایسے گناہ یا نیک کام کرنے والے کے بارے میں کہے کہ خدا تمہارے ساتھ یہ کرے گا تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ خدا نے جو وعدہ کیا ہے ھمیں امید ہے کہ وہ اسے پورا کرے گا۔ اس کا ھرگز بھی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خدا کو حکم دیا جا رہا ہے یا خدا کی مرضی پر کوئی پہرہ بٹھایا جا رہا ہے۔

کفر کے انتخاب کی آزادی: حق یا صلاحیت؟

بعض لوگوں کو یہ دھوکہ لگ گیا ہے گویا اللہ تعالی نے ''فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر'' کے اعلان کے ذریعے انسانوں کو ''کوئی سیکولرانہ حق کفر'' تفویض کر دیا ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کو ایمان و کفر کے درمیان انتخاب کا ''اختیاری حق'' دیا ہے، مطلب کفر اختیار کرنا ''حق'' نہیں بلکہ ''مراعت یا مہلت'' ہے؟

جاننا چاہئے کہ اللہ تعالی نے انسان کو ایمان و کفر کے مابین اختیار کا حق نہیں دیا بلکہ ''صلاحیت'' دی ہے۔ صلاحیت و حق کا یہ فرق سمجھنا لازم ہے۔ صلاحیت کا تعلق اس امر سے ہے کہ ''میں کیا کر سکتا ہوں''، جبکہ حق کا تعلق اس امر سے ہوتا ہے کہ ''مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' صلاحیت تو ایک میسر ذریعے (resource) کا نام ہے۔ مثلاً خدا نے انسان کو آنکھ سے دیکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی، تو کیا اس کا معنی یہ ہوا کہ اب آنکھ سے اچھا یا برا دیکھنا، یہ انسان کا حق ہے؟ ہر گز بھی نہیں بلکہ اس ذریعے و صلاحیت کو استعمال کرنے کا حق اسی قدر اور وہی ہے جو خدا نے بتایا۔ اب اگر میں صلاحیت کو اس فعل کے لئے استعمال کروں جس سے منع کیا گیا تو یہ اس صلاحیت کا غلط استعمال کہلائے گا، نہ کہ حق۔ اسی طرح مثلاً خدا نے مجھے یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ میں کسی کی جان لے سکوں، مگر ظاہر ہے یہ میرا حق نہیں۔ چنانچہ کسی امر کی صلاحیت ہونا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوتی اور یہ بات بالکل واضح ہے۔

بعینہ جب خدا کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو اچھائی و برائی کے دونوں راستے دکھا کر اسے انتخاب کے لئے چھوڑ دیا ہے، تو اس کا معنی یہی ہے کہ خدا نے انسان کو اچھائی و برائی کے معاملے میں مجبور نہیں کر دیا بلکہ اسے انتخاب کی صلاحیت دی ہے۔ یہاں ایمان و کفر کے مابین انتخاب کی آزادی بمعنی ایک ''ریسورس'' ہے، یعنی جس طرح انسان کے پاس دیکھنے کے لئے آنکھ کا ریسورس میسر ہے اسی طرح اس کے پاس انتخاب کا

ریسورس وذریعہ (آزادی) بھی میسر ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس صلاحیت کے ذریعے کفر اختیار کرنا انسان کا حق ہے، ہر گز بھی نہیں۔ حق کا تعین صلاحیت کے میسر ہونے سے نہیں بلکہ اس کو استعمال میں لانے کے سوال سے ہوتا ہے۔ انسان کا حق وہ ہے جسے خدا نے اس کے لئے مشروع کیا اور وہ اس سے راضی ہوا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ باطل اختیار کرنے کی اجازت کبھی "حق" کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت محض ایک "وقتی مہلت" یا "اضافی مراعت (privilege)" کی سی ہوتی ہے۔ خدا کے بنائی ہوئے اس دارالامتحان میں انسانوں کو کفر کا "اختیار" دینے کا یہی معاملہ ہے، یہ کوئی "حق" نہیں۔ اس دنیا میں کوئی ایک بیوقوف بھی ایسا نہیں کہ جسے وہ قطعی طور پر "باطل" کہتا ہو پھر اسے کسی کا "حق" بھی قرار دے، چہ جائیکہ خدا سے اس کی امید رکھی جائے۔ اس رویے کی امید صرف کسی ایسے ہی شخص سے رکھی جاسکتی ہے جسے اپنے بیان کردہ حق پر کوئی شک ہو یا وہ حق ہی کو اضافی معاملہ سمجھتا ہو۔ تو کیا خدا کو اپنے حق ہونے پر کوئی شک تھا اور یا وہ اپنی بات کے سواء کسی دوسرے معاملے کو بھی حق سمجھتا تھا کہ اپنی بات کے "کفر کا حق" دے کر ایمان و کفر کو مساوی سطح پر ایک ہی لڑی میں پرو دیا؟ کچھ تو عقل کی بات کرو۔ جو ہے ہی "باطل" اس کے "حق" ہونے کا کیا مطلب بھائی؟ یہ تو contradiction in term ہے۔ انسان کو "حق" اسی امر کا ہے جو "حق" ہے، ہاں اگر کہیں حق ہونا واضح ہی نہیں تو پھر بات الگ ہے۔ مگر خدا کے لئے اس امکان کا کیا مطلب؟ کیا اس پر بھی حق کا کچھ اخفا تھا کہ وہ "کفر کا حق" دیتا رہا؟ خدا کی نظر میں کفر جس قدر قبیح امر ہے اگر دنیا کو دارالامتحان بنانا مقصود نہ ہوتا تو لازم تھا کہ خدا بندوں کو زبردستی (by default) اسی طرح ایمان والا بنا دیتا جیسے دیگر مخلوقات کو اپنے ارادے کا پابند بنایا۔ تو جناب خدا

کی طرف سے کفر کا اختیار محض ایک وقتی privilege و مہلت نما چیز ہے، یہ کسی کا کوئی ''حق'' نہیں۔ ''حق'' یہ ہے کہ کفر اختیار کرنے کی اس صلاحیت سے دستبردار ہو کر اس کی بات پر ایمان لایا جائے۔

ڈاکٹر زاہد مغل

39

کیا خدا کو نہ مان سکنا ایک عذر ہو سکتا ہے؟

کیا فی زمانہ خدا کو نہ مان سکنا کسی ملحد یا کافر کے لیے ایک عذر ہو سکتا ہے؟

جواب: یہ سوال پڑھتے ہی ذہن میں جیسے آیات کی بارش ہونا شروع ہو گئی ہو جو یہ کہہ رہی ہیں کہ خدا کو نہ مان سکنا کوئی عذر نہیں ہے۔ اب یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ ان آیات میں سے کیا نقل کروں اور کیا چھوڑ دوں لیکن یہ بات اس لیے کہہ دی کہ کہ ہمارا دین اس مسئلے میں کس قدر واضح ہے اور کتنی شدت سے واضح ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ جس یہودی اور عیسائی تک میری نبوت کی خبر پہنچ گئی اور وہ مجھ پر ایمان لائے بغیر مر گیا، تو وہ اہل جہنم میں سے ہے۔

خدا کو نہ مان سکنے کو عذر قرار دینا ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی کو خدا نے آنکھیں دیں اور وہ کہے کہ میرے لیے نہ دیکھنا اس لیے عذر مان لیں کہ فضا میں گرد بہت تھی۔ بھئی، فضا میں جتنی مرضی گرد ہو، تمہارے خدا نے

اس گرد کا لحاظ کرتے ہوئے تمہیں قوت بصارت دی ہے۔ اور پھر یہ کہ اسی گرد میں تمہارے ہی جیسے بہت سوں کو خدا نظر آرہا ہے اور اگر تمہیں نظر نہیں آرہا ہے تو بصارت نہیں بلکہ دل کمزور ہو چکا ہے۔ اور اس کو قوت بخشنے کے لیے سورۃ المدثر کی آیات 11-31 کی تلاوت کرو۔ پھر اس عذر کی شرعی دلیل کیا ہے؟

تو خود خدا کے بیان کے مطابق خدا نے ہر انسان کو فطرت پر پیدا کیا ہے اور ہماری دینی روایت میں فطرت سے مراد اسلام ہے۔ ہر شخص اسلام کو قبول کرنے کی صلاحیت اور مادہ لے کر پیدا ہوتا ہے جیسا کہ بصارت اور سماعت کی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ تو خدا کو ماننے میں اصل حجت یہی استعداد فطرت ہے جبکہ نبیوں کے پیغام کا کسی تک پہنچ جانا تو یہ تو اتمام حجت ہو گئی۔ اب تو کسی قسم کا عذر باقی نہیں رہ گیا۔ ارشاد باری تعالی ہے: رُسُلاً مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ ترجمہ: ہم نے رسول بھیجے جو کہ خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے ہیں، تاکہ لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔

اب کون ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ اسٹیون ہاکنگ یا کسی ملحد اور کافر کی رسائی (access) قرآن مجید تک نہیں ہے، اور وہ بھی اسی کی زبان میں ترجمہ شدہ موجود ہے، بلکہ اس کے اسمارٹ فون میں موجود ہے۔ پھر خدا کو ماننا تو صرف اسلام کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے۔ تو مسلمانوں کی حالت اگر اتنی پتلی ہے کہ خدا کے ماننے میں تمہارے لیے رکاوٹ بن رہی ہے تو عیسائیوں کو دیکھ کر ایمان لے آؤ، نیوٹن اور آئن اسٹائن سے سبق لے لو، وہ تو تمہاری فیلڈ کے لوگ ہیں نا۔ کیا تمہاری فیلڈ میں سینکڑوں سائنسدان اور نوبل پرائز ہولڈر ایسے نہیں ہیں کہ جن کے لیے خدا کو مان لینا عذر نہیں بن سکا؟ کیا خدا تمہارے اس عذر کے جواب میں یہ سوال نہیں کر سکتا؟

بھئی، اگر خدا کو نہ مان سکنا ایک عذر ہے تو جس زمانے اور حالات کے جبر میں ہم زندگی گزار رہے ہیں تو ان میں گناہ کرنا بھی ایک عذر ہے۔ اس قدر بے حیائی، عریانی اور فحاشی کے سیلاب اور پھر انسان کی سب سے قوی جبلت جنس کی موجودگی میں ایک نوجوان کے لیے کیا زنا کرنا عذر نہیں بن سکتا؟ اگر نہیں تو ایک ملحد کے لیے یہی حالات خدا کو نہ مان سکنے میں کیوں عذر بن جاتے ہیں؟ زنا کے مسئلے میں تو اندر باہر سے اس پر جبر موجود ہے تو وہ عذر نہیں ہے تو الحاد کیسے عذر بن گیا جبکہ خود خدا کہہ رہا ہے کہ اندر سے تو مسئلہ میں نے نہیں رکھا ہے۔ عجب دین لبرل ازم ہے کہ ایک ملحد کے لیے جنت کی امید رکھیں اور ایک کلمہ گو [خارجی] کو جہنم کا کتا قرار دیں۔ Ignorance of law is no excuse even in a layman. یہ قاعدہ ماننے والے البتہ خدا کو نہ مان سکنے کے عذر کے لیے گنجائش نکال سکتے ہیں۔

ڈاکٹر زبیر

40

منکرِ خدا کا انجام

موجودِ خدا مذہب کی بنیاد ہے، اور اثبات و انکارِ خدا کا مسئلہ مذہب میں اس حد تک مصرح اور طے شدہ ہے کہ اس پر سوالات کی گنجائش بھی پیدا نہیں ہو پاتی۔ لیکن جدید عہد میں انسان کے ارضی و تاریخی حالات اور نفسی احوال میں بنیادی تغیر اور مذہبی اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے یہ سوال نئے نئے پہلوؤں سے سامنے آیا ہے۔ نٹشے کے نعرے کا مطلب یہی تھا کہ جدید انسان خدا پر یقین لانے کے نفسی وسائل سے محروم ہو گیا ہے۔ بعد میں یہ بھی اعلان ہو گیا کہ انسان مر گیا ہے۔ لیکن یہ سوال ایسا ہے کہ گویا جدید انسان کی ''میت'' پر مجاور کی طرح معتکف ہے۔ جدید انسان کی عقلی نارسائی اور نفسی علالت اسی مجاور کا سایہ ہے۔ فی زمانہ یہ سوال ایسا ہو گیا ہے کہ جاتا بھی نہیں ہے، اور کچھ لاتا بھی نہیں ہے۔

انسانی شعور کی ایقانی ساخت دو معروف طریقوں پر استوار ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک عقلی ہے اور دوسری مذہبی۔ عقل کی بنیاد پر بننے والی ایقانی ساخت کی کارگزاری سائنسی علوم میں سامنے آئی ہے، لیکن اس میں بھی ''گمراہیوں'' کا امکان ہوتا ہے، جیسے کہ سائنٹالوجی اور اس کی قبیل کے مواقف سے ظاہر ہے۔ اسی طرح مذہب کی بنیاد پر بننے والی ایقانی ساخت میں بھی ''گمراہیوں'' کا امکان ہوتا ہے جیسا کہ مذہبی عقائد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سائنس اور مذہب اپنے معروف و معلوم (standard) مؤقف سے کبھی دستبردار نہیں ہوتے اور نہ کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ سائنسی اور مذہبی علوم میں یہی مواقف بنیادی حوالے کا کام دیتے ہیں۔

جناب ابویحییٰ کے مختصر مضمون ''منکر خدا کا انجام'' میں جو موٴقف سامنے آیا ہے، وہ نہ تو عقلی ہے اور نہ مذہبی۔ یہ مضمون خوف اور بے یقینی کے عالم میں لکھی ہوئی فکشن ہے۔ اس مضمون کے غیر عقلی ہونے کے لیے اس کے ایک فقرے کو دیکھ لینا کافی ہے: ''اگر خدا کو ماننے والا شخص کسی طرح اللہ تعالیٰ کی جرح کا سامنا کرنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ ثابت کر دیا کہ واقعی اسے وجود خداوندی کا کوئی ثبوت حقیقی کوشش کے بعد بھی نہیں ملا تھا تو پھر اسے معاف کر دیا جائے گا، اور اس جرم کی پاداش میں جہنم میں نہیں پھینکا جائے گا''۔ یہ موٴقف یا تو مذہبی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں اس کا منصوص ہونا ضروری ہے، جو یہ نہیں ہے۔ یا یہ موقف عقلی ہو سکتا ہے اگر یہ عالم حواس کے بارے میں قائم کیا جائے۔ عقل محض کی بنیاد پر کوئی مفروضہ غیب کے بارے میں قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ عقل محض میں ناموجود و نامعلوم ہے۔ یہ عقل اور عقلی علم دونوں سے بے خبری ہے۔ غیب کو عقلی بنانا مذہبی لغویت ہے، اور عقل کو غیب میں جاری کرنا توہماتی لغویت ہے۔ لغویت نے جدید مغرب میں بڑا ادب پیدا کیا ہے، لیکن زیر نظر مضمون لغویت کی خواہش کا اظہار ہے۔

گزارش ہے کہ ایک آدمی مطالعے اور تحقیق، تجربے اور مشاہدے، اور غور و فکر کے بعد اگر الحاد اختیار کرتا ہے تو اسے اپنے فیصلے کے انفسی، آفاقی اور تقدیری نتائج سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ نہانا اور بھیگ جانا تجربے کی بات ہے۔ یہ انسانی عمل کا ایسا نتیجہ ہے جو مذہبی اور غیر مذہبی آدمی میں متفق علیہ ہے۔ عقلی طور پر انسانی عمل کا یہ پورا بیان ہے، لیکن مذہبی طور پر ادھورا ہے۔ انسانی عمل کا پورا مذہبی بیان یہ ہے کہ آدمی کا نہانا اور بھیگ جانا اِس عالم سے خاص ہے لیکن مکتفی نہیں ہے، کیونکہ اس کا ایک اور نتیجہ بھیگنا بھی ہو سکتا ہے اور

جلنا بھی ہو سکتا ہے، جو کسی اور عالم میں ہے۔ یہ بات قطعی مذہبی اور قطعی غیر عقلی ہے۔ زیر نظر مضمون میں صاحبِ سوال ہوا بھی تو نہ جانے کیسا عقلی ہوا کہ ایسی غیر عقلی باتوں سے ڈرتا ہے!

ہمارا مشورہ ہے کہ اس مفروضہ جرح کو قیامت تک مؤخر کرنے کے بجائے اگر خالص عقلی بنیادوں پر ادھر ہی کر لیا جائے تو پریکٹس کا فائدہ وہاں اٹھایا جا سکتا ہے۔ انکارِ خدا عقلی بنیادوں پر تو اِدھر کھڑا نہیں ہو پایا، اُدھر کیا توقع ہو سکتی ہے؟ ہمیں تو یہی معلوم ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کافروں سے نہ کلام کرے گا، نہ انہیں جرح جھگڑے کی اجازت ہو گی، اور نہ ان کے لیے میزان قائم کی جائے گی۔ کافر تو وہ ہے جو انکارِ رسالت کرے، اور ملحد تو بدترین قسم کا کافر ہے جو اپنے انفس میں گونجنے والی صدائے فطرت کو بھی نہیں سنتا، اور آفاق میں خدائے وحدہ لاشریک کی ساری نشانیوں کو بھی ٹھکرا دیتا ہے، لیکن صاحب مضمون کے بقول روز قیامت اسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے کانفرنس کی سہولت حاصل ہو گی! ہمیں تو ایسے مسلمان کے بارے میں بھی اطمینان قلب نہیں ہے جس کے محضر نامے پر جرح ہو گی۔ اس دنیا میں ایمان کا معاملہ قابل التوا نہیں، اور اسے قابل التوا قرار دینا غیر عقلی بھی ہے اور غیر مذہبی بھی۔

جدید انسان پر رومانوی اثرات کی وجہ سے الحاد میں ایک حیرت انگیز امر شامل ہوا جو بطالت (herosim) ہے۔ جدید انسان کی وجودی پوزیشن اس کائنات میں کسی مفروضہ خدا کے ولن کی ہے۔ وہ دراصل خدا اور اس کے کاموں پر نہایت جرأت مندانہ اعتراض اور ان کی کاٹ دار تحقیر کرتا ہے۔ ہمارے خانہ زاد ملحد بچارے شکایتی مزاج رکھتے ہیں اور ہر وقت منہ بسورے ریں ریں کرتے رہتے ہیں۔ جدید آدمی اسی بطالت کی وجہ سے اپنے آغاز و انجام کو تقدیری سمجھتا ہے جو مٹی ہے، اور اسے خاطر میں بھی نہیں لاتا۔ اس کے نزدیک حیات اور کار حیات سب کچھ ہے۔ لیکن ہمارے خانہ زاد ملحدین کا انکار کے بعد

مذہب میں بیان کیے گئے تکوینی انجام کو درخور اعتنا سمجھنا حد درجے کی پستی اور بزدلی ہے۔ مذہب کو شرمندگی کی وجہ سے چھوڑ دیا اور ملحد ہونا بھی نصیب نہ ہوا۔ افسوس کہ نہ ہیوں میں رہے، نہ شیوں سے ہوئے۔

زیر نظر مضمون دراصل نہ کسی ملحد کا سوال ہے، اور نہ کسی یقین والے یا عقل والے کا جواب۔ یہ دو بے یقین لوگوں کا باہمی مکالمہ ہے جن کے ذہنی اور نفسی احوال جاننے کے لیے ن م راشد کی نظم ''تعارف'' پڑھنا ضروری ہے۔ یہ کوئی بات نہیں، یہ بپتا ہے۔ جیسا کہ صاحبِ مضمون فرماتے ہیں کہ ''آپ کو اپنے الحاد پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں''۔ واقعی! ہماری گزارش ہے کہ اس طرح کے ''الحاد'' پر پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ اس کے ''علاج'' پر پریشان ہونے کی ضرورت ہے، اس پر تو رونے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں جو منظر نامہ سامنے آتا ہے اسے سمجھنے کے لیے کسی فلسفی کی ضرورت نہیں، سیموئیل بیکٹ ضروری ہے۔ الحاد اور بے یقینی میں بہت بنیادی فرق ہے۔ الحاد ایک مؤقف اور پورا اور لڈ ویو ہے۔ بے یقینی ایک نفسی علالت ہے، ایک sickness of the soul ہے۔ یہ نہ الحاد ہے، نہ ایمان ہے۔ یہ علالت انسان کی ارضی اور تقدیری صورت حال کو کسی بھی تناظر میں قبول نہ کر سکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے ایمان کی عدم استعداد قرار دینا اور اس کا سبب مسلمانوں کو سمجھنا نہایت بے انصافی کی بات ہے۔ صاحبِ مضمون الحادی اور مذہبی لٹریچر کو یکساں ردی قرار دیتے ہوئے اسی علالت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ ایک صاحب علم ملحد اور ایک صاحب رسوخ مذہبی آدمی اس مضمون کو پڑھ کر یکساں شرمندگی محسوس کرتا ہے۔

مغربی دنیا نے یہ باور کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے کہ عالمگیر دہشت گردی کا سبب مسلمان ہیں۔ دوسری طرف یہ بات اب ہماری مذہبی دانش کا جزو بن گئی ہے کہ اسلام تو بہت اچھا ہے لیکن مسلمان بہت برے ہیں اور اسلام کے فروغ میں نہ صرف رکاوٹ ہیں بلکہ ان کو دیکھ کر ہی آدمی ملحد ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ہی مغربی سکے کے دو رخ ہیں، اور صاحبِ سکہ کی طاقت نے انہیں پوری دنیا میں جاری کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آفات کو درست تناظر میں دیکھنا اور ان سے بچنا نصیب فرمائے۔

محمد دین جوہر

41

کیا جنت میں جانے کیلئے محمد ﷺ پر ایمان ضروری نہیں؟(اشکال آیت سورۃ البقرہ)

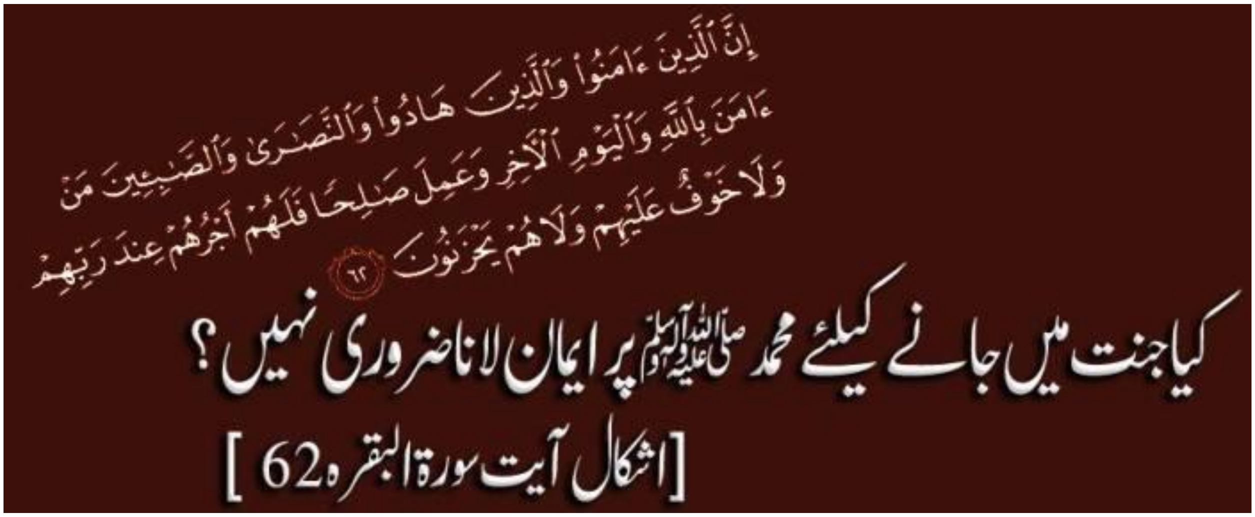

'گلوبلائزیشن' کے جلو میں ایک تحریک جو چپکے قدموں سے عالمی سرزمین پر پیش قدمی کرتی آرہی ہے، وہ ہے 'وحدتِ ادیان' جو اپنے یہاں باقاعدہ اب دستک دینے لگی ہے۔ اس نئے مہمان ___ وحدتِ اَدیان ___ کی سب سے پہلی فرمائش یہ ہے کہ مسلمانوں کی لغت سے 'کافر' ایسا خوفناک لفظ نکال دیا جائے۔ وہ سب اَفکار، وہ سب اَدیان اور وہ سب عقائد جو دینِ اسلام سے متصادم ہیں اب باقی زمانے کیلئے 'کفر' کہلانے سے مستثنیٰ کر دیے جائیں!

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو تصویر یہ 'عالمی ثقافتی مہم' اِس عالمِ نو کی بنانا چاہ رہی ہیے، ہمارے یہاں پایا جانے والا ارجائی فکر کمال انداز سے اس 'تصویر' کو مکمل کرتا ہے! اصولِ ارجاء اسی لئے تو ہیں کہ ایمان اور کفر کے مابین جو ایک حدِ فاصل ہے اُس کو زیادہ سے زیادہ غیر مرئی بنا دیا جائے! 'کافر' کا لفظ آج دنیا کی کسی بھی قوم اور کسی بھی گروہ کیلئے 'معیوب' ہے، خواہ وہ بت پرست کیوں نہ ہو، شیطان پرست (devil

(worshiper کیوں نہ ہو، آگ کا پجاری کیوں نہ ہو، حتیٰ کہ شرمگاہوں کے مجسمے بنا کر ان کو پوجنے کا مذہب کیوں نہ رکھتا ہو۔ کسی کو 'کافر' نہ کہا جائے، ہر ایک کا اپنا اپنا 'نکتہء نظر' ہے اور 'گلوبلائزیشن' کی نظر میں یکساں طور پر 'لائقِ احترام'! 'گلوبلائزیشن' کو ہمارے یہاں اِس کے سوا اور کیا چاہیے؟! یہ اُس کے لئے نعمت، وہ اِس کے لئے غنیمت! اِن دونوں میں کیا خوب نبھ رہی ہے!

ڈاکٹر رتھ فاو کی وفات کے بعد بھی جو بحث شروع ہوئی اس میں بھی بڑے زوردار انداز میں اس فکر کو پیش کیا گیا اور اس کے لیے قرآن کی ایک آیت کا بھی سہارا لیا گیا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿سورۃ البقرۃ: الآیۃ 62﴾

ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاری اور صابی (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے سو ان (سب) کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے اور نہ کوئی اندیشہ ان کے لیے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے. (سورۃ البقرہ، آیت 62)

سورہ البقرہ کی اس آیت سے جدت پسند اور انکی دیکھا دیکھی کچھ کم علم لوگ یہ استدلال کرتے نظر آرہے ہیں کہ یہود و نصاری بھی جنت میں جائیں گے۔ حالانکہ اسی سورت میں جابجا یہود و نصاری کو دعوت اسلام اور قرآن اور صاحب کے انکار پر انہیں وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس آیت سے یہی مراد تھی جو انہوں نے نکالی تو اس سے پہلے اور بعد میں یہود کو اسلام لانے کی دعوت دینی کی ضرورت کیا تھی؟ سورۃ البقرہ میں جو نصاری کے ساتھ حضور ﷺ کے مناظروں اور مباہلوں کے چیلنجز کا ذکر ہے انکا مقصد کیا

ہے ؟۔اسی طرح قرآن کی بیسوں آیات یہود و نصاری کی کفر اور اسلام میں ہی نجات بتارہی ہیں وہ کس لیے ہیں ؟ مثلا

☆وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۔۔(سورۃ آل عمران، آیت 85

ترجمہ :اور جو اختیار کرنا چاہے اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا یہ اس سے، اور وہ (ہو گا) آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے (

☆إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔(19) فَاِنْ حَاۗجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝20(سورۃ آل عمران آیت 19،20)

ترجمہ :دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے اور اہل کتاب نے جو (اس دین سے) اختلاف کیا تو علم ہونے کے بعد آپس کی ضد سے کیا اور جو شخص اللہ کی آیتوں کو نہ مانے تو اللہ جلد حساب لینے والا (اور سزا دینے والا) ہے۔ پھر بھی اگر یہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ : میں نے تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیا ہے اور جنہوں نے میری اتباع کی ہے انہوں نے بھی، اور اہل کتاب سے اور (عرب کے) ان پڑھ (مشرکین) سے کہہ دو کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو ؟ پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہدایت پا جائیں گے، اور اگر انہوں نے منہ موڑا تو تمہاری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانے کی حد تک ہے اور اللہ تمام بندوں کو خود دیکھ رہا ہے۔

یہود و نصاری اور باقی مشرکین کے متعلق ایک واضح اور فیصلہ کن قرآنی بیان پڑھیے :

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمۡ شَرُّ الۡبَرِيَّةِ ؕ

جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں سے کافر ہوئے وہ آتش دوزخ میں جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ بد ترین خلائق ہیں (سورۃ البینہ آیت 6)

سوال یہ ہے کہ جب آپ کے نزدیک محمد ﷺ کی بعثت ہو جانے اور آپ ﷺ کا سن لینے کے بعد بھی ایک یہودی اور عیسائی کو "خدا" اور کسی "اگلے جہان" کو مان رکھنا اور "بھلے کام" کر لینا نجات کے لیے بہت کافی ہے (از روئے آیت البقرۃ !!!) یعنی محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر بھی اُس کی جنت کھری ہے تو پھر محمد ﷺ کو نہ ماننے پر (سورۃ البینۃ وغیرہ ایسے قرآنی مقامات پر) قرآن انہیں جہنم کی وعیدیں کیوں سنا رہا ہے؟ اب یا تو آپ قرآن کی ان باقی آیات کی تکذیب یا تاویل کریں یا ان قرآنی محکمات کو مانتے ہوئے آیت البقرۃ سے نکالے جانے اس متشابہ کو انہی محکمات کی طرف لوٹائیں۔

سلامتی اسی میں ہے کہ دین کے بنیادی امور (عقیدہ وغیرہ ایسے امہات المسائل) کی بابت مدرسہ صحابہ سلف صالحین کے طریقے پر رہا جائے اور فہمِ نصوص میں ان کے راستے سے ہٹ کر کوئی نئی اپج اختیار کرنے سے بچیے اور متشابہات میں کی طرف رجوع کیجیے۔

جب ہم تفاسیر سلف کی طرف رجوع کرتے ہیں تو نظر آتا ہے اس آیت کا سیاق وسباق یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور ان کی نافرمانیوں کے تذکرے کے بیچ میں یہ آیت کریمہ بنی اسرائیل کے ایک باطل گھمنڈ کی تردید کے لئے آئی ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ صرف انہی کی نسل اللہ کے منتخب اور لاڈلے بندوں پر مشتمل ہے، ان کے خاندان سے باہر کا کوئی آدمی اللہ کے انعامات کا مستحق نہیں ہے، (آج بھی

یہودیوں کا یہی عقیدہ ہے)اس آیت نے واضح فرمایا کہ حق کسی نسل میں محدود نہیں ہے، اصل اہمیت ایمان اور نیک عمل کو حاصل ہے، جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور عمل صالح کی بنیادی شرطیں پوری کردے گا خواہ وہ پہلے کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو اللہ کے نزدیک اجر کا مستحق ہوگا، یہودیوں اور نصرانیوں کے علاوہ عرب میں کچھ ستارہ پرست لوگ رہتے تھے جنہیں صابی کہا جاتا تھا اس لئے ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح حضور ﷺ کی نبوت کے بعد ان پر ایمان لانے والے ہوں یا یہود عیسائی اور صابی جو محمد ﷺ کی نبوت سے پہلے موجود تھے 'جو بھی ایمان لایا اور اعمال صالحہ کیے' آنے والی زندگی میں اپنے اعمال اور ایمان کی جزا پائے گا۔ چنانچہ ابن کثیر، ابن ابی حاتم کے حوالے سے روایت کرتے ہیں: سلمان فارسیؓ نے فرمایا، یہ آیت تب نازل ہوئی جب میں نے ان لوگوں کی نماز اور روزے کا ذکر کیا جن سے میں محمدؐ سے ملاقات سے پہلے ملا تھا۔۔(تفسیر ابن کثیر سورۃ البقرہ آیت 62)

سلسلہء عبارت کو پیش نظر رکھنے سے بھی یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ اگر تفصیل میں بھی جائیں تو اسی آیت میں ایمان بااللہ کی شرط کسی شبے سے بچانے کے لیے کافی ہے کیونکہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو وحدہ لا شریک، یکتا اور بے مثل مانا جائے اور اس کے تمام احکام کی تعمیل کی جائے لہذا یہ جملہ ایمان بالرسل ایمان بالکتب، ایمان بالملئکہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ کوئی پیغمبروں، فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لائے بغیر اللہ اور آخرت کے دن پر کیسے ایمان لا سکتا ہے۔؟

☆داعیان وحدت ادیان سے چند موٹے موٹے سوالات:۔

سورہ بقرہ کی آیت 62 سے جو ماڈرنسٹ ''مفکر، سکالر اور دانشور'' لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جنت میں صرف مسلمان نہیں جائیں گے بلکہ یہود، نصاری، صابئین سب جنت میں جائیں گے، بشرطیکہ وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھیں اور نیک کام کریں۔ان لوگوں کے دعوے کا مقصد یہ ھوتا ھے کہ حصول جنت کیلئے رسالت محمدیؐ پر ایمان لانا ضروری بات نہیں اور کچھ یہ نتیجہ نکال لاتے ہیں کہ تمام مذاھب بس ایک ہی ہیں، صرف ناموں کا فرق ھے۔ اس آیت قرآنی سے یہ نتیجہ نکالنے میں یہ لوگ کس طرح تلبیس کے مرتکب ھوتے ہیں اسکا اوپر تذکرہ آیا۔ان لوگوں سے چند موٹے موٹے سوالات ہیں کہ:

1۔ یہ لوگ پھر عیسائی یا یہودی کیوں نہیں ھو جاتے؟ آخر جنت تو انہیں بھی ویسے ہی ملنے والی ھے جیسے مسلمان کو، تو پھر خود کو مسلمان کہلوانے کی کیا ضرورت پڑی ھے؟ اگر رسالت محمدی پر ایمان لانا اضافی شے ھے تو اس پر ایمان لاؤ نہ لاؤ، اقرار کرو نہ کرو اس سے کیا فرق پڑتا ھے؟ تو یہ لوگ اسکا انکار کر کے خود بھی اور اپنی آل اولاد کو بھی یہود و عیسائی کیوں نہیں بنا دیتے؟

2۔ دیگر اھل مذاھب کو اسلام کی دعوت دینے کا کیا مطلب؟ دیکھئے دعوت کی بنیاد یہی ھے نا کہ وہ غلط ھیں اور جنت کا حقدار بننے کیلئے ضروری ھے کہ درست بات پر ایمان لائیں، مگر جب وہ لوگ اپنے پہلے ایمان ہی کی بنیاد پر جنت کے حقدار قرار پا چکے تو انہیں ایمان کی دعوت و تبلیغ کا کیا مطلب؟ بس اچھی باتوں کی نصیحت وغیرہ ھونی چاھئے۔

3۔ پھر اگر یہ سب لوگ ایسے ہی جنت کے حقدار تھے اور رسالت محمدی پر ایمان بس ایک اضافی شے تھی، تو اللہ نے سورہ بقرہ اور آلعمران میں یہود و نصاری سے اتنی طویل گفتگو کس لئے کی؟ انہیں کس بات پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی تھی؟

محمد ﷺ پر ایمان کو نجات کا واحد آپشن نا ماننا

ایک آدمی پہلے کہتا ہے: قرآن میں آیا ہے (سورۃ البقرۃ 62 کی آیت کے حوالہ سے) کہ ایک بھلے کام کرنے والا آدمی خواہ مسلمان ہے، خواہ یہودی، خواہ عیسائی، خواہ صابئ، بس خدا اور اگلے کسی جہان کو مانتا ہو تو قیامت کے روز اس کی بخشش ہو جانے والی ہے۔ پھر جب اس سے پوچھا جاتا ہے: کیا نبی ﷺ کے مبعوث ہو جانے اور آپ ﷺ کا سن لینے کے بعد بھی جو شخص آپ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا اور یہودی یا عیسائی یا صابئ ہی رہتا ہے، قیامت کے روز اس کی بخشش ہو جانے والی ہے؟ اور اس پر اسے سورۃ البینۃ کی آیت سنائی جاتی ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ... تو وہ کہتا ہے: یہ تو تب ہے جب وہ دل سے تو جانتے ہوں محمد ﷺ سچے رسول ہیں مگر تکبر کی وجہ سے رسول کے ساتھ دشمنی کریں، یہ کفر ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کو آپ کیسے سلجھاتے ہیں؟

☆ہمارا جواب:

اس سوال کے دو حصے ہیں:

1. ایک: نبیِ خاتم المرسلین ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لانے والے کسی بھی یہودی یا عیسائی یا صابئ کا کافر اور مستوجبِ دوزخ ہونا۔

2. دوسرا: اس کفر کرنے کا معنیٰ و مراد۔

سوال کے اِن دونوں حصوں پر ہم الگ الگ گفتگو کریں گے:

☆ محمد ﷺ پر ایمان نہ لانا.. صاف موجبِ دوزخ

جدید فتنے اگر پوری طرح آپ کے سامنے ہیں تو اس آدمی کو سلیم الفطرت جانئے جو آپ کے اٹھائے ہوئے اِس سوال پر جھینپ ضرور جاتا ہے؛ اور یہ کہنے کا حوصلہ نہیں پاتا کہ خاتم الرسل محمد ﷺ کی بعثت ہو جانے کے بعد، اور آپ ﷺ کا سن کر، کرۂ ارض کا جو شخص یہودی اور عیسائی ہی رہتا ہے اسے قرآن کی جانب سے نجات کی باقاعدہ ضمانت حاصل ہے اور سورۃ البقرۃ (آیت 62) میں وارد وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ کی بشارتِ اخروی کے اندر اس کا پورا حصہ ہے!

ورنہ اس فکرِ جدید کو پھیلانے والے تو دیدہ دلیری سے یہ کہتے ملیں گے کہ: جی ہاں نبی ﷺ کا سن کر بھی جو یہودی یا عیسائی آپ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا، اُس کو نجات کی ضمانت خود قرآن مجید دیتا ہے لہٰذا آپ کون ہوتے ہیں اسے جہنم کی وعید سنانے والے؟! اور اس پر حوالہ اسی سورۃ البقرۃ کی آیت سے دیں گے! یہ تو رہے تقاربِ ادیان کے داعی اور دجالی گلوبلزم کے خدمتگار، جس سے بڑی گمراہی اِس دور میں شاید ہی کوئی ہو۔

البتہ جہاں تک 'تکبر' وغیرہ کی شرط لگانے والے ہمارے اِن حضرات کا تعلق ہے... تو یہ محض ایک سنگین تناقض self-contradiction کا شکار ہیں۔ یعنی ایک طرف مانتے ہیں کہ نبی ﷺ کی بعثت ہو جانے اور آپ ﷺ کا سن لینے کے بعد بھی جو یہودی یا عیسائی آپ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا وہ ہے تو صاف جہنم کی وعید ہی کا مخاطب۔ جبھی تو آپ کے سورۃ البینۃ کی آیت سنانے پر ان صاحب نے اس بات کا

اصولی اقرار کیا کہ نبی ﷺ پر ایک یہودی یا عیسائی کا جانتے بوجھتے ہوئے ایمان نہ لانا ہے تو واقعتاً ابدی جہنم ہی کا موجب (بس شرط یہ ہے کہ وہ ایسا ازراہِ تکبر کرتا ہو!)۔ دوسری طرف یہ حضرات سورۃ البقرۃ والی آیت کی رُو سے ایک یہودی یا عیسائی کے حق میں خدا اور آخرت کو مان رکھنے اور اچھے اعمال کر لینے کو ''کافی'' بھی قرار دے رہے ہیں، بلکہ اس نظریہ کی پُرزور تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں، کیونکہ یہ شرط پوری کر لینے والے کو اِن کے خیال میں آیت کے اندر (محمد ﷺ پر ایمان نہ لانے کے باوجود!!!) لَاخَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَاھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ کی بشارت سنا رکھی گئی ہے۔

بھئی اگر 'خدا' اور 'اگلے کسی جہان' کو مان رکھنے اور 'بھلے اعمال' کر لینے والے ایک یہودی یا عیسائی کو کچھ مزید (محمد ﷺ کی رسالت) مانے بغیر ہی نجات کی ضمانت ہے (یعنی اگر آیت البقرۃ سے فی الواقع یہ مقصود ہے)... تو اُس 'مزید' کا کفر کر بیٹھنے والے کو (سورۃ البینۃ وغیرہ میں) جہنم کی وعید ہی سرے سے کیوں؟ اور اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ اُس 'اضافی چیز' (محمد ﷺ کی رسالت) کا کفر کرنے والے کو ابدی جہنم کی وعید قرآن میں باقاعدہ سنا رکھی گئی ہے (جیسا کہ سورۃ البینۃ میں مذکور ہوا)... تو وہ سرے سے 'اضافی' کیسے؟ وہ نجات کے لیے ''باقاعدہ مطلوب'' کیسے نہیں؟

یہ ہے ان حضرات کا تناقض۔

یعنی تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ ''کفر'' وہ ہوتا ہے جو ازراہِ تکبر کیا جائے۔ مگر یہ بحث تو ''کفر'' کا معنٰی متعین کرنے میں ہوئی نا۔ محمد ﷺ کے ساتھ کفر کرنے کو موجبِ جہنم تو آپ نے تسلیم کر لیا! اور ایک اصولی مسئلہ تو ہمارے آپ کے مابین طے ہوا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد ﷺ پر ایمان لانا یعنی مسلمان ہونا کرۂ ارض پر بسنے والے ہر اُس یہودی اور عیسائی پر جس نے محمد ﷺ کا سن رکھا ہو (خود آپ کے نزدیک) فرض ہے۔ اور محمد ﷺ پر ایمان نہ لانے والا ایسا ہر یہودی اور عیسائی (خود آپ کے نزدیک) دائمی جہنم کا مستوجب۔

پس ہمارے اور اہل کتاب کے مابین پائی جانے والی مشترکات commonalities تو خود آپ کے نزدیک کافی نہ ہوئیں جب تک کہ وہ وقت کے نبی — محمد ﷺ — پر اترنے والی ایک ایک بات پر ایمان نہ لے آئیں؛ ورنہ صاف جہنم۔

البتہ اگر آپ کے نزدیک محمد ﷺ کی بعثت ہو جانے اور آپ ﷺ کا سن لینے کے بعد بھی ایک یہودی اور عیسائی کو ''خدا'' اور کسی ''اگلے جہان'' کو مان رکھنا اور ''بھلے کام'' کر لینا نجات کے لیے بہت کافی ہے (از روئے آیت البقرۃ!!!) یعنی محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر بھی اُس کی جنت کھری ہے... تو پھر محمد ﷺ کو نہ ماننے پر (سورۃ البینۃ وغیرہ ایسے قرآنی مقامات کی بنا پر) آپ اُس کے لیے سرے سے پریشان ہی کیوں ہوتے ہیں؟؟؟ جب محمد ﷺ کو نہ مانے بغیر (معاذ اللہ) اُس کا گزارہ ہوتا ہے اور جنت اُس کی کھری ہے (آپ کے بقول آیت البقرۃ کی رُو سے!!!) تو اب اُس کے حق میں محمد ﷺ کو نہ ماننے کی صورت میں ''کفر'' کا سوال ہی کیوں باقی رہ گیا ہے؟

غرض ''کفر'' کی تعریف آپ کے نزدیک کیا ہے اور ہمارے نزدیک کیا، یہ تو ہم بعد میں دیکھیں گے، ہم پوچھتے ہیں محمد ﷺ کو رد کرنا سرے سے ''کفر'' اور ''مستوجبِ جہنم'' ہے ہی کیوں، جبکہ جنت اس کی

محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر ہی کھری ہے (اس منحرف فہم کی رُو سے جو آپ آیت البقرۃ سے لیتے ہیں)؟!!

چنانچہ سب سے پہلے میں چاہوں گا کہ آپ ان حضرات کے تناقض ہی کی نشاندہی کریں اور پھر انہیں اس سے نکل آنے کی دعوت دیں۔ اس تناقض سے نکل کر:

1. یا تو یہ اُس دجالی عقیدہ پر چلے جائیں جو محمد ﷺ پر ایمان کو ناگزیر قرار نہیں دیتا اور سورۃ البینہ وغیرہ ایسے ان مقامات کو سرے سے خاطر میں نہیں لاتا۔ اُس کے قول کی رُو سے محمد ﷺ کا پیروکار ہونا ہے ہی دنیا میں محض ایک آپشنل optional چیز (اس کے خیال میں، آیت البقرۃ کی رُو سے آدمی کو پورا آپشن ہے کہ یہودی رہے، یا عیسائی، یا صابیٔ)! اس دجالی عقیدہ پر چلے جانے کی صورت میں یہ حضرات قرآن کے ان سب محکم مقامات کا کوئی جواب نہ دے پائیں گے جن میں محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت پر ایمان لانے کو کرۂ ارض کے ایک ایک یہودی اور عیسائی اور یہاں کے ہر ہر شخص کے حق میں ناگزیر ٹھہرایا گیا ہے۔ مانند:. قرآن کا یہ صریح اعلان: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ''اے محمدؐ، کہو کہ ''اے انسانو، میں تم سب کی طرف پیغمبر ہوں اس خدا کا جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اِس کی، امید ہے کہ تم راہ راست پا لوگے''۔ (الاعراف: ۱۵۸) یا جیسے خود سورۃ البقرۃ کا ہی بنی اسرائیل کو باقاعدہ مخاطب کر کے صاف صاف یہ فرمانا: وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا

تکُونُوا اَوَّلَ کَافِرٍبِہٖ ۠ ''اور ایمان لاؤ میری اس تنزیل پر جو تمہارے پاس پہلے سے موجود (صحیفوں) کی تصدیق میں ہے۔اور سب سے پہلے تم ہی اس کے کافر نہ بن جاؤ''۔﴿البقرۃ: ۴۱﴾مزید آیات کیلئے لنک دیکھیے:

2 اور یا پھر اس تناقض سے نکل کر یہ امت کے اس معروف عقیدے پر لوٹ آئیں جو کرۂ ارض کے ہر اس یہودی اور عیسائی کو جس نے محمد ﷺ کا سن رکھا ہے مگر وہ آپ ﷺ پہ ایمان لانے پر آمادہ نہیں دوزخ کی ان وعیدوں کا مستوجب ٹھہراتا ہے جو ابھی اوپر ذکر ہوئیں... یہاں؛ اِنہیں قرآن سے نکالے جانے والے اِس متشابہ کو کہ (البقرۃ 62 میں) بظاہر محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان کے بغیر بھی نجات کا عندیہ نظر آتا ہے، قرآن کے ان محکم مقامات کی طرف لوٹانا ہو گا جن میں محمد ﷺ پر ایمان نہ لانے والے کو دوزخ کی واضح دوٹوک وعید سنا دی گئی ہے، اور جن میں سے چند (آیات) ابھی اوپر ہم ذکر کر چکے۔

پس اِس تناقض کو اِنہیں کسی ایک کروٹ بٹھانا ہو گا:

یا یہ میدان کے اُس پار چلے جائیں؛ اور محمد ﷺ کی بعثت ہو جانے کے بعد آپ ﷺ پر ایمان کو آپشنل optional ٹھہرا دیں (اور اس صورت میں محمد ﷺ پر ایمان کو ناگزیر ٹھہرانے اور محمد ﷺ پر ایمان نہ لانے والے کو ابدی جہنم کی وعید سنانے والی نصوص کی تکذیب یا تاویل کریں)۔

یا یہ اِدھر ہماری طرف آ جائیں؛ اور محمد ﷺ کی بعثت ہو جانے کے بعد آپ ﷺ کا سن رکھنے والے ہر یہودی و عیسائی و دیگر پر محمد ﷺ کا پیروکار ہونے کو ناگزیر ٹھہرائیں؛ اور اس کو محکم مانتے ہوئے آیت البقرۃ سے نکالے جانے اس متشابہ کو اسی محکم ہی کی طرف لوٹائیں۔

متشابہ کو محکم کی طرف لوٹانا یہ ہوتا ہے کہ: ایک محکم مدلول تو بہر حال اور کسی قیمت پر ساقط نہ ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ متشابہ کے صرف وہ احتمالات مانے جائیں جو محکم سے متعارض نہ ہوں۔ البتہ اس کے وہ احتمالات جو محکم سے متعارض ہوں خود بخود ساقط ہو جائیں (ورنہ محکم کو ساقط ماننا پڑے گا)۔

اس تعارض سے ان کے نکل آنے کی:

öاگر تو پہلی صورت ہے... یعنی یہ محمد ﷺ پر ایمان کو کرۂ ارض کے کسی بھی باشندے کے حق میں ناگزیر نہیں بلکہ 'آپشنل optional ' ٹھہرا دیتے ہیں... تو یہ قرآنی محکمات کا صاف کفر کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن نے اپنے آپ کو اور اپنے لے کر آنے والی ہستی (محمد ﷺ) کو جس حیثیت میں پیش کیا ہے وہ یہ کہ اس پر ایمان نہ لانا صاف دوزخ کا موجب ہے۔ قرآن کے اِس محکم کو کسی متشابہ کی بنا پر متنازعہ ٹھہرانا قرآن کے ساتھ صریح تصادم ہے۔

öاور اگر دوسری صورت ہے... یعنی یہ محمد ﷺ پر ایمان کو کرۂ ارض کے ہر یہودی، عیسائی اور صابئ کے حق میں ناگزیر ہی ٹھہراتے ہیں... تو پھر یہ اصولاً درست پٹڑی پر چڑھ آتے ہیں۔ تب ہمارے اور ان کے مابین مسئلہ صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ محمد ﷺ پر "ایمان" لانے کا کیا مطلب ہے اور محمد ﷺ کے ساتھ "کفر" ہو جانے کا کیا معنیٰ؟

پس اگر یہ اصولی بات ہمارے اور ان کے مابین سرے لگ چکی؛ اور انہوں نے تسلیم کر لیا کہ کرۂ ارض پر بسنے والا کوئی یہودی، عیسائی اور صابئ جب تک محمد ﷺ پر ایمان نہیں لاتا اس وقت تک وہ دائمی دوزخ کی قرآنی وعید سے باہر نہیں... تو پھر ہم آگے چلتے ہیں۔

ایمان اور کفر کو 'دل کے فعل' میں محصور کرنا:

قرآنی استعمال میں یہ دو لفظ ''ایمان'' اور ''کفر'' ایک دوسرے کے مقابلے پر استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی ایمان نہ لانے کی حالت کو ہی ''کفر'' کہا جاتا ہے؛ اور کفر سے نکل آنے کی حالت کو ہی ''ایمان''۔ چونکہ ''ایمان نہ لانے'' کو ہی قرآنِ مجید میں ''کفر'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے لہٰذا علمائے عقیدہ نے کفر کو اس کی کسی ایک صورت میں محصور نہیں ٹھہرایا بلکہ دلائل کی بنیاد پر کفر کی چار صورتیں بیان کی ہیں:

1 . کفرِ استکبار۔ یعنی حق (نبی یا اس کی لائی ہوئی کسی بات) کے آگے تکبر کرنا۔

2 . کفرِ جحود۔ یعنی (نبی یا اس کی لائی ہوئی کسی بات کو) سادہ رد کر دینا۔

3 . کفرِ شک۔ یعنی (نبی یا اس کی لائی ہوئی کسی بات میں) شک کرنا۔ (جی ہاں یہ بھی کفر ہی کی ایک صورت ہے)۔

4 . کفرِ اعراض۔ (رُو گردانی)۔ یعنی (نبی یا اس کی لائی ہوئی کسی بات کو) توجہ دینے کا ہی سرے سے روادار نہ ہونا۔

اب ہم معزز معترض سے پوچھتے ہیں: ''کفر'' کا یہ جو معنیٰ آپ نے بیان فرمایا ہے: یعنی دل میں تو وہ اس کو سچ مان گیا ہو (جسے جاننے کا ہمارے پاس ظاہر ہے کوئی ذریعہ نہیں ہے) لیکن از راہِ تکبر وہ اس سے تصادم ہی پر آمادہ ہو... اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مان لیں کہ ''کفر'' کا صرف یہی ایک مطلب ہے... تو کیا آپ اسے

صرف رسالتِ محمدی کے معاملہ میں ہی لاگو کریں گے یا دیگر ارکانِ ایمان کی بابت بھی "کفر" کا یہی معنیٰ لاگو فرمائیں گے؟

صرف ایک رسالتِ محمدی کی ہی قربانی کیوں؟

اگر تمام ارکانِ ایمان کے معاملہ میں ہی آپ "کفر" کا یہ معنیٰ لاگو کریں گے جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ "یہ تو تب ہے جب وہ دل سے تو جانتے ہوں محمد ﷺ سچے رسول ہیں بس از راہِ تکبر آپ ﷺ سے دشمنی کریں"... کیونکہ لفظِ کفر کا آپ بس یہی ایک معنیٰ جانتے ہیں... تو اللہ کے ساتھ "کفر" بھی تو پھر اسی وقت معتبر ہونا چاہیئے جب "وہ دل سے جانتا ہو کہ اللہ ہے"، لیکن محض تکبر سے اللہ کے ساتھ دشمنی کرے!!!

لہٰذا ایک ملحد کو بھی جو (بیچارہ!!!) کسی وجہ سے "دل سے یقین نہیں کر پایا کہ اللہ ہے" جنت کی خوشخبری دے دیجئے! (براہِ کرم یہاں کوئی اور بحث مت چھیڑیے؛ یہاں صرف "کفر" کا معنیٰ ہمارے زیرِ بحث ہے)۔ دوسرا ایک ملحد جو "دل سے نہیں جانتا کہ قیامت ہے" اس کو بھی بخشش کی نوید سنا دیجئے۔ کیونکہ "کفر" کی تعریف آپ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ "دل سے ایک بات جان گیا ہو اور بس از راہِ تکبر ہی وہ اس سے تصادم کرے"۔

تب اکیلا "رسالتِ محمدی پر ایمان" ہی کیوں آپ کے اس اصول کی بھینٹ چڑھے، جبکہ رسالتِ محمدی کے دلائل اور شواہد اللہ کے فضل سے روئے زمین پر کسی بھی نبی کی رسالت کے دلائل و شواہد سے بڑھ کر ہیں۔ ایسے آدمی کو تو پھر اس سے کہیں بڑھ کر چھوٹ ملنی چاہیئے جو مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر مطمئن نہیں یا جو مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر مطمئن نہیں۔ یا جو مثلاً نوح علیہ السلام کی رسالت پر مطمئن نہیں۔ یا

جو شخص یومِ آخرت پر مطمئن نہیں۔ اصول تو پھر یہ ہونا چاہئے کہ آدمی ایمانیات کی جس بھی چیز پر 'غیر مطمئن' ہو جائے وہ اس کے حق میں موجبِ کفر نہ ہو۔ مثلاً ایک آدمی کہے کہ بھئی میں تو ملائکہ کے وجود پر مطمئن نہیں، یا دوسرا کہے کہ میں تو کسی بھی رسالت پر مطمئن نہیں، اور تیسرا کہے کہ میں تو اس کائنات کو پیدا کرنے والی کسی ہستی پر ہی سرے سے مطمئن نہیں... تو یہ تینوں آدمی آپ کے بیان کردہ اس اصول کی رُو سے ''کفر'' کے مرتکب نہیں ہیں! ان سبھی کو نجات اور بخشش کی خوش خبری دیجئے!

حق یہ ہے اسلامی تاریخ میں ایک گمراہ فرقہ گزرا ہے، جہمیہ۔ یہ اس کا فلسفہ ہے کہ ''کفر'' اور ''ایمان'' کے مباحث کو 'دل سے جاننے' کے مسئلہ میں محصور کیا جائے۔ (جہمیہ کو بھی 'قرآن و حدیث' سے شاید وہی دلیلیں بھائی ہوں جو آپ کو بھا سکی ہیں!)۔ لہٰذا آپ کے معترض کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ سب گھوڑے جو یہ حضرات 'تحقیق' کے نام پر آج دوڑا رہے ہیں امت کی تاریخ میں بہت پہلے اور بڑی 'کامیابی' کے ساتھ دوڑائے جا چکے ہیں اور ان پر سواری کر کے امت کے کچھ ٹولے گمراہی کے کچھ بڑے بڑے گڑھوں میں گر بھی چکے ہیں۔ (تشابھت قلوبھم!!!)۔ سلامتی مطلوب ہے تو دین کے بنیادی امور (عقیدہ وغیرہ ایسے امہات المسائل) کی بابت سلف صالحین کے طریقے پر رہئے اور فہمِ نصوص میں ان کے راستے سے ہٹ کر کوئی نئی اپج اختیار کرنے سے بچئے۔ تسلی رکھئے، خوارج، جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ وغیرہ بھی کچھ چھوٹے دماغ نہ تھے۔ وہ بہت بہت مخلص بھی تھے، بڑے بڑے محنتی اور نکتہ رس بھی، اور 'دلائل' کی بحث میں بہت بہت سنجیدہ بھی۔ بس صرف ایک چیز مفقود تھی اور وہ ہے مدرسۂ صحابہ کی پابندی، باقی ان کے پاس سب کچھ تھا، بلکہ آپ سے کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ مگر مدرسۂ صحابہ سے آزاد، 'دلیل' کے تعاقب میں وہ بڑی بڑی سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ کیسے کیسے گڑھوں میں جا گرتے رہے، افکار کی تاریخ پڑھنے والے پر

یہ بات او جھل نہیں۔ ان میں سے جس جس نے اپنی بربادی کے لیے کسی گڑھے کا چناؤ کیا، اغلب یہ ہے وہ اسے 'بربادی کا گڑھا' جان کر اس میں نہیں کودا ہو گا! آگے آپ کی مرضی۔

یہ وجہ ہے کہ ہم اس پر زور دیتے ہیں فہمِ نصوص کے معاملہ میں امت کے معروف عقائد اور مسلمات کی تعلیم سب سے پہلے لیں اور اپنا تصورِ دین پیچھے سے چلے آتے دستور پر ہی استوار کریں۔ 'پہیے کی ایجادِ نو' کی کوشش ویسے تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی ایک فضول بات جانی جاتی ہے، البتہ دین میں تو اس کی گنجائش ہی نہیں۔ عبداللہ بن مسعود کی مشہور نصیحت: علیکم بالأمر العتیق "قدیمی ٹکسالی طریق پر رہو"۔

ہمارے جواب کے اِس دوسرے حصے کا خلاصہ یہ کہ:

'دل سے جاننے' کی یہ جہمیہ والی شرط عائد کرنے لگے تو اس کی زد میں پھر تمام رسالتیں اور سب ارکانِ ایمان ہی آجائیں گے؟ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر تو یہ معاملہ پھر نہیں رکے گا۔ لہٰذا "کفر" کا مطلب اگر وہی جہمیہ والا ہے تو پھر اللہ کا نام لے کر اس کا اطلاق سب غیبیات پر ہی کر دیجئے۔ معاملہ از حد آسان ہو جائے گا!

البتہ علمائے کتاب و سنت نے قرآنِ مجید ہی سے کفر کی چار اقسام بیان کر کے دی ہیں (آپ کی بیان کردہ "کفرِ استکبار" ان چار میں سے صرف ایک قسم ہے)۔ جبکہ ان میں سے ایک قسم کفرِ شک ہے اور ایک قسم کفرِ اعراض۔ یعنی کسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں شک بھی ہو تو وہ کافر ہے۔ "شک" ظاہر ہے تبھی ہو گا جب وہ دل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نہ مانتا ہو! اور اگر شک کرنا آپ کے نزدیک کفر نہیں ہے (بلکہ کفر آپ کے نزدیک صرف یہ ہے کہ آدمی کو یقین ہو اور پھر وہ دشمنی پر اتر آئے) تو اس قاعدہ کا

اطلاق پھر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیوں؟ ایسے کتنے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان کو اللہ پر ہی شک ہے (نعوذ باللہ)۔ اب ان لوگوں کے دل میں جا کر تو ہم نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ کے وجود پر دل سے یقین رکھتے ہیں مگر تکبر کی وجہ سے اسے ماننے اور اس کے آگے جھکنے پر آمادہ نہیں۔ ایک بڑی تعداد تو ضرور ہی ایسی ہو گی جو اپنے اِس ''شک'' کے دعویٰ میں سچے ہوں۔ لہٰذا اس اصول کی سان پر سارے ارکانِ ایمان کو کیوں نہ رکھ دیں۔ نتیجتاً؛ خدا کو نہ ماننے والے ان سب ملحدوں اور ماں اور بیوی کی تمیز ختم کر رکھنے کے داعی ان تمام زنادقہ کی بھی بخشش کی امید رکھیں جو انبیاء کی بتائی ہوئی غیبیات پر کسی وجہ سے 'دل سے' مطمئن نہیں ہو پائے!

تحریر حامد کمال الدین، سہ ماہی ایقاظ

43

ڈاکٹر روتھ فاو، جنت جہنم کی بحث اور مسلک اعتدال

ڈاکٹر روتھ صاحبہ کی وفات کے بعد ہمارے یہاں عجیب وغریب بحث چل نکلی ہے۔ ایک گروہ انہیں لازما جنت میں پہنچانے پر مصر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ملحد ہونے کے سبب جنت کو مانتے ہی نہیں مگر پھر بھی وہ انہیں خدا کی جنت میں ضرور دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو کسی بڑے سے بڑے نیک مسلمان کے لئے بھی جنت کی امید رکھے جانے پر ٹھہر جانے کا سبق دینے والے ہوتے ہیں کہ ''تم کون ہوتے ہو کسی کو جنتی کہنے والے''۔ دوسرے گروہ کا حال یہ ہے گویا وہ انہیں لازما جہنم میں دھکا دے کر ہی دم لے گا۔

ہندوستان میں جب گاندھی کا ایک ہندو کے ہاتھوں قتل ہوا تو کچھ مسلمانوں نے انہیں شہید لکھنا شروع کر دیا. دارالعلوم دیوبند کے فاضل مفتی ظفیر احمد مفتاحی رح کے نام مولانا عبد الماجد دریابادی رح نے خط میں لکھا: گاندھی جی سے متعلق پہلے سوء ظن میں افراط تھی. اب حسن ظن میں ہو گئی ہے. بے اعتدالی اور عدم توازن سے تو ہماری قوم کو گویا عشق ہے. (علمی مراسلے: ص 308) اسی طرح کا معاملہ ہمارے یہاں اس طرح کے مواقع پر پیدا ہوتا ہے. مذکورہ بالا خاتون کی وفات پر بھی اس طرح کے دو طرز سامنے آئے. بعض نے اگربتیاں جلا کر خوشبو کا ماحول پیدا کیا، پلاؤ تقسیم ہوا، فاتحہ ہوئی اور 'ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ' کی نوید جانفزا سنائی جب کہ بعض نے مرگھٹ میں چتا روشن کی اور میت سوختہ ہونے کے بعد ڈاکٹر پفاؤ کی ارتھی کی خاک کو دریاے چندرابھاگا کی شوریدہ سر موجوں کی نذر کرتے ہوئے 'وامتازوا الیوم ایھا المجرمون' کی وعید سنائی. معدودے چند اہل علم نے متوازن اپروچ اپنائی۔

یہ دونوں انتہائیں ہیں، مرحومہ کا فیصلہ خدا کے یہاں ہونا ہے وہ خود کرلے گا۔ ہمیں البتہ "میرٹ" اور "اپنے انجام" کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔

جنت میں جانے کا ایک ہے "میرٹ کا معیار" اور ایک ہے "رعایتی معیار"۔

☆ میرٹ کا معیار یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد اب سب کے لئے انہیں ماننا لازم ہے (اس کے بغیر آخرت میں نجات نہیں)۔ دنیا کے سب انسانوں کو اسی میرٹ کو حاصل کرنے کی طرف دعوت دی جائے گی، اسی کو پھیلانا امت محمدیہ کا منصب ہے۔

☆"رعایتی معیار" یہ ہے کہ جس شخص تک اسلام کی دعوت نہ پہنچی یا اسے کسی وجہ سے اس پر غور و فکر کا موقع نہ مل سکا یا وہ اسے کسی سبب سمجھ ہی نہ آئی، ذھنی صلاحیت کے اعتبار سے کند ذھن ہو،-ایسے حالات میں پیدا ہو جانا کہ مخصوص فرد کو اسلام کی درست تصویر سمجھانے والا میسر نہ ہو وغیرہ تو ایسے شخص کو اللہ تعالی اپنے لامحدود علم کی بنیاد پر خود جانچ کر اس کا فیصلہ کردے گا کہ آیا اس کے پاس اسے نہ ماننے کا کوئی قابل قبول عذر موجود تھا یا نہیں۔ پس جس کے پاس کوئی ویلڈ عذر ہو گا خدا اسی حساب سے اس کا فیصلہ کردے گا۔ مگر دنیا میں کبھی بھی رعایتی معیار کو پروموٹ نہیں کیا جاتا، پروموٹ میرٹ ہی کو کیا جاتا ہے۔ کسے رعایت ملنے والی ہے یہ کوئی نہیں جانتا لہذا اس پر تکیہ خلاف عقل ہے۔!

اجمالی عقیدہ یہ رکھنا چاہیے کہ ہر شخص کا مواخذہ اس کی تبلیغ کی نوعیت کے ساتھ وابستہ ہے. جسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہے اسی حد تک اس سے مواخذہ بھی ہو گا. یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص ہندوستان یا عرب ہی میں رہتا ہو لیکن اپنے خاص حالات کی وجہ سے دین حق کا پیغام اس شخص تک نہ پہنچے جس رنگ میں یورپ یا امریکا کے کسی ایسے شخص تک پہنچا ہو جس نے باضابطہ اسلام اور اسلامی تعلیمات اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو.

غرض انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کسے کس درجے کی ہوئی ہے؟ حق سبحانہ و تعالی ہی اسے جانتے ہیں اور مواخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے. تفصیلی علم تو اس خدا ہی کو ہے. ہمارے لیے اتنی اجمالی بات کافی ہے کہ جسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہے اسی حد تک اس سے مواخذہ ہو گا. اشخاص متعین کر کے یہ بتانا آدمی کے لیے ناممکن ہے کہ کسے درجے کی تبلیغ ہوئی ہے؟ اور جب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہو سکتا تو مواخذے کی تفصیل بھی ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ (ص230-232 نسخہ مرتبہ حافظ تنویر احمد شریفی)

باقی کفر کی مختلف صورتیں ہیں۔ کفر (حق نہ ماننے) کی صورت صرف یہ نہیں کہ انسان جانتے بوجھتے ضد و عناد کی وجہ سے حق کا انکار کرے، یہ اس کی صرف انتہائی صورت ہے جسے علمائے کلام کی اصطلاح میں ''کفر جحود'' کہا جاتا ہے۔ کفر کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان رسول کی بات کی طرف کان دھرنے کے لئے بھی تیار نہ ہو، یعنی اسکے گرد و پیش میں حق کا وجود تو ہو مگر غفلت کا عالم یہ ہو کہ بات سمجھنا تو در کنار انسان اس کی طرف اپنے قلب کو متوجہ ہی نہ کرے۔ اسے ''کفر اعراض'' کہتے ہیں اور کفر کی یہ سب سے عام صورت ہے۔ حق جب ارد گرد موجود ہو مگر پھر بھی اس کی طرف توجہ نہ کی جائے تو یہ بذات خود حق کی توہین کرنا ہے جو ایک ایسا جرم ہے جس پر گرفت ہو سکتی ہے۔

☆خلاصہ:

یہ کہ تمام غیر مسلموں یا کافروں کے متعلق یہ کہنا قرین صواب نہیں ہے کہ وہ کسی طور جنت میں نہیں جا سکتے—دنیوی حکم کے اعتبار سے اگرچہ وہ تمام لوگ غیر مسلم اور کافر ہی ہیں جنھوں نے رسالت محمد ﷺ کا اقرار نہیں کیا اور اصولی طور پر یہ بات بھی درست ہے کہ جنت میں داخلے کے لیے رسات محمد یہ پر ایمان لازم ہے تاہم اخروی معاملات میں ہر شخص سے اس کی حقیقی نوعیت کے مطابق برتاؤ کیا جائے گا کہ اللہ عزوجل عادل بھی ہیں اور رحیم بھی۔ علما کے یہاں مختلف پہلوؤں سے یہ بحث ملتی ہے مثلا ایک وہ لوگ جن تک سرے سے دعوت ہی نہیں پہنچی تو اس کے متعلق قرآن مجید میں ہے کہ: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا {الاسراء: 15} یعنی ہم عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ رسول بھیج دیں۔ اب جن تک رسولوں کی دعوت ہی نہیں پہنچی جیسا کہ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایمازون کے جنگلوں میں برہنہ رہتے ہیں اور انھیں اسلام سے متعلق کوئی خبر ہی نہیں تو انھیں دوزخ کا ایندھن کیوں کر بنایا جائے گا؟ اسی طرح اہل

فترت یعنی جو دو پیغمبروں کے درمیانی عرصے میں ہوئے کہ جب پچھلے پیغمبر کی دعوت قریب معدوم ہو چکی تھی؛ اسی طرح اصحاب اعراف کا بھی معاملہ ہے۔ الغرض دنیوی حکم اور اخروی انجام میں فرق ناگزیر ہے۔ واللہ اعلم

استفادہ تحریر زاہد مغل، طاہر اسلام عسکری، سید متین احمد

44

قرآن کا تصور جنت - ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآن کریم کے تصورِ جنت پر کئی قسم کے جتنے اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کی وجہ قرآن پاک کے اسلوبِ بیان سے جہالت پر مبنی ہیں، قرآن پاک کے کسی بھی بیان کردہ حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ قرآن کریم کے مخاطب کون لوگ ہیں؟ قرآن کریم اپنے بیانات و خطابات میں کن کو خطاب کر رہا ہے؟ اگر قرآن کریم کا مخاطب سمجھ لیا جائے تو اعتراضات بھی ختم ہو جائیں گے۔

قرآن کریم نے جہنم و جنت کی جو بھی تفصیلات یا دیگر حقائق بیان کیے ہیں، ان میں مخاطب بنی نوع انسان ہیں ،یعنی انسانوں کی عمر، طبقہ، قوم، علمیت، پیشہ، جنس، خطہ، علاقہ، زمانہ سے قطع نظر انسان کو بحیثیت انسان کے مخاطب کیا ہے، مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، جاہل ہو یا عالم، دیہاتی ہو یا شہری، ترقی یافتہ ہو یا پسماندہ، مغرب کا ہو یا مشرق کا، قدیم زمانے کا ہو یا جدید زمانے کا، فلسفی ہو سائنسدان، تاجر ہو یا کاشتکار ،شاعر ہو یا شاعری سے متنفر، ادیب ہو یا غیر ادیب، الغرض جو بھی انسان اس روئے زمین پر پایا جاتا ہے

،قرآن کریم اس کو مخاطب کرتا ہے،البتہ اس تخاطب میں انسانوں کو نظریات کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو اقسام مسلمان اور کافر میں تقسیم کیا ہے(پھر ان کے اندر منافقین،اہل کتاب اور دیگر درجہ بندی کی گئی ہے)

اس لئے قرآن کریم جب کوئی حقیقت بیان کرتا ہے تو انسانوں میں سے علمیت،اہلیت،ذہانت کے اعتبار سے ادنی انسان سے لیکر عالی دماغ انسانوں کو بیک وقت مخاطب ہوتا ہے،اب جنت کے بارے میں قرآن کریم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ ایک نہایت آرام دہ اور انسان کی جملہ خواہشات کے پوری ہونے کی جگہ ہے،اب بنی نوع انسانوں کی کچھ خواہشات سب انسانوں میں مشترک ہیں،مشرق کا انسان ہو یا مغرب کا،جوان ہو یا بوڑھا،عالم ہو یا جاہل،ترقی یافتہ ہو یا پسماندہ،مرد ہو یا عورت،قدیم ترین زمانے کا انسان ہو یا جدید انسان ،سب میں مشترک خواہشات اور سب کی بنیادی ضروریات تین ہیں:ایک کھانے پینے کی خواہش،دو،رہنے کے لئے اچھی جگہ کی خواہش، تین جنسی خواہش،

اس لئے قرآن کریم نے بنی نوع انسانوں کی تین مشترک ضروریات وخواہشات کو تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جنت میں کیا کھانے ہونگے ؟رہنے کی کیسی جگہیں ہونگی ؟اور جنسی ضروریات کا کیاسامان ہوگا؟کیونکہ یہ ضروریات ایک دیہاتی اور گنوار کی بھی ہیں اور ایک اعلی ترقی یافتہ زندگی گزارنے والے تعلیم یافتہ انسان کی بھی ہیں۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ انفرادی خواہشات کا آتا ہے،جس میں کوئی جانوروں کا شوقین ہوتا ہے،کوئی کتب بینی کا،کوئی فلسفے کا رسیا ہوتا ہے تو کوئی آرٹ کا،کوئی شاعرانہ مزاج رکھتا ہے تو کئی خشک مزاج،الغرض جتنے انسان،اتنی ان کی پسند جدا جدا،اس کے لئے قرآن کریم نے ایک کلیہ بیان کیا ہے کہ ''وفیھا ماتشتھیہ

الانفس ''کہ جنت میں انسان کو وہ سب کچھ ملے گا، جس کی وہ خواہش کرے گا۔ انفرادی خواہشات کو ایک تو بے شمار ہونے کی وجہ سے الگ الگ بیان کرنا ممکن نہیں، دوسرا ایک کا شوق دوسرے انسان کی بیزاری ہوتی ہے، اس لئے اگر بعض انفرادی خواہشات کو بیان کرتے تو قران کریم کے مختلف حصے کچھ لوگوں کے لئے بیزاری کا سامان ہوتے، جبکہ کچھ کی دلچسپی کا، تو بنی نوع انسان کو مخاطب کرنے والا قران کریم کا مقصد فوت ہو جاتا، زیدی صاحب سے عرض ہے کہ لائبریری کی افادیت پر کوئی کتاب لکھ کر پھر دیہاتیوں اور ان پڑھ لوگوں میں تقسیم کر دے، تو خود بخود قرآن کے اندازِ تخاطب کی حکمت سمجھ آجائے گی، اس لئے ایک عالمی کتاب اور بنی نوع انسان کو مخاطب کرنے والی کتاب کو خاص موضوعات اور خاص طبقات کے لئے لکھی گئی کتب پر قیاس کرنا جہالت اور بے خبری ہے۔

ہمیں لائبریری یا کتابوں کی ضرورت، اپنے نفس میں موجود، تجسس کی انمٹ خواہش کی تسکین کے لیے ہوتی ہے. جنت میں جب حجاب اٹھا دیے جائیں گے، تو تجسس بھی ختم ہو جائے گا، کون چاہے گا جو حقیقت کو براہ راست دیکھنے کے بجائے، کتابوں کے ذریعے حجابوں میں دیکھے.

مادی دنیا میں کتاب سے محبت، تصور حقیقت کے ساتھ محبت کا عکس ہے، لیکن جب اس ماورائے جہاں میں، جب حقیقت خود سامنے آشکار ہو جائے گی، تو کتاب کا نا ہونا ہی بہتر ہے، کیونکہ پھر کتاب حجاب دور کرنے کے بجائے، خود سراپا حجاب بن جائے گی.

تحریر سمیع اللہ سعدی، اطہر وقار عظیم

45

خدااوراسکی جنت کا مخمصہ

بات یہ ہے کہ دیکھنا چاہیے کہ آپ خدا کے سامنے کس پوسچر میں کھڑے ہیں؟

آپ خدا سے چڑے ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ آپ کو کچھ کاموں سے منع کیوں کرتا ہے اور کچھ ایسے کاموں کو کرنے کو کہتا ہے جنہیں کرنے کو آپ کا دل تیار نہیں۔

اس چڑ میں آپ کو ایک عارضہ لاحق ہو گیا ہے جسے opposition defiant disorder کہتے ہیں۔ آپ نے خدا کی ہر بات کی نفی کرنی ہے، اس کا مضحکہ اڑانا ہے، اس کی باتوں کو اپنی مرضی کے الٹے سیدھے معنی پہنانے ہیں۔ اس کی بات کو کان لگا کر دھیان سے نہیں سننا اور ساری بات میں سے ایک ٹیڑھا مطلب نکال کر کج بحثی کرنی ہے۔

آپ نے مان لیا ہے اور آپ جتانا بھی یہی چاہتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ خیر ہے، ترقی ہے، انسانی ہمدردی اور علمی ترقی کے کام ہیں سب انسان نے خود کیے ہیں۔ اگر کہیں باغات سرسبز ہیں، کھیت کھلیان اناج اگلتے ہیں تو اس لیے کہ انسان نے محنت کر کے انہیں بنایا ہے۔ اگر کہیں انسان علمی و سائنسی ترقی کے زینے چڑھتا ہے تو اس لیے کہ وہ ذہین اور محنتی ہے۔ اگر کچھ انسانی بھلائی اور خدمت کے کام ہوتے ہیں تو اس لیے کہ کچھ لوگ ہمدرد واقع ہو گئے ہیں۔ اگر کچھ لوگ خوبصورت ہیں تو اس لیے کہ وہ کچھ مخصوص نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور اس پر مستزاد یہ کہ چونکہ آج یہ خوشحالی، ترقی، حسن (بمعنی گورا رنگ اور نیلی آنکھیں)، انسانی بھلائی کے کام اور علمی ترقی پر غلبہ ان لوگوں کو حاصل ہے جنہوں نے خدا اور اس کے پیغام کو مسترد کر دیا ہے، تو اس لیے گویا کہ یہ ساری خوشحالی اور بھلائی صرف انسان نہیں بلکہ خدا کے منکر انسان کی عقل، قابلیت اور محنت کا نتیجہ ہے۔

یہاں آپ کی خدا سے بیزاری خدا کے منکر غالب انسان کی مرعوبیت سے دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ جب آپ ''میں نہ مانوں'' پر آجاتے ہیں تو باتوں کے معنی بدل جاتے ہیں۔

حالانکہ اللہ بتاتا ہے کہ دنیا میں سبزہ اور پانی اور ہوائیں اور پرندے اور تتلیاں اور تارے اور جگنو اس لیے ہیں کہ انہیں اللہ نے ہمارے لیے تخلیق کیا ہے۔ کھلیان اناجوں سے، سمندر مچھلیوں سے، زمین معدنی خزانے سے اور چراگاہیں مویشیوں سے اس لیے بھری ہیں کہ اللہ نے انہیں انسانوں کے لیے سامان رزق کے طور پر پیدا کیا۔ مائیں بچوں کو چھاتیوں سے لگاتی ہیں، راتوں کو جاگتی ہیں، اپنا آپ گھلاتی ہیں، باپ دن بھر محنت

مزدوری کرتا ہے، دوست دلداری کرتا ہے، بیوی اور شوہر ایک دوسرے کے لیے مودت اور رحمت کے ساتھ ایک دوسرے کا لباس بنتے ہیں تو اس لیے کہ اللہ کو نسل انسانی کی بقا عزیز ہے۔

انسان علم و جستجو کے لیے زمین کا سینہ چیرتا ہے، آسمانوں کو کھنگالتا ہے، ذرے کا دل شق کر کے توانائی کا ذخیرہ دریافت کرتا ہے، انسانی جسم و ذہن کی دنیاؤں کا کھوج لگا کر بیماریوں کا علاج ڈھونڈتا ہے تو اس لیے کہ الرحمان نے علم کی جستجو کے ساتھ اسے تخلیق کیا اور دنیا کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔

جب آپ یہ پڑھتے جاتے ہیں، جب آپ کو خدا کی خلاقیت اور بے پناہ طاقت کے ساتھ اس کے جمال اور اس کی محبت کا عرفان ہوتا ہے تو آپ کا پوسچر تبدیل ہو جاتا ہے۔ آپ کا دل محبت، شکر اور بندگی کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کندھے ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور آنکھیں جھک جاتی ہیں۔

اب آپ کو سمجھ آنے لگتا ہے کہ جو خدا ذہن کی پیاس تخلیق کرتا ہے، اور اس پیاس کی سیرابی کے لیے سوچنے اور کتابیں لکھنے والے پیدا کرتا ہے۔ جو خدا کہانی سننے کا شوق دے کر بچے کو دنیا میں بھیجتا ہے اور کہانی تخلیق کرنے والے جادوئی ذہن تخلیق کرتا ہے۔ جو خدا خود ''صاحب کتاب'' ہے، جس کی کتاب ہر زمانے میں ''بیسٹ سیلر'' رہی، اس خدا نے اپنے نبی امی صلی اللہ و سلم کو کتاب سکھائی، اور معلم بنا دیا۔

جو خدا اپنی کتاب میں حکمت و دانش کے موتی بکھیر کر انسان کو سوچنے، غور فکر کرنے، علم حاصل کرنے اور لکھنے، پڑھنے اور قوت بیان کو استعمال کرنے کی بار بار ترغیب دلاتا ہے۔ جو خدا خود اپنی کتاب میں ''اچھی کہانیاں'' (احسن القصص) سناتا ہے کہ انسان کو کہانی سے متاثر ہو کر سبق لینے والا بھی اسی نے بنایا ہے۔ وہ خدا کیا علم دشمن ہو گا؟

اس خدا کے ماننے والوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ دشمنوں نے جب انہیں دریا برد کیا تو اندلس کے دریاؤں کا پانی ان کی روشنائی سے سیاہ ہو گیا۔ اس کے ماننے والوں کے مکتبوں کے تاریخ میں چرچے ہیں اور اس کے چاہنے والے علماء کے لیکچر سننے کو بیس، بیس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ آپ اس خدا کی جنت کا مضحکہ اڑاتے ہیں کہ اس میں علم والوں کی تسکین کا سامان نہ ہو گا؟

آپ سمجھتے ہیں کہ علوم، ترقی، لائبریریاں، کتابیں، مکتبے، دانشمند اور حکیم، معلم اور کہانی کار، تخلیق اور دانشمندی، لیکچر اور تہذیب بس آج کے دور کی پیداوار ہے کہ آپ کی آنکھیں ان کو دیکھکر خیرہ ہوئی جاتی ہیں؟ اور ذہنی مرعوبیت آپ سے اول فول کہلواتی ہے۔

عامی ایسا سمجھے تو قبول ہے مگر ''علم ودانش'' والے ایسی باتیں کریں تو سوال بنتا ہے کہ چیری پکنگ کے بجائے خدا کی کتاب کو اس گہرائی سے کیوں نہ کھنگالا جیسا کہ فلاں دانشور کی کتاب کو کھنگالا؟

جنت کا وعدہ ایک سامنے کی بات ہے جسے ہمیشہ کٹ حجتی نے مذاق بنانے کی کوشش کی ہے۔ انسان زندگی کی تپش اور حسرتوں سے گھبراتا ہے، تو خدا اسے بتاتا ہے کہ گہرے سبز باغات تمہارے منتظر ہیں۔ انسان کو انسان کے ہاتھوں فساد، بدامنی، قتل وغارت، لوٹ مار اور جان ومال کے خوف نے عاجز کیا تو بتایا گیا کہ جنت ابدی امن کا مقام ہے۔ انسان کو اپنی خوہشات پر بہت سی وجوہات کی بنا پر پابندیاں لگانی پڑیں، تو امید دلائی گئی کہ وہاں کوئی قدغن نہ ہو گی۔

مگر ظاہر ہے کہ خواہشات اور نعمتیں یہاں پر بس نہیں ہوتیں۔ اس لیے انسان کی لامتناہی خواہشات اور ضروریات کے لیے فرمایا'' وہاں ہر وہ شے ہو گی جس کی تمہیں چاہ ہے، اور وہاں وہ سب ہو گا جو تم مانگو۔''

مگراس جنت کے لیے کندھے جھکانے ہوں گے، سجدہ ریز ہونا ہوگا، بات ماننی ہوگی، بھلائی کے کام اور محنت کرنی ہوگی۔ مستقل مزاجی اور صبر کرنا ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے سامنے بگڑی ہوئی ناخلف اولاد کے بجائے ایک محبت کرنے والے سوالی کی طرح حاضر رہنا ہوگا۔

وہ خود کہتا ہے ھل جزاء الاحسان الا الاحسان؟

تحریر جویریہ سعید

46

اسلام میں حوروں کے فضائل کی غرض وغایت

تحریر: ابوالحسن رازی

سیکولر/لبرل طبقے کی طرف سے جنت میں حوروں کے وجود پر کئی حوالوں سے تنقید کی جاتی ہے۔ کبھی فضائل کی تاریخی روایات کو نشانہ بنایا جاتا ہے اور کبھی کسی واعظ پر اس لیے غصہ نکالا جاتا ہے کہ وہ اپنے بیان میں حوروں کا تذکرہ کرتا ہے اور فحش انداز میں کرتا ہے۔۔ کیا واقعی ان مبلغ صاحب کے بیان میں حوروں کا ہی تذکرہ ہوتا ہے ؟ اگر انکے کسی بیان میں کہیں حور کا ذکر آیا بھی تو وہ کیسا اور کتنا تھا؟ جنہوں نے کبھی انکو سنا ہو وہ ان باتوں کی حقیقت جانتے ہونگے کہ اس میں کچھ بھی قابل اعتراض نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ یہی لبرل معترضین انتہائی فحش افسانے اور ناول شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ اردو میں منٹو کے افسانے ہوں یا انگلش میں (Fifty Shades of Grey) جیسے جنسی اذیت پسندی پر ناول اور پورن فلمیں انکے ہاں ادب اور فنون لطیفہ کا حصہ سمجھتی ہیں، (Naturism) عریانیت پسندی یا ہپی ازم پر لکھے گئے ایوارڈ یافتہ ناولز پڑھنے کا تذکرہ یہ بڑے فخر سے کرتے ہیں۔۔ معلوم ہوا ان لبرلز کو اصل مسئلہ یا تکلیف حوروں کے بیان سے نہیں ہے بلکہ انہیں علماء و مذہبی نظریات کا مذاق اڑانے اور توہین کرنے کا کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔۔ یہ بھی نوٹ کیا گیا ہے کہ ان لبرل معترضین کی طرف سے حوروں پر طنز و تنقید ایسے انداز میں کی جاتی ہے 'جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید جنت صرف شہوت کی تکمیل کا اڈہ ہے اور اہل بہشت کی خوشی، سکون، دلجمعی کے لئے وہاں اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یا اہل

ایمان صرف بہتر حوریں حاصل کرنے کے لیے اتنی عبادات کرتے ہیں اور جانیں تک قربان کر دیتے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے جنت میں حوروں کا وجود ضرور ہے لیکن یہ مومن کا مقصد نہیں ہیں نا اسلام انکو مقصد بنا کے پیش کرتا ہے۔ انکا تذکرہ اور بیان محض جزوی ہے۔اس حقیقت اور حوروں کے فضائل کی غرض وغائیت واضح کرتی ایک تحریر

حاضر ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام کا تدریجی وارتقائی اسلوبِ تربیت اور حوروں کے فضائل کی غرض وغایت

معاشرے میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو الہامی عقائد و نظریات سے شد و مد کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں جس کی وجوہات میری ناقص رائے کے مطابق یہ ہو سکتی ہیں ۱)ان عقائد و نظریات سے کلی یا جزوی طور پر ناواقفیت۔ ۲)ان نظریات سے متضاد و متصادم نظریات سے گمراہ کن تاثر۔ ۳) تعصب و نفرت کی خلیج ۔سوشل میڈیا پر جن خیالات اور تبصروں کا میں نے مشاہدہ کیا وہ چند سوالات ہیں جو نابالغ ذہن کی اختراع کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے جیسے :

کیا اسلام میں حوروں کے فضائل اور ترغیب جنسی میلان کی ترغیب ہے ؟

کیا حوریں اس عبادت کا بدل ہیں جو دنیا میں کی جاتی ہے ؟

کیا یہ عورت کو محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھنا نہیں کہلاتا؟

مردوں کے لیے حوروں کی ترغیب و فضائل ہیں لیکن عورتوں کے لیے اس قسم کے فضائل و ترغیب کیوں نہیں بیان کیے گیے؟ وغیرہ وغیرہ

یہ تمام اشکالات اسلام کے تربیتی اسلوب کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہے اور مؤخر الذکر تو محض بے حیائی کا عکاس اور اسلام کے تصور حیا کو یکسر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہے۔ دراصل ان سطور کو لکھنے کا محرک بھی اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات اور شر انگیزی پھیلانے والے فتنہ پردازوں کی سوشل میڈیا پر اس قسم کی سرگرمیاں ہی ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ عبادت کا مقصودِ اصلی محض اللہ ہی کی رضا ہے لیکن خوب ذہن نشین کر لیا جائے کہ رسول عربی ﷺ نے نہ صرف جہنم سے ڈرایا ہے بلکہ جنت کی بشارتیں بھی سنائی ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ نے جنت کی طرف بڑھنے کا حکم فرمایا اور اس کی نعمتوں کا جابجا تذکرہ فرمایا جن میں پاکیزہ بیویوں کا تذکرہ ان کے اوصاف اور حسن و جمال کے ساتھ فرمایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اسلام میں حوروں کے فضائل و استحضار کی غرض و غایت کیا ہے؟ اگر اس سوال کے تشفی بخش جواب سے یقینی آگاہی حاصل ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذکورہ بالا اشکالات کی کوئی گنجائش باقی رہ جائے۔ اسلام میں قرنِ اول ہی سے افراد کی تربیت کا جو نظام وضع کیا گیا وہ آج کے ہر ہر فرد کے لیے بطریقِ اولیٰ مؤثر ہے جس کا کوئی بھی متبادل نظامِ تربیت قطعی طور پر ناکافی اور غیر مؤثر ہو گا۔ اب اسلام کے نظام تزکیہ و تربیت کے اسلوب کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اسلام کا تزکیہ و تربیت کا نظام تدریجی وار تقائی ہے جو حکمت و بصیرت سے پُر ہے جس کے مدارج اور ارتقائی مراحل میں سے چند ایک کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

اول۔۔۔۔ فضائل و ترغیب اور استحضارِ عمل (عمل پر اللہ کے وعدے کا یقین): کا مقصود افراد میں ابتداًاعمال سے موانست و مناسبت، وابستگی و رغبت اور شوق پیدا کرنا ہے۔ مثلاً نماز ہی کو لے لیجیے اس سے وابستگی اور رغبت پیدا کرنے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے نہ صرف قراءت و قیام، رکوع و سجود وغیرہ کے فضائل بیان کیے گئے بلکہ اذان کے فضائل بیان کیے گئے، اذان کے سننے اور جواب دینے پر اجرو ثواب کی نوید سنائی گئی، مؤذن کے مناقب بیان کیے گئے۔ اُٹھان پیدا کرنے کا یہ سلسلہ یہیں پہ ختم نہ ہوا بلکہ نماز میں شغف بڑھانے کے لئے وضو کو حسن و نکھار بخشا، اس پر سنتوں اور مستحبات کا تزین کیا گیا، وضو میں کمال پیدا کرنے کے لیے مسواک کے فضائل اور اجر و ثواب کو بیان کیا گیا، نماز کی عظمت پیدا کرنے کے لئے وضو کر کے گھر سے جانے والا ایسا بتلایا گیا گویا احرام باندھ کر حج کو جا رہا ہے پھر نماز کے انتظار میں بیٹھنے کی فضیلت بیان کی گئی کہ گویا نماز کا ثواب پا تا رہتا ہے۔ یوں صحابہ کی نماز میں بے مثل و مثال شغف و تعشق، خشوع و خضوع اور حد درجہ کمال پیدا کر دیا گیا کہ ان پر نماز کے اسرار و رموز اپنی پوری حقیقت کے ساتھ کھل گئے۔

دوم۔۔۔۔ آسان سے مشکل کی طرف: اس اصول کے تحت پہلے افراد کو ظاہری سانچے میں ڈھالا گیا ازاں بعد ترہیب و ترغیب اور اُٹھان کے ذریعے دلوں کی زمین کو خوب نرم کر کے اس قابل کیا جاتا رہا کہ اس میں ہر اگلی فصل کاشت کی جا سکے جو زیادہ محنت طلب اور قدرے مشکل بھی ہو۔ عبادات و اخلاقیات کے مراحل سے ہوتے ہوئے افراد کو معاشرت و معیشت اور معاملات و قضا کے دین کی تکمیل تک لے جایا گیا یوں ارتقائی و تدریجی مراحل کا یہ سلسلہ ایک حقیقی اسلامی فلاحی ریاست کے قیام پر منتج ہوا۔ مثلاً ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ فلاں شخص رات کو نماز پڑھتا ہے اور صبح

ہوتے ہی چوری کرتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کی نماز اس کو عنقریب اس فعل سے روک دے گی۔ تمام معاملات میں سدھار پیدا کرنا مشکل بھی ہے اور دیر طلب بھی لیکن نماز میں شغف اور خشوع و خضوع معاملات کی درستگی کی دلیل ہے۔ عبادات کے دین میں استحکام کے بعد تربیت کے دائرہ کار کو اخلاقیات و معاشرت کی جانب بڑھایا تو ایسے معاشرے کی تکمیل ممکن ہو سکی جو اقوامِ عالم کے لئے نمونہ قرار پایا۔

ذرا سوچیے ایسا کیوں نہ ہوا کہ تمام احکام شرعیہ بیک وقت نازل ہو جاتے؟ دیکھیے شراب کی حرمت اور پردے کی فرضیت کا عمر رضی اللہ عنہ کی فکر پر نازل ہونا تو ایک تکوینی امر تھا لیکن اعلان نبوت کے طویل عرصہ بعد ان احکامت کے نزول میں در حقیقت اسلام کا یہی تدریجی وارتقائی اسلوب تربیت ہی حائل تھا گویا ان احکامات کا نزول ایک مناسب وقت کی تلاش میں تھا جیسے کسان بنجر اور سخت زمین میں بیج ہر گز نہیں ڈالتا بلکہ اس کو اس قابل بناتا ہے کہ اس میں مطلوبہ فصل کاشت کی جاسکے بعینہ زیر تربیت عملہ کے مناسبِ احوال شرعیت مطہرہ کے احکامات متوجہ ہوتے رہے۔ انسانی تربیت کے اس نظام نے عبادات، اخلاقیات و معاشرت اور معاملات کے دین سے ہوتے ہوئے قضا کے دین کو اپنی وسعتوں میں سمو لیا کہ ایک یہودی اور جلیل القدر صحابی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقدمہ جب عدالت کے روبرو ہوتا ہے تو قاضی کا منصفانہ و عادلانہ فیصلہ یہودی کے ضمیر کو جھنجوڑ کے رکھ دیتا ہے اور اسے قبول اسلام پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر مصلح عظیم ﷺ نے ایک فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی اور تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد اس دنیا سے اس حال میں پردہ فرمایا کہ ایک حقیقی اسلامی فلاحی ریاست قائم ہو چکی تھی گویا تکمیل دین کا عمل اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا

۔اور آیت مبارکہ ۔۔۔۔(ترجمہ: آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمھارے لئے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لئے) پسند کر لیا)۔۔ نازل ہوئی۔

یاد رہے اس تمام تر تربیتی پروگرام میں محنتِ دعوت کارفرما رہی اور آج بھی ختم نبوت کے طفیل یہی کار نبوت خیر امت کا منصب واولین فریضہ ہے جس کی انفع صورت محض نہج نبوت پر تربیت کا یہی ارتقائی و تدریجی اسلوب ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ جب تک امت مسلمہ اس فرضِ منصبی کو اجتماعی طور پر نبھاتی رہی تو مذکورہ بالا تمام امور میں دین کی بہاریں دکھائی دیتی رہیں جیسے ہی اجتماعی طور پر اس فریضے سے غفلت برتی گئی تو تربیت کا مذکورہ نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا چلا گیا اور نتیجتاً سب سے پہلے ریاستی نظام میں بگاڑ آیا پھر قضا اور امور انتظام (Administration) کا دین جاتا رہا اور پھر معاشرت و معاملات کا وہ حال ہوا کہ آج ہم نہ صرف اپنی پہچان کھو بیٹھے ہیں بلکہ اغیار کی مشابہت کو قابل فخر سمجھتے ہیں اور آج امت کی حالت اس قدر پتلی ہو چکی ہے کہ محض عبادات کا دین کسی قدر نظر آتا ہے۔

سوم ۔۔۔۔ قلبی کیفیت اور ظاہری نوعیت و مراتب کا لحاظ: اسلام قلبی کیفیت اور ظاہری نوعیت و مراتب کے اعتبار سے ہر سطح کے افراد کی تربیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک منظم اسلوب اختیار کرتا ہے۔امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عام لوگوں کی توبہ ظاہری گناہوں سے ہوتی ہے اور صالحین کی توبہ باطنی گناہوں اور مذموم اخلاق سے ہوتی ہے اور متقین کی توبہ شکوک و شبہات سے ہوتی ہے اور محبین کی توبہ ان اوامر سے ہوتی جو ان کو یادالٰہی سے غافل کر دیں اور عارفین کی توبہ اس مقام سے ہوتی جس پر وہ پہنچ چکے ہوں مگر اس سے مافوق دوسرا مرتبہ ہو جس پر ان کو پہنچنا چاہیے اور چوں کہ معرفت کے مراتب و منازل لا متناہی ہیں اس لیے عارفین کی توبہ کا منتہیٰ نہیں۔(تبلیغ دین) دوسرا یہ کہ آپ ﷺ ابو بکرؓ کا سارا مال قبول فرما لیتے ہیں

اور ایک دوسرے شخص سے اس لئے انکار فرماتے ہیں کہ ازاں بعد جزاع فزاع کے فتنے میں پڑ جائے گا۔ یہ تو محض نمونے کے طور پر عرض کیے ہیں لیکن حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ میں اس قسم کے واقعات کی کمی نہیں جن میں آپ ﷺ نے افراد کے ایمان، تقویٰ، توکل اور ظاہری نوعیت و مراتب کو مد نظر نہ رکھا ہو۔

انسان طبعاً جنسِ مخالف کی طرف میلان و رجحان اور حب مال و جاہ کا شکار رہتا ہے۔ یہی دو چیزیں انسان کی تمام تر محنت اور کاوشوں کا مرکز و محور رہی ہیں۔ مصلح کبھی بھی اپنے زیر تربیت عملہ کی طبیعت و مزاج، میلان و رجحان کو نظر انداز نہیں کرتا۔ یاد رہے جنسِ مخالف کی طرف میلان و رجحان اور حب مال و جاہ انسان کی روز اول ہی سے کمزوری رہی ہیں لہٰذا ہر دو جانب سے رخ کو ہٹانے کے لئے ابتداً جنت کی حوروں، نعمتوں کو بیان کیا جاتا ہے (یعنی فضائل و ترغیب اور استحضار عمل کے ضمن میں) اور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرنے کے لئے دنیا کی مذمت کی جاتی ہے اور مغیبات کے تذکرے کیے جاتے ہیں (یعنی احوالِ آخرت: برزخ، جنت اور جہنم کو بیان کی جاتا ہے) تاکہ محنت کا رخ پھر جائے مبادا دنیا کی عارضی شہوتوں، لذتوں اور آرائش و زیبائش میں الجھ کر اپنے مقصدِ اصلی سے ہٹ جائے اور اپنے خالق حقیقی کو ناراض کر کے اپنی آخرت برباد کر لے۔ لیکن اصلاحِ احوال، تزکیہ نفس اور منازلِ سلوک طے کر لینے کے بعد اسی انسان میں نہ حوروں کی تمنا باقی رہتی ہے نہ جنت کی خواہش وہ محض اللہ ذوالجلال کی رضا کا متلاشی بن جاتا ہے۔ چوں کہ معاشرہ خاص و عام لوگوں کا مجموعہ ہوا کرتا ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں کہ تمام تر افراد ایک ہی قلبی کیفیت ،نوعیت کے حامل ہوں لہٰذا اگر کوئی شخص کسی وجہ سے تربیت کے تمام ادوار سے نہ گذر سکے یا کسی وجہ سے اس کو تربیت کے مواقع میسر نہ آسکیں تو ترغیب و ترہیب سے کم از کم وہ فضائل (جنت کی حوروں اور دیگر

نعمتوں)اور وعیدوں (جہنم کے عذاب) کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی عقلی بساط اور کیفیت قلبی کی بنیاد پر کسی نہ کسی درجے میں دین سے وابستہ رہتا ہے اور خالق حقیقی کی بندگی بجالاتا رہتا ہے۔

47

شہید، 72 حورین اور ملحدین

زیر بحث نکات

☆ جنت کی حور اور ملاحدہ کی ذہنی کیفیت:

☆حوروں کا لالچ کیوں؟

☆اتنی ساری حوریں کیوں؟

☆اگر مردوں کے لئے حور تو عورتوں کے لئے کیا؟

☆ کیا ایک مجاہد حوروں کے لئے اپنے آپ کو اڑا دیتا ہے؟

’یہ لوگ خود کش حملے اس لئے کرتے ہیں کیوں کہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ کافروں کو بم سے اڑادیں گے تو انہیں جنت میں ۷۲ کنواریاں ملیں گی‘۔

یہ اور اس طرح کے جملے مغربی استعمار کے وکلاء اور ان کے حمایتی دیسی لبرلوں اور ملحدوں کی طرف سے عام طور بولے اور پھیلائے جاتے ہیں۔ گویا کہ مسلم مقبوضہ جات میں مسلمانوں کی طرف سے جو مزاحمت ہو رہی ہے اس کا پورا مقدمہ یہی ہے۔ نہ عراق پر امریکہ نے حملہ کیا اور نہ افغانستان پر۔ نہ ہی کبھی ایسا ہوا کہ امریکی حمایت اور اقوام متحدہ کی توثیق سے اسرائیل نے پوری فلسطینی قوم کو یرغمال بنایا اور نہ ہی کبھی پوری فلسطینی قوم کو نکال کر ان کی جگہ یہودیوں کو لا بسایا۔ نہ ہی اسرائیل نے کسی فلسطینی کو کوئی تکلیف پہنچائی۔

اللہ کے راستے میں قتال دراصل اپنی دنیا کی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد کے لئے قربان کر دینا ہے۔ یہ ظلم کو قبول نہ کرنے کی ضد ہے۔ یہ حق کے لئے اپنی جان دینے کا جذبہ ہے۔ یہ ایک یقین ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے زیادہ اہم حق ہے۔ لیکن بات کو گھما کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے گویا کہ یہ پورا جھگڑا ہی بہتر حوروں کا ہے اور بس۔ گویا مغربی استعمار کا مقابلہ کرنے والا ایک بے شعور اور جنس زدہ قسم کا کوئی شخص ہے۔ اس طرح کی لغو باتیں کر کے اصل مسئلہ ہی کہیں دبا دیا جاتا ہے۔

چونکہ یہ موضوع ملحدوں اور مغربی استعمار کے وکلاء کی طرف سے بار بار آتا ہے اس لئے جنت کی کنواریوں پر بھی کھل کر بات کر لی جائے۔ لیکن اس موضوع پر کچھ بھی عرض کرنے سے پہلے یہ بتا دیں کہ بحث اور مناظرے میں ایک چکما دیا جاتا ہے جس کا مقصد عام پر طور پر ایک صحیح مؤقف کو غلط ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس چکمے کو ریڈ ہیرنگ (Red Herring) کہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک سنجیدہ اور قابل غور مسئلہ پر سے

بحث کے ارتکاز کو ہٹانے کے لئے درمیان میں کچھ ایسی بات کی جاتی ہے کہ بحث اصل موضوع سے ہٹ کر ایک غیر متعلقہ موضوع کی طرف چلی جاتی ہے۔ بحث کے دوران بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر عوامی ذہن فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ بہتر کنواری حوروں والا نکتہ بھی ایسا ہی ہے اس لئے اصل مسئلہ کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لئے اسی کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔

مناظرے کو غلط طریقے سے جیتنے کے لئے ایک اور چال استعمال کی جاتی ہے جسے سٹرا مین آرگیومنٹ (Straw man argument) کہتے ہیں۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ فریق مخالف کا مقدمہ بھی آپ خود بیان کرتے ہیں اور اس کی تردید بھی خود کر کے خوش ہوتے رہتے ہیں کہ میں نے ہرا دیا۔ حالانکہ ایسا شخص فریق مخالف کے مقدمے کو نہیں بلکہ خود اپنے مقدمے کو ہرا رہا ہوتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اسلام کے مقابلے میں یہ دونوں چالیں ملحدین اور مغرب کے مفکرین کی طرف سے خوب استعمال ہوتی ہیں۔ اسلام پر شدید ترین تنقید کرنے کے حوالے سے ایک دہریہ بہت مشہور ہے جس کا نام رچرڈ ڈاکنز ہے۔ یہ بندہ مسیحی پس منظر سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ یہ مسیحیت پر زیادہ تنقید کرے۔ لیکن اس کے نشانے پر اکثر اسلام ہوتا ہے اور اس معاملے میں یہ بندہ ریڈ ہیرنگ استعمال کرنے میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔

☆ جنت کی حور اور ملاحدہ کی ذہنی کیفیت:

اب آتے ہیں قتال اور حوروں کے موضوع پر۔ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں واضح طور پر موجود ہے کہ اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کو جنت کی نعمتیں عطا کرے گا اور ان نعمتوں میں پاکیزہ بیویاں بھی شامل ہیں۔ جنت میں عطا کی جانی والی بیویوں کی یہ خصوصیات بیان کی گئی ہے۔

1. انہیں حور عین کہا گیا ہے۔ یعنی بڑی آنکھوں والی۔ (الرحمن ۷۲، الواقعۃ ۲۲) 2. جیسے حفاظت سے پوشیدہ رکھا ہوا موتی۔ (الواقعۃ: ۲۳) 3. جیسے یاقوت و مرجان: (الرحمن ۵۸) 4. عروب، شوہروں کی محبوبہ، دل لبھانے والی۔ (سورہ واقعہ ۳۷) 5. ہم عمر (سورہ واقعہ ۳۷) 6. پاکیزہ بیویاں۔ (آل عمران ۱۵، النساء ۵۷) 7. نیچی نگاہوں والی۔ (سورہ رحمن ۵۶) 8. خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ، اچھی اور خوبصورت۔ (سورہ رحمن ۷۰) 9. جنہیں کسی جن وانس نے نہ چھوا ہو گا۔ (سورہ رحمن، ۵۶، ۷۴) 10. نوجوان، بھرے جسم والی۔ (سورہ نبأ ۳۳) 11. اللہ نے انہیں خاص طور پر الگ سے بنایا ہو گا۔ (الواقعہ ۳۵) 12. کنواریاں۔ (الواقعہ ۳۶)

احادیث میں مزید اس کی وضاحتیں آئی ہیں۔ لیکن یہاں پر جنت کی حوروں کی تمام خصوصیات بیان کرنا مقصد نہیں ہے۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ جب جنت کی بیویوں کی بات کی جاتی ہے تو مخالفین صرف ایک لفظ سے جنت کی پاکیزہ بیویوں کا ترجمہ کرتے ہیں اور وہ لفظ ہوتا ہے "ورجن (Virgin)" یعنی کنواری۔ حالانکہ جس کے اندر طبعی سلامت روی کی تھوڑی سی رمق باقی ہو وہ جنت کی بیوی کی جو تشریح قرآن میں آئی ہے اس کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھے گا۔ لیکن یہاں پر نظر "کنوارے پن" سے آگے جاتی ہی نہیں۔ اس طرح سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان کو صرف اور صرف عورت کی بکارت سے واسطہ ہے۔ نہ اسے اس کی حسین اور بڑی آنکھوں والی ہونے سے کوئی واسطہ ہے، نہ اس کی محبت اور پاکیزگی

سے کوئی غرض۔ یہ شاید عالم اسلام سے ملحدین اور مغرب کے شائقین کی توجہ حاصل کرنی کی ایک سستی سی کوشش ہے۔ ہم نے مضمون کے ابتداء میں ریڈ ہیرنگ پر جو بات کی تھی اس بات کو یہاں پیش نظر رکھیں۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک بھرپور عورت کا باکرہ ہونا نا قابل یقین حد تک انوکھی چیز ہے۔ قانونی طور پر رضامندی کی عمر (age of consent) طے ہونے کے باوجود ان کے یہاں بچی کم عمری میں ہی اپنے کسی دوست یا بالغ رشتہ دار کے ساتھ بکارت کھو چکی ہوتی ہے۔ یا ان کے نزدیک عورت کا باکرہ ہونا ہی قابل قبول نہیں ہے۔ قرآن جس کنواری حور کی بات کر رہا ہے وہ اپنے شوہر کی انتہائی محبوب، ہم عمر یعنی اپنے شوہر کے مزاج کو سمجھنے والی، نگاہیں نیچی رکھنے والی، یعنی اس کی نگاہیں اور دل صرف اپنے مرد کی طرف ہی متوجہ ہوں گے۔ پھر پاکیزہ اور ایسی پاکیزہ کہ اسے اس کے شوہر سے پہلے کسی جن وانس نے چھوا تک نہ ہو۔ اس سب کے باوجود جنت کی بیویوں کی تشریح صرف پردہ بکارت سے کرنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مغرب زدہ انسان کی سوچ کس سطح کی ہے اور وہ قرآن کو بھی اس سطح سے آگے سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ فری مارکیٹ معاشیات نے انسانوں کے دماغ کو جس طرح سے کرپٹ کیا ہے شاید یہ اسی کی ایک جھلک ہے۔ آخر فری مارکیٹ میں عورت بھی تو سامان تجارت ہی ہے چاہے وہ طوائف ہو یا خوبصورت کپڑوں میں ملبوس اپنی مسکراہٹ بیچنے والی کوئی ریسپشنسٹ یا پھر اپنی لوچ دار آواز میں کسی مرد کے غصے سے کمپنی کو بچانے والی کسٹمر کیئر یا کال سنٹر والی خاتون۔ یہ کرپٹ دماغ جیسے ہی جنت کی حور کا لفظ سنتا ہے اس کے دماغ میں کسی حیا باختہ عورت کی فحش فلم چلنے لگتی ہے اور وہ اللہ کے اس زبردست انعام کو اس سے بہتر انداز میں سمجھ نہیں پاتا یا سمجھنا نہیں چاہتا۔

☆حوروں کا لالچ کیوں؟

اس بارے میں اسلام مخالف فکر کی طرف ایک سوال یہ بھی ہے کہ اللہ نے حوروں والا پیکیج دیا ہی کیوں؟ یہ سوال بھی ایک غلط تاثر یہ دیتا ہے کہ بس اللہ نے حوروں کا ہی وعدہ کیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے جنت میں مومنین کے لئے بہترین نعمتوں کا وعدہ کیا ہے جس میں پاکیزہ بیویاں بھی شامل ہیں۔ باغات، دودھ اور شہد کی نہریں، چشمے، نہ ختم ہونے والے پھل، پرندوں کا لذیذ گوشت، محلات، ایسی بہترین شراب جس سے سرور تو حاصل ہو لیکن نہ بندہ اپنی عقل کھوئے اور نہ سر درد ہو، گاؤ تکیہ لگا کر دوستوں کی محفلیں، جنت کا بازار، اپنے رشتہ داروں اور چاہنے والوں کا ساتھ، خدمت کرنے والے غلمان، موت، بیماری، خوف اور بڑھاپے سے ہمیشہ ہمیشہ کا چھٹکارا، سلاماً سلام کی تحیات اور وہ سب کچھ جو بندہ چاہے اور جس کا تصور ہم دنیا میں نہیں کر سکتے۔ اور اس سے بھی آگے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت، اور پھر اللہ کی طرف سے جنتیوں کو شراب طہور پلانا، اور پھر اللہ کا دیدار اور مالک الملک کی طرف جنتیوں پر سلام اور سب سے بڑی چیز اللہ کی طرف سے رضامندی کا پروانہ، وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ کیا کسی بندے کو اور بھی کچھ چاہئے؟

ان سب چیزوں کا بیان قرآن پاک میں ہوتے ہوئے کیا کوئی شخص جس کی ذہنی حالت صحیح ہو مؤمن پر اللہ کی طرف سے ہونے والے انعامات کی تشریح ۷۲ کنواریوں کے نام پر کر سکتا ہے؟ یہ کیسا ذہن ہے جس کی سوچ بہتر کا عدد اور کنوارے پن میں ہی اٹکا ہوا ہے؟ یا وہ یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے رب نے بس اپنے بندوں کے لئے کنواریاں تیار رکھی ہیں۔ یا پھر مسلمانوں کے شعور کی سطح پر خواہ مخواہ افسوس کر کے انہوں کوئی خاص خوشی ہوتی ہے۔ یا اپنے غلط کیس پر زبردستی مطمئن رہنے کے لئے یہ ذہن اس سے آگے سوچنے پر تیار نہیں ہے؟

تو صاحبو اللہ کا پیکیج تو بہت بڑا ہے اور اتنا بڑا ہے کہ انسان کا یہ چھوٹا سا دماغ اس کا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ یہ پیکیج انسان کی فطرت سے سو فی صد مطابقت رکھتا ہے اور اس میں ہر سطح کے انسان کے لئے سکون و اطمینان اور زبردست اپیل موجود ہے۔

لیکن حوریں پھر بھی ہیں، تو سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ جنسی پیکیج دینے کی اللہ کو کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس بارے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ ایک کھلی خیانت ہوگی کہ اللہ کے انعامات کے سلسلے میں حوروں کا اس طرح سے ذکر کیا جائے گویا بس یہی کچھ ہے۔ اب اس پورے پیکیج میں پاکیزہ بیویوں کا ہونا کیوں مسئلہ ہے، کیا یہ انسانوں کی فطری ضرورت نہیں ہے کہ اللہ کی رحمت سے اس کے سکون اور لذت کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں؟ اسلام کے مخالف کیوں یہ سمجھتے ہیں کہ صرف کسی حیا باختہ عورت سے ہی لذت حاصل کی جاسکتی ہے اور اس سے محظوظ ہونے پر صرف اللہ کے دشمنوں کا اجارہ ہے؟ کیوں دین کے ماننے والوں کو اس سے احتراز کرنا چاہئے؟ جن کے نزدیک جنسی لذت کا مطلب کسی فحش فلم میں چلنے والے مناظر ہیں تو یقیناً مؤمنین کو ملنے والے انعامات سے یہ چیز مطابقت نہیں رکھتی۔ کیا ضروری ہے کہ جنس اور عورت کو مغرب کی مسخ شدہ فطرت کے تناظر میں ہی دیکھا جائے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ مستشرقین سے اسلام سیکھتے ہوئے انہوں نے اسلام کو بھی مسیحیت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہو جہاں پر عورت اور جنس مجبوری کے گناہ ہیں؟ الغرض خالص انسانی یا اسلامی نکتہ نظر سے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔ ایک ایمان والے کے لئے دنیا میں بھی ایک اچھی بیوی اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے تو آخرت میں اللہ اپنے بندوں کو اس انعام سے کیوں نہ نوازے؟

اگر جنت میں اتنے سارے انعامات کے ساتھ پاکیزہ بیویوں کا ذکر نہ ہوتا تو بھی اعتراض کرنے والے لازماً یہ سوال کرتے کہ اللہ نے اتنی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیا۔اب چونکہ ذکر آگیا ہے اور اتنے اچھے انداز میں آیا ہے تو بھی منکروں کو چین نہیں۔یہ صرف ایک ضد اور ہٹ دھرمی کی کیفیت ہے۔

☆اتنی ساری حوریں کیوں؟

ایک سوال یہ بھی آتا ہے کہ بہتر بیویاں کیوں؟ایک کیوں کافی نہیں۔اول تو یہ بات واضح ہو کہ قرآن میں کہیں پر بھی جنت کی بیویوں کی تعداد نہیں آئی ہے۔کچھ ضعیف احادیث میں مبالغہ آمیز تعداد آئی ہیں۔ایک صحیح حدیث میں سچ مچ شہید کے لئے ۷۲ حوروں کی خوشخبری آئی ہے۔ترمذی میں یہ حدیث مذکور ہے جو کہ سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔مقدام بن معدی کرب سے روایت ہے،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہید کے اللہ کے ہاں کچھ اعزاز ہیں:

•خون کی پہلی دھار کے ساتھ ہی اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔•اس کو جنت میں اس کے مقام کا نظارہ کروایا جاتا ہے۔•عذاب قبر سے اس کو امان دے دی جاتی ہے۔اور (قیامت کے روز) ہولِ عظیم سے اس کو بے خوف کر دیا جاتا ہے۔•اُس کے سر پر وقار کا تاج پہنایا جاتا ہے، جس میں (جڑا ہوا) ایک یاقوت دنیا ومافیہا سے گراں تر ہے۔•72 حوروں سے اس کا بیاہ کیا جاتا ہے۔•اور اپنے 70 رشتہ داروں کے حق میں اسکو شفاعت کا حق دیا جاتا ہے۔تھوڑے سے فرق کے ساتھ مسند احمد میں بھی یہی روایت آئی ہے۔

حدیث سے تو واضح ہے کہ شہید کا اللہ کے ہاں کتنا بڑا اعزاز ہے۔اس اعتبار سے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہر ایک کو اس کے درجے کے مطابق جنت میں متعدد بیویوں سے بیاہ دیا جائے گا۔اب اس میں خرابی اسی کو نظر

آئے گی جو ایک خاص قسم کے اندھا دھند مساوات والے عقیدے پر یقین رکھتا ہو۔ یعنی ایسا اعتراض اٹھانے والا یہ یقین رکھتا ہو کہ دنیا میں حتیٰ کہ جنت میں بھی سب برابر ہونے چاہیئے۔ یہاں تک کہ وہ انسان جو کہ ایک کڑے امتحان سے گذرتا ہے بلکہ اللہ کے دین کی نصرت کرتے ہوئے اپنی جان تک دے دیتا ہے اسے اور جس کو ایسے کسی امتحان سے گزرنا نہ پڑے اسے بھی اللہ کے ہاں ایک حور ملنی چاہیے۔ یا پھر اس کو لگتا ہو گا کہ اتنی ساری بیویاں ہو نگی کہ ان سب کے ساتھ وقت تقسیم کرنا پڑے گا اور باقی اوقات میں یہ بے چاری بیویاں اپنی باری کے انتظار میں پڑی بور ہوتی رہیں گی۔ یا پھر اسے لگتا ہو گا کہ جنت میں ایک بندے کو اپنی بیویوں کے ساتھ گزارنے کے لئے ''وقت کی کمی'' کا مسئلہ پیش آئے گا۔ اول تو یہ مساوات والا نظریہ کسی ذہنی مریض یا اندھے عقیدت مند کا ہی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کی غیر عادلانہ مساوات کا عقیدہ رکھنے والے کے بارے میں کم ہی یہ توقع ہے کہ وہ جنت میں جا بھی سکے گا۔ اور اگر گیا بھی تو انشاءاللہ صحیح ذہنی حالت کے ساتھ جائے گا۔ حق اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ فرق مراتب کا لحاظ رکھا جائے۔ باقی جو وقت کی کمی اور ''بور'' ہونے کا مسئلہ ہے تو وہ جنت کو دنیا پر تعبیر کرنے کی وجہ سے ہے۔ ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ جنت میں حوروں کا کام صرف اپنے شوہروں کے ساتھ شغل کرنا ہی ہے اور باقی وقت صرف بور ہونا ہی ہے۔ گویا کہ جنت کا انکار کرنے والا جنت کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

☆اگر مردوں کے لئے حور تو عورتوں کے لئے کیا؟

اس سلسلے کا ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مردوں کے حوریں ہیں تو عورتوں کے لئے کیا؟

ایک اصولی بات یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکامات مردوں اور عورتوں کے لئے ہیں سوائے ان کے جن کی تخصیص کسی خاص صنف کے ساتھ کی گئی ہو۔ اسی طرح اعمال پر اجر کے معاملے میں مرد اور عورت میں فرق نہیں ہے۔ ایسے کسی اشتباہ کو دور کرنے کے لئے کلام پاک کی کچھ آیتوں میں مردوں اور عورتوں کا علیحدہ ذکر فرمایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک آیت یہ بھی ہے۔ ''جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ہم اُسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور اُن کا حق انہیں بدلے میں دیں گے اُن کے اچھے کاموں کے عوض میں جو کرتے تھے۔ (سورہ نحل ۹۷)

اس لئے اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ عورتوں کا عمل صرف عورت ہونے کی وجہ سے ضائع نہیں ہوگا۔ قرآن پاک میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کا ایک مقصد انسان کی قوت عمل کو متحرک کرنا اور انسان کو دین کے لئے قربانی پر ابھارنا ہے۔ اب قوت عمل کو ابھارنے کے معاملے میں مردوں کی فطرت سے کونسی چیز مطابقت رکھتی ہے اور عورتوں کی فطرت سے کونسی چیز، اس کا جاننے والا اللہ ہی ہے۔ اس لئے پاکیزہ جوڑوں کے بارے میں اللہ نے مردوں کے معاملے اگر زیادہ کھل کر اظہار کر دیا اور عورتوں کے لئے اپنے پاس سرپرائز رکھ دیا تو اس میں اعتراض کرنے کی کوئی بات نہیں۔ اس بات کا امکان بہت ہی کم ہے کہ جنت میں جانے کا ارادہ کرنے والی عورتوں کی طرف سے ایسا کوئی سوال آئے کہ انہیں کتنے شوہروں سے بیاہا جائے گا۔ یہ سوال پاکیزہ عورتوں کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسا سوال یا تو مردوں کی طرف سے آتا ہے یا پھر ایسی عورتوں کی طرف سے آتا ہے جن کا جنت میں جانے کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ کسی سنجیدہ مسلمان عورت کے ذہن میں یہ سوال کبھی نہیں پیدا ہوتا ہے کہ مجھے جنت میں کتنے شوہر ملیں گے؟ حالانکہ اللہ نے صاف اعلان ہے:

اور بہشت میں تمہارے لیے ہر چیز موجود ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور تم جو وہاں مانگوگے ملے گا۔(فصلت ۳۱)

وہاں جس چیز کو دل چاہے گا اور جس سے آنکھیں خوش ہوں گی موجود ہو گی اور تم اس میں ہمیشہ رہوگے۔(الزخرف ۷۱)

اور مزید یہ کہ:

سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لیے خزانۂ غیب میں موجود ہے یہ ان کو ان کے اعمال کا صلہ ملا ہے۔(سورت السجدہ:۱۷)

تو پہلا نکتہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے عمومی احکام مردوں اور عورتوں کے یکساں ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ عمل پر ثواب کے اعتبار سے مرد اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے جنت کی تمام نعمتوں کا ذکر نہیں فرمایا اور جنتیوں کے لئے وہ کچھ نعمتیں ہیں جس کا تصور بھی کوئی انسان دنیا میں نہیں کر سکتا۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ جنت میں اللہ کے بندوں کو جو چاہے ملے گا۔

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کی تشریح کرنے میں اللہ تعالی نے انسانوں کی فطرت کا خیال رکھا ہے کہ کونسی چیز ہمیں اعمال اور قربانی پر ابھارتی ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی نفسیات میں فرق ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔

اب پھر بھی اگر کوئی مصر ہو کہ اللہ پر لازم تھا کہ وہ عورتوں کو مہیا ہونے والا جنسی پیکیج بھی بتائے تو یہ خواہ مخواہ کی ضد ہے۔اور اگر کوئی مصر ہے کہ جب تک مجھے عورتوں کی جنسی پیکیج کی تشریح نہ کی جائے گی تب تک وہ جنت میں جانے کا ارادہ ہی نہیں کریں گے تو ہم کہیں گے ایسی ہٹ دھرمی ویسے ہی جنت میں جانے کے منافی ہے۔ پھر بھلے ایسا رویہ مردوں کی طرف سے آئے یا عورتوں کی طرف سے۔

☆ کیا ایک مجاہد حوروں کے لئے اپنے آپ کو اڑا دیتا ہے؟

اب آخر میں اس پر بھی بات ہو کہ آیا ایک خود کش بمبار سچ مچ بہتر حوروں کے لالچ میں اپنے آپ کو اُڑا دیتا ہے؟

اول تو یہ واضح ہونا چاہئے کہ بہتر حوروں والی خوش خبری اللہ کے راستے میں شہید ہونے والے کے لئے ہے جو کہ نصرت دین یا اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اپنی جان دے دے۔اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ قتال میں فدائی حملہ جائز ہے یا نہیں۔اگر ہم اس کو جائز قرار دیں تو بھی یہ جائز جہاد میں ہی ہونا چاہئے جس میں نشانہ اسلامی شریعت کے اعتبار سے قتال کے لئے ایک جائز ٹارگٹ۔یہ بحث کہ کہاں کہاں قتال جائز اور کہاں نہیں اس مضمون کے دائرے میں نہیں آتی (ہم اس موضوع پر الگ سے تفصیل پیش کر چکے ہیں)۔ایک سادہ سی بات سمجھنی چاہئے کہ کسی کافر کو صرف کافر ہونے کی بنیاد پر قتل کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی کبھی اسلامی علمی تاریخ میں اسے جائز سمجھا گیا۔

دوم یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مجاہد ایک اعلیٰ مقصد کے لئے اپنی دنیوی زندگی قربان کر دیتا ہے۔وہ اعلیٰ مقصد، اللہ کی رضا، یہ امید کہ اس کی قربانی سے کمزوروں پر ظلم کم ہو گا، آنے والی نسلوں کو عدل والا

ماحول ملے گا، اللہ کا قانون نافذ ہو جائے گا، اللہ اس کے تمام گناہ معاف کرے گا، اللہ اس سے راضی ہو گا وغیرہ۔ تو یہ جہاد والی قربانی پورے شعور کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں مجاہد دنیا میں موجود راحتوں کو قربان کر کے غیب پر ایمان کی بنیاد پر آخرت کی راحت کا طالب ہوتا ہے۔ اللہ جس سے راضی ہوتا ہے اس پر اپنا انعام کرتا ہے جس میں اس کی پروانہ رضامندی اور دیدار کے ساتھ جنت بھی شامل ہے۔ اسی جنت کی نعمتوں کا ایک حصہ پاکیزہ بیویاں بھی ہیں اور ایک شہید کے لیے بہتر بیویاں ہوں گی۔

اسلام میں للہیت، اللہ کی رضا اور جنت کے حصول میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ یعنی ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم کسی عمل کو صرف اللہ کی رضا کے لئے کریں اور اللہ کے انعامات سے بے نیاز ہو جائیں۔ انسان ایک منطقی مخلوق ہے اور کسی بھی قربانی کی صورت میں یہ سوال اس کے ذہن میں ضرور اُٹھتا ہے کہ مجھے اس سے کیا ملے گا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوں جو بغیر کسی بھی دنیوی واخروی فائدے کے قربانی دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ ایسے بندے دنیا میں بہت ہی قلیل تعداد میں ہونگے اور اسلام صرف اس قلیل تعداد کے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ہے۔ اس لئے اللہ کی رضا کے ساتھ ساتھ اللہ کا انعام بھی ملتا ہے۔ اور اللہ کے انعامات سے بے نیازی برتنا اللہ کی رضا کے منافی ہے۔ یہ سوال کہ مجھے کیا ملے گا ایک عین منطقی اور فطری سوال ہے اور اسلام اس سوال کو غیر فطری اخلاقیات کی بنیاد پر خود غرضی قرار نہیں دیتا۔ بلکہ یہ اسلام کا کمال ہے کہ انسان کے اندر فطری طور پر پائے جانے والے حرص کے جذبے کو ایک اعلیٰ مقصد کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ اسلام کا یہی کمال ہے جس کی وجہ سے مغربی استعمار سینکڑوں گُنا مادی قوت اور آتش و آہن برسانے کی صلاحیت کے باوجود اپنا خون چاٹنے پر مجبور ہوتا رہا ہے۔

الغرض معرکہ حق و باطل کے اس پورے مقدمے کو صرف ایک جملے میں اس طرح سے دہرانا کہ "یہ لوگ خودکش حملے اس لئے کرتے ہیں کیوں کہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر کافروں کو بم سے اڑادیں انہیں جنت میں ۷۲ کنواریاں ملیں گی" جھوٹ اور مریضانہ ذہن کی نشاندہی کرتا ہے اور بس۔

تحریر از ذیشان وڑائچ

حضرت ابراھیمؑ پر فلسفی کانٹ کے اعتراض کا جائزہ

ایک صاحب نے مشہور فلسفی کانٹ کے حضرت ابراھیم علیہ السلام پر اعتراض کے حوالے سے پوسٹ لگائی ہے کہ کانٹ کے مطابق حضرت ابراھیم نے بیٹے کو قربان کرتے وقت خدا کی طرف اپنی اخلاقی ذمہ داری تو نبھائی مگر انسان کی طرف اپنی اخلاقی ذمہ داری نبھانے میں ان سے چوک ھوگئی، یعنی وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے. صاحب پوسٹ کے خیال میں یہ نہایت عقلی اور باوزن اعتراض ھے.

صاحب پوسٹ تو خیر فلسفی ھیں لہذا انکا ایسی باتیں کرنا سمجھ آتا ھے مگر حیرت تو ان مذھب پسند اذھان پر ھے جو کانٹ کے اس اعتراض کا جواب دیتے ھوئے یہ کہتے دکھائی دیئے کہ اللہ نے بیٹا ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ ابراھیم علیہ السلام خواب کو خود ہی حقیقت بنانے کا ارادہ کر کے لغزش کے مرتکب ھوئے. لاحول ولا قوہ. یہ احباب کانٹ کے اخلاقی فلسفے کے مفروضات پر سوال اٹھانے کے بجائے اس کے فریم ورک میں کھڑے ہو کر جواب دینا شروع ہو جاتے ہیں. خیر اس پوسٹ میں ان حضرات کے خیالات کو مخاطب کرنا مقصود نہیں یہاں صرف کانٹ کے اعتراض کا جائزہ مقصود ھے. کانٹ کے اعتراض کا داخلی و خارجی جہات سے جائزہ لینا ممکن ھے مگر یہاں صرف اصولی و خارجی جائزہ لیا جائے گا۔

کانٹ کا مسئلہ یہ ھے کہ وہ ھیومنسٹ ھے اور انسان کی اٹانومی کو سب چیزوں سے مقدم سمجھتا ھے. کسی عمل کی قدر متعین کرنے کا کانٹ کا مجوزہ آفاقی قضیے کا اصول انسان کی اٹانومی کو مفروضے کے طور پر قبول کرتا ھے. چنانچہ یہاں بھی وہ یہی کرتا ھے کہ فرد کو مرکز میں رکھ کر پھر ترازو کے دو پلڑوں میں خدا اور دیگر

انسانوں کو بٹھا کر جب وہ توازن تلاش کرنے کی کوشش میں ناکام ھو جاتا ھے تو جھٹ سے نبی کے عمل پر سوال اٹھا دیتا ھے۔ مگر بنیادی سوال یہ ھے کہ ھم کانٹ کے انسان کے بارے میں اس مفروضے کو کیونکر مان لیں نیز یہ کیوں درست سمجھا جائے کہ اخلاقی عمل وہی ھے جو انسانی خواھشات کو آفاقی بنانے والے اسکے آفاقی قضئے کے اصول پر پورا اترے؟

بات بالکل صاف ھے کہ مذھب کے اخلاقی نکتہ نگاہ سے انسان کی دوسرے انسان کی طرف خدا کے حکم کے ماسواء کوئی کمٹمنٹ و ذمہ داری سرے سے ھے ہی نہیں۔ ایسے میں یہ فرض کرنا کہ انسان کی طرف اسکی کوئی ایسی ذمہ داری بھی ھے جو خدا کے قطعی حکم کے مقابلے میں آ کھڑی ھو سکتی ھے ایک لغو خیال ھے۔ کانٹ کا خدا محض فلسفیانہ خدا ھے جو انسان کی اٹانومی کے خلاف اسے حکم دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس کے یہاں قدر کا تعین خود مختار نفس کی خواھشات سے ہوتا ہے جسے وہ نادانی میں عقل سمجھتا رہا۔ کانٹ یہ سب اپنے فریم ورک میں فرض کر رھا ھے مگر ھمیں یہ فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ کانٹ کے انسان کے بارے میں مفروضے کو رد کر دیجئے یہ اعتراض خود بخود لغو دکھائی دے گا۔

بھلا کانٹ کو کیا خبر کہ عدل اور خیر و شر کیا ھے کہ وہ منصف بن کر نبی کے عمل پر معترض ھو؟ اسے چاھئے کہ انسان کی اٹانومی کی پوجا سے توبہ کر کے پہلے اپنے اصل مقام "مقام بندگی" پر آئے پھر ابوالانبیاء کے اسوہ حسنہ کو سمجھنے اور اس سے سبق سیکھنے کی پوزیشن میں آئے گا۔

اگر اسکے جواب میں کہا جائے کہ یہ تو اخلاقیات کے بارے میں آپ کے نکتہ نگاہ سے جواب ھے تو ان سے کہئے کہ کانٹ بھی تو یہی کر رھا ھے کہ اپنے نکتہ نگاہ سے سوال اٹھا رھا ھے، وہ کونسا کسی آفاقی، مجرد و

معروضی عقلیت پر قائم ہو کر معترض ھے کہ اسکی پوزیشن فرض کرنا لازم ہے. خدارا فلسفیوں کے لغو اعتراضات کا جواب دینے کے لئے انبیاء کے فہم پر منصف بن کر نہ بیٹھ جایا کریں. یہاں منصفی صرف خدا کو زیب دیتی ہے

کانٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالی کے حکم پر عمل کر رہے تھے تو ضرور ہے کہ انہوں نے خدا کے پیغام کو سمجھنے میں غلطی کی۔ایسا خدا جو انسانوں کی عبادت کا مستحق ہو وہ انسان کو کبھی دو متضاد حکم نہیں دے سکتا کہ ایک طرف تو اخلاقی اصولوں کی پاسداری اور دوسری طرف اس کی خلاف ورزی۔..اسکا جواب یہ ہے کہ ایک آزمائش کے طور پر ایسا ممکن ہے۔ایک پیغمبر یہ جانتے ہوے کہ واقعی انسان اور کائنات کا ایک خدا ہے اور وہ اسی خدا کے پیغمبر ہیں اور اسے اسی کی جانب سے ایک آزمائش آئی ہے' ایسا سمجھ سکتا ہے۔بعد کی تفصیلات بھی یہی بتاتی ہیں کہ یہ ایک آزمائش تھی اور بیٹے کو ذبح نہیں ہونے دیا گیا اس لیے کانٹ کا یہ اعتراض غلط ہے۔

ڈاکٹر شہباز منج پروفیسر سرگودھا یونیورسٹی اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

،،مستشرقین اور مغربی اہل فکر کے وحی سے متعلق مباحث کا ایک پہلو انبیا کی صحتِ تحصیل وابلاغِ وحی سے متعلق اعتراضات اور شکوک وشبہات بھی ہے۔وحی پر استشراقی ومغربی خیالات کے ذیل میں کانٹ کے حضرت ابراہیم کے خواب میں ذبح اسماعیل سے متعلق واقعہ کو ابراہیم علیہ اسلام کی غلطیِ تعبیر پر محمول کرنے سے متعلق خیالات کا ذکر گزر چکا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انبیا کا وحی کو وصول کرنے اور لوگوں تک پہنچانے کے سلسلہ میں کسی قسم کی غلطیٔ تعبیر یا آمیزش شیطانی سے دوچار ہونا ایک نہایت ہی مغالطہ

آمیز مفروضہ ہے، جسے مخالفین وحی کی غلط اندیشی اور مستشرقین کی اسلام دشمنی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔اس طرح کے خیالات یا تو بدطینتی و تعصب یا پھر قدرت خداوندیِ و حقیقتِ نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر تک خدا کی وحی نہایت حفاظت و صیانت کے ساتھ پہنچائی جاتی ہے۔ پیغمبر معصوم عن الخطا ہوتا ہے اور اس کو خدا کی طرف سے عطا ہونے والی اس عصمت کا تقاضا ہے کہ وہ وحی الٰہی کو، اگر لفظی ہو تو لفظی اور معنوی ہو تو معنوی ہر اعتبار سے صحیح صحیح الفاظ و معانی کے ساتھ بغیر کسی خطا اور غلطی تعبیر کے لوگوں تک پہنچا دے۔ خدا تعالیٰ نے اس بات کا خصوصی انتظام کر رکھا ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے ملنے والی وحی کو وصول کرنے کے سلسلہ میں کسی بھی طرح کے ابہام اور خلط معانی سے دوچار نہ ہو۔انبیاء کو خدا کی طرف سے ملنے والی ہدایت کی خصوصی حفاظت سے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا۔ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّہِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْہِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۔(42)

حضرت ابراہیم کے خواب سے متعلق ہرزہ سرائی کرنے والے اگر اس واقعہ سے متعلق قرآنی بیانات پر نگاہ ڈالیں تو ان پر حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حالت بیداری میں نازل ہونے والی وحی تو ایک طرف خواب میں ملنے والی وحی سے متعلق بھی نہ صرف یہ کہ پیغمبروں کچھ شک نہ ہوتا تھا بلکہ ان کے سعادت مند بیٹے بھی اس کو بغیر کسی الہام کے وحی خداوندی سمجھتے تھے۔ قرآن کیمطابق جب اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچتے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ سے کہتے ہیں: یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (43) اب اس میں غور طلب امر ہے کہ حضرت ابراہیم کے الفاظ میں کہیں وحی خداوندی کا ذکر ہے اور نہ ذبح اسماعیل سے متعلق کسی حکم

خداوندی کا۔ آپ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ سعادت مند بیٹا جھٹ سمجھ جاتا ہے کہ خواب وحی الٰہی ہے،اور کہتا ہے کہ آپ کو جو حکم ہوا اس میں دیر کیسی ؟تو جس نبی کا نہایت کم سن بیٹا اس درجہ صاحب بصیرت ہو،اسے وحی الٰہی کو سمجھنے میں کیسے غلطی لگ سکتی ہے۔(پاکستان جرنل آف اسلامک ریسرچ،بہاوالدین زکریا یونی ورسٹی،ملتان)

ایمانوعیل کا خدا مذہبی خدا کی طرح فعال نہیں ہے۔ یہ انسانی عقل کا تخلیق کردہ وہ تصور ہے جس تک خود عقل نہیں پہنچ سکتی۔ خدا کے وجود کی تصدیق داخلی مشاہدے (وجدان) سے ہوتی ہے اور عقل داخلی مشاہدے کے تصور کی فقط تصدیق کرتی ہے۔ ہم بآسانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ کانٹ کا خدا انسان کی تخلیق ہے جس کے پاس انسان نے کوئی اختیار نہیں چھوڑا۔ کانٹ کے تین تصورات ہیں جو ناگزیر ہیں اور تینوں کی تصدیق داخلی مشاہدے یا وجدان سے ہوتی ہے۔۔۔ خدا روح کی لافانیت ارادے کی آزادی ان میں سے سب سے اہم ارادے کی آزادی ہے جس کے بغیر اخلاقیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا جب حکم جاری کرتا ہے تو ارادے کی آزادی سلب ہوتی ہے جو کانٹ کو کسی صورت بھی قبول نہیں ہے۔ کانٹ جب یہ کہتا ہے حضرت ابراہیم کو قربانی سے پہلے خدا سے سوال کرنا چاہیے تھا تو اس وقت وہ اپنے تصور آزادی کا دفاع کر رہا ہوتا ہے۔ چونکہ ابراہیم نے سوال نہیں کیا، جو کہ مطلق آزادی کی نفی تھی، اس لیے قربانی کانٹ کے نزدیک ایک ''غیر اخلاقی'' قدم تھا۔

استفادہ تحریر ڈاکٹر زاہد مغل،ڈاکٹر شہباز منج،عامر مغل

مسئلہ قربانی اور غلام احمد پرویز صاحب کے اعتراضات -ایک جائزہ

دورِ نزول قرآن سے لے کر اب تک عیدالاضحیٰ پر جانوروں کی قربانی، اُمت مسلمہ میں ایک مجمع علیہ اور متفق علیہ عبادت کی حیثیت سے تواتر کے ساتھ قائم رہی ہے۔ معتزلہ، جو ابتدائی زمانہ میں حدیث اور سنت نبوی سے گریزاں رہے ہیں، بھی قربانی کا انکار نہ کر پائے۔ لیکن ہمارے زمانے میں غلام احمد پرویز نے عیدالاضحیٰ کے مواقع پر کی جانے والی قربانی کی شدید مخالفت کی اور اسے خلاف قرآن عمل قرار دیا ہے، البتہ حج کے موقع پر وہ قربانی کے قائل تھے۔ اپنی تفسیر مطالب الفرقان میں وہ لکھتے ہیں کہ :

"عیدالاضحےٰ کی تقریب پر جس طرح قربانیاں دی جاتی ہیں۔ ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ مروجہ مذہب میں ان قربانیوں کی سند میں کچھ روایات پیش کی جاتی ہیں۔ چونکہ میرے پیش نظر صرف قرآن مجید کی تشریح و تفسیر ہے اس لیے ان روایات کے متعلق بحث کرنا میرے مقصد سے خارج ہے۔ ویسے بھی روایات کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔" (تفسیر مطالب الفرقان، ج3ص247)

علماءاُمت، حج کے علاوہ، دیگر مقامات پر (عیدالاضحیٰ) کی قربانیوں کا ثبوت درج ذیل آیت سے فراہم کرتے ہیں:

قُلۡ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ۔ ترجمہ: "(اے پیغمبرؐ) آپ فرمادیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔" ﴿سورۃ الانعام، ١٦٢﴾...

پرویز صاحب، اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں:

''اس آیت میں لفظ نسک کے معنی قربانی کئے جاتے ہیں۔ لغت میں اس مادہ (ن۔ س۔ ک) کے معنی پاک اور صاف کرنا ہیں۔ نسک الثوب۔ اس نے کپڑے کو دھو کر پاک اور صاف کیا۔ ارض ناسکۃ سر سبز و شاداب زمین، جس پر حال ہی میں بارش ہوئی۔ ان بنیادی معانی کی رو سے، اس کا مفہوم کسی معاملے کو درست اور ٹھیک کر لینا ہوتا ہے نسک السبخۃ کے معنی ہیں۔ اس نے زمین شور کو درست کیا، اسے جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کیا۔ نسک الیٰ طریقۃ جمیلۃ اس نے اچھا طریقہ اختیار کیا اور پھر اس پر مداومت کی۔ راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں نسک ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس پر عام طور پر آمد و رفت جاری ہو۔ یہیں سے اس کے معنی روشن اور رسم کے ہو گئے اور امور و مراسم حج کو بھی مناسک حج کہتے ہیں۔'' (تفسیر مطالب الفرقان، ج3 ص348)

لفظ نسک کی تحقیق

پرویز صاحب نے لغات کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس بات کی پوری کوشش فرمائی ہے کہ ''نسک'' بمعنی ''ذبیحہ'' ''قربانی'' اور ''راہ خدا میں بہائے جانے والے خون'' کے معانی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیں اور ان معانی کے علاوہ باقی دیگر معانی کو بیان کر کے یہ تاثر اچھال دیا جائے کہ کتب لغت میں ''نسک'' بمعنی ''قربانی'' موجود ہی نہیں ہے۔ یہ ہے وہ مطلب جو یانہ ذہنیت، جسے اگر قربانی کے حق میں پہاڑ کے سے دلائل بھی مل جائیں، تو اس سے نظری چرا لی جائیں۔ لیکن اگر قربانی کے علاوہ دیگر معانی مل جائیں تو ان پر

عبارت آرائی اور سخن سازی کرتے ہوئے یہ تاثر دیا جائے کہ ان کے علاوہ لغت میں کوئی اور مفہوم پایا ہی نہیں جاتا۔

قرآنی تحقیق کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں تو ان میں اپنے مزعومہ مطلب کے خلاف معانی کو نظر انداز کر دیا جائے اور مفید مطلب معانی کو بیان کر کے یہ تاثر ابھارا جائے کہ عربی لغات، ہمارے بیان کردہ معانی کے علاوہ دیگر معانی سے خالی ہیں۔ بلکہ قرآنی تحقیق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جملہ لغوی معانی کو دیکھتے ہوئے، جو مفہوم و مراد قرآن کے کسی مقام پر فٹ بیٹھتا ہے، اسے دلائل کے ساتھ دیگر مفاہیم پر ترجیح دی جائے گی۔ لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب نے ''نسک'' کی لغوی تحقیق کے دوران ''نسک'' بمعنی ''قربانی وذبیحہ'' کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ کوئی عربی لغت اس معنی سے خالی نہیں ہے۔ چند لغات کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

1۔ مشہور عربی لغت لسان العرب میں ہے ''النسک اور النسیکۃ'' ذبیحہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''نسک'' خون کو کہتے ہیں۔ مثلاً آپ کہتے ہیں کہ ''جس نے یہ کام کیا اس پر ''نسک'' لازم ہے'' یعنی مکہ میں خون بہانا لازم ہے اور اس ذبیحہ کا نام ''نسیکۃ'' ہے، اس کی جمع ''نسک'' بھی ہے اور ''نسائک'' بھی۔ آگے چل کر یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

''ابواسحاق نے کہا کہ آیت کو یوں بھی پڑھا گیا: ''لکل أمۃ جعلنا منسکا و منسکا'' (یعنی منسک میں سین کی زبر اور زیر کے ساتھ) اُس نے کہا کہ ''نسک'' یہاں ''نحر'' (قربانی کرنا) کے معنی میں ہے۔ گویا یوں کہا کہ ''ہم نے ہر اُمت کے لیے طے کر دیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے ذبیحوں کو ذبح کرے۔'' پس جس نے ''منسک''

(سین کے کسرہ کے ساتھ) کہا تو معنی یہ ہوا کہ قربانی کی جگہ جیسے مجلس، ''جلوس (بیٹھنے) کی جگہ ''اور جس نے ''منسک ''(سین پر فتحہ کے ساتھ) کہا تو اس کا معنی مصدر کا معنی ہوا (یعنی قربانی کرنا) جیسے ''نسک ''اور ''نسوک ''اور ''منسک ''اور ''منسک ''(سین کی زبر اور زیر دونوں کے ساتھ) اس مقام کو بھی کہتے ہیں کہ جس میں قربانی ذبح کی جائے۔ یعنی اللہ کا یہ فرمان یوں پڑھا گیا کہ ''جعلنا منسکا ھم ناسکوہ ''............ اور ''منسک ''اور ''منسک ''(سین کی زبر اور زیر دونوں کے ساتھ) ''مذبح ''(ذبح کرنے کی جگہ) کو کہتے ہیں۔ ''قد نسک ینسک نسکا'' کا معنی یہ ہے کہ ''اس نے ذبح کیا'۔ (لسان العربی، ج10 ص498-499)

2۔ ''''نسک ''نون، سین اور کاف اس کے حروف اصلیہ ہیں۔ یہ عبادت اور تقرب الی اللہ پر دلالت کرتا ہے۔ (اسی سے ہے:) ''رجل ناسک ''(عبادت گزار مرد) اور وہ ذبیحہ جو ''تقربا الی اللہ ''ذبح کیا جائے۔ ''نسیکۃ'' (کہلاتا ہے) اور ''منسک ''وہ جگہ ہے جس میں ''نسائک ''(قربانیاں) ذبح کی جائیں۔ اور یہ سب کچھ قربانی ہی میں ہوتا ہے۔'' (معجم مقاییس اللغۃ)

3۔ ''''النسک ''(ایک ضمہ کے ساتھ) اور ''النسک ''(دو ضموں کے ساتھ) ذبیحہ کو کہتے ہیں اور ''نسک '' خون کو اور ''نسیکۃ'' ذبح کیے جانے والے جانور کو کہا جاتا ہے۔'' (القاموس المحیط: ص332)

4۔ ''نسک (ینسک کے مصادر ہیں) نسکا، نسکا، نسکا، نسوکا، نسکۃ اور منسکا (ہیں)......... ''نسک للہ ''۔ ''اس نے اللہ کے قرب کی رغبت کی اور اس کی رضا کے لیے جانور ذبح کیا''........ ''النسک ''۔ ''جو کچھ عبادت او رزہد اختیار کرتے ہوئے اللہ کے حضور پیش کیا گیا''۔ ''قربان کیا جانے والا جانور۔ ''''النسیکۃ'''' ذبیحہ ''(

کو کہتے ہیں) ''المنسک'' اس کی جمع ''مناسک'' ہے۔ (یعنی) ''مانوس جگہ'' ''المنسک'' اس کی جمع ''مناسک'' ہے۔(یعنی)''رسم قربانی''''وہ جگہ جہاں قربانیاں ذبح کی جائیں۔''(المنجد ص806)

5۔امام راغب اصفہانی رقم طراز ہیں:''النسیکۃ مختصۃ بالذبیحۃ: قال مفدیۃ من صیام أو صدقۃ أو نسک'' ترجمہ:''النسیکۃ''''ذبیحہ'' کے لیے خاص ہے(اور دلیل اس کی یہ قرآنی آیت ہے)فرمایا:''پھر فدیہ ہے روزوں میں سے یا صدقہ میں سے یا قربانیوں میں سے۔(المفردات امام راغب)

6۔صرف یہی نہیں بلکہ عام عربی اُردو لغات بھی ''نسک، بمعنی ''قربانی'' کی وضاحت سے خالی نہیں ہیں:

''نسک للہ: نفلی عبادت کرنا، خدا کے نام پر ذبح کرنا۔النسک والنسک: نذر جو اللہ کے لیے پیش کی جائے، ذبیحہ۔النسیکۃ: ذبیحہ، سونے چاندی وغیرہ کا ٹکڑا۔المنسک: قربانی کی رسم، قربانی کی جگہ، قربانی۔'(مصباح اللغات ص872)

''نسک'' بمعنی ''قربانی'' کے ان اقتباسات کو دیکھئے اور پھر داد دیجئے ''مفکر قرآن'' صاحب کو، جنہوں نے تفسیر مطالب الفرقان (جلد سوم) میں اس لفظ کی لغوی تحقیق پیش کرتے ہوئے کس قدر شدید التزام برتا ہے کہ ''قربانی'' کے معنوں میں یہ لفظ ان کی عبادت میں نہ آنے پائے۔ حالانکہ اس معنی و مفہوم سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کتاب لغت بھی خالی نہیں۔ لفظ ''نسک'' کے لغوی مفہوم سے ''قربانی'' اور ذبیحہ'' کو نکال باہر کرنے کے لیے ''مفکر قرآن'' صاحب نے جو پاپڑ بیلے ہیں اسے بھی ایک نظر ملاحظہ فرمالیجئے لکھتے ہیں:

''قرآن کریم میں احکام حج کے ضمن میں آیا ہے فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَ۔ سِكَكُمْ (2،200)جب تم حج کے واجبات سے فارغ ہو چکو......اس سے ذرا پہلے ہے۔فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (2،196)ابن قتیبہ نے کہا

ہے کہ یہاں نسک سے مراد ذبیحے کے لکھے ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے معنی ذبیحہ کے کیوں مختص کر لیے جائیں اس سے مراد کوئی عمل خیر ہو سکتا ہے، جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔" (لغات القرآن ص1615)

حالانکہ ،جس عمل کو کوئی شخص خود اپنے اوپر واجب قرار دے لے، لغت میں اسے "نسک" نہیں بلکہ "نذر" کہتے ہیں۔ "نذر" کا مفہوم خود انہوں نے بھی یوں بیان کیا: "نذر۔ (نقصان سے بچنے کے لیے) جو کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا جائے، نیز کسی شرط پر کوئی وعدہ کرنا بھی نذر کے معنوں میں داخل ہے۔ (لغات القرآن ص1598)

پھر زیر بحث آیت (البقرہ:196) میں، جس فدیہ کا ذکر ہے،اسے انسان نے اپنے اوپر خود واجب نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب کیا ہے۔اس لیے "نسک" کے معنی کوئی سا عمل خیر" کو ڈالنے کے بعد بھی (جو لغۃً عرفاً، شرعاً ہر لحاظ سے غلط ہے) پرویز صاحب کی بات بنتی نظر نہیں آتی۔

رہا پرویز صاحب کا یہ فرمان کہ "نسک" کے معنی کو کیوں ذبیحہ کے لیے مخصوص کر لیا جائے اور کیوں نہ اس سے مراد "کوئی سا عمل خیر" لیا جائے۔ تو یہ بوجوہ غلط ہے:

اوّلاً.......... اس لیے کہ قرآن یہاں فدیہ کے طور پر "نسک" کے ساتھ دو مخصوص اعمال...... صیام اور صدقہ......... کا ذکر کر رہا ہے۔ مطلق اعمال خیر میں سے صیام اور صدقہ کو خاص کر لینے کے بعد "نسک" کو اگر "کوئی سے عمل خیر" کے معنوں میں لیا جائے، تو یہ پہلے دونوں اعمال کی خصوصیت کو باطل کر دینے

کے مترادف ہوگا۔ اب اگر ''صیام'' سے مراد ''مطلق کار خیر'' اور ''صدقہ'' سے مراد ''مطلق نیک عمل'' نہیں ہے تو ''نسک'' سے بھی ہرگز ''کوئی سا عمل خیر'' مراد نہیں لیا جاسکتا۔

ثانیاً......اسی لیے کہ ''صیام'' یہاں ''صام، یصوم'' کا مصدر نہیں ہے، بلکہ ''صوم'' کی جمع ہے۔ بالکل اسی طرح ''نسک'' یہاں مصدر نہیں ہے بلکہ ''نسیکۃ'' کی جمع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب نے بھی اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ'' (2،196) اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحے ہوں گے۔'' (لغات القرآن ص 1615)

اور اب جبکہ یہ بات طے ہوگئی کہ ''نسک'' جمع ہے، تو اس کی واحد ''نسیکۃ'' کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی اور ''نسیکۃ'' کے متعلق علماء لغت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ خاص طور پر ''ذبیحہ'' یا ''خون'' ہی کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا عبادت کے دیگر طور طریقے اس کے مفہوم سے خارج ہیں۔ خود پرویز صاحب کی تحقیق بھی یہی ہے: ''راستہ اختیار کرلینے کی جہت سے کلام عرب میں منسک ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس کی طرف آنے جانے کے لوگ عادی ہوں خواہ یہ خیر میں ہو یا شر میں، اس کے بعد امور و مراسم حج کو مناسک کہنے لگے اور نسک اور نسیکۃ ذبیحہ کو یا خون کو۔ (لغات القرآن ص 1614)

اب جبکہ لغوی تحقیق سے یہ واضح ہوچکا ہے کہ ''نسک'' کا معنی ''قربانی'' ہے، تو سورۃ الانعام کی اس آیت کا ترجمہ قطعی واضح ہوجاتا ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾...سورۃ الانعام ''آپ فرما دیجئے، میری نماز اور میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔''

پرویز صاحب، ''قربانی'' کی شدید مخالفت میں مبتلا ہو کر لفظ ''نسک'' سے اس معنی کو خارج کرنے پر تل گئے اور اس آیت کا مفہوم یہ بیان کیا کہ:

''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میرے فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے مختصراً یہ کہ میری ساری زندگی حتیٰ کہ میری موت بھی خدا کے تجویز کردہ پروگرام کے لیے وقف ہے۔'' (تفسیر مطالب الفرقان ج3 ص248)

یہ بات قارئین کرام کے لیے سخت موجب حیرت ہوگی کہ آیت کے جس ترجمے کی مخالفت میں پرویز صاحب بعد میں اس قدر سرگرم ہوئے، اس سے پہلے وہی ترجمہ وہ خود بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ یہی آیت درج کر کے یوں رقم طراز ہیں:

)''اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو، میری نماز، میری قربانیاں، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ ہی کے لیے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔'' (معارف القرآن ج2 ص430)

لفظ ''نسک'' سے ''قربانی'' کا مفہوم خارج کرڈالنے کے جنون میں سورۃ الحج کی اس آیت، جس میں ''منسکا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے' کا بعد میں ترجمہ یہ کیا:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا ٱسْمَ ٱللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَـٰمِ... ترجمہ: ''ہم نے ہر قوم کے لیے یہ طریق مقرر کر دیا تھا کہ وہ جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا کریں۔ (﴿٣٤﴾... سورۃ الحج)

حالانکہ پہلے وہ اسی آیت کا ترجمہ یوں لکھا کرتے تھے: ''ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی (یا طریق عبادت و قربانی) کا ایک طور طریقہ ٹھہرایا تاکہ وہ ان چوپایوں پر، اللہ کا نام لے کر ذبح کریں، جو اس نے ان کو عطا فرمایئے ہیں۔'' (معارف القرآن ج1 ص16)

الغرض سورۃ الانعام کی آیت 163 کا وہ ترجمہ شک و شبہ سے بالاتر ہے جو نہ صرف علماء امت ہمیشہ سے بیان کرتے چلے آرہے ہیں، بلکہ خود پرویز صاحب نے بھی اس کا یہی ترجمہ پیش کیا۔

سورۃ الکوثر کی آیت:

قربانی کا ثبوت سورہ کوثر کی دوسری آیت سے بھی ملتا ہے۔ پرویز صاحب اس کی تردید میں فرماتے ہیں: ''مروجہ قربانی کی تائید میں سورۃ الکوثر کی آیت............ فصل لربک وانحر۔ بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ''نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر''........... ''قربانی کر'' ترجمہ کیا جاتا ہے وانحر کا۔ ''لغت کی رُو سے نحر سینے کے اوپر کے حصے کو کہا جاتا ہے۔ صاحب تاج العروس نے مختلف تفاسیر کی سند سے وانحر کو کہا کے متعدد معانی لکھے ہیں۔ مثلاً (1 نماز میں کھڑے ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا (2) نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا (3) نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا (4) نماز میں نحر تک ہاتھ اٹھانا (5) اپنے سینے کو قبلہ رُخ کر کے کھڑے ہونا (6) خواہشات کا قلع قمع کرنا۔ اونٹ کے ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے کھڑے اس کے نحر (سینے کے اُوپر کے حصے) کے قریب، حلق کی رگ پر نیزہ مارتے ہیں، اس سے نحر البعیر کے معنی آتے ہیں، اس نے اونٹ کو اس طرح ذبح کیا، لیکن لغت میں النحر اور النحریر کے معنی ہیں، ماہر، عقلمند، تجربہ کار، ہر بات کو سمجھ کر اختیار کرنے والا اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والا، چنانچہ

کہتے ہیں نحرت الشئ علما۔ میں علم کی رُو سے اس معاملہ پر حاوی ہو گیا۔" (تفسیر مطالب الفرقان ج 3 ص248)

چنانچہ اپنی کتاب لغات القرآن میں یہ معانی بیان کرنے کے بعد، آیت کا معنی و مفہوم یوں بیان کیا: "اس لیے وانحر (2،108) کے معنی ہوں گے، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری پوری طرح حاوی ہو کر ان پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا رہو۔" (لغات القرآن ص1592)

پرویز صاحب شاید یہ سمجھتے تھے کہ کسی قرآنی لفظ کے عربی لغت میں سے دس پندرہ معانی سے لاٹری کے ذریعے ایک معنی کو چنتے ہوئے، اسے اپنے خود ساختہ جملوں میں استعمال کر ڈالنے سے قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ حالانکہ "وانحر" کا معنی "علمی طور پر کسی معاملے پر حاوی ہو جانا" صرف اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ اس کا کوئی قرینہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ "نحر الامور علما" تو لفظ "علما" کا قرینہ اس معنی کا مؤید ہو گا کہ "اُس نے معاملات کو مضبوط طریقے سے کیا" جو مثال پرویز صاحب نے دی ہے اس میں فی الواقعہ ایسا قرینہ موجود ہے جو یہ معنی مراد لینے کے حق میں ہے۔ لیکن سورۃ الکوثر میں سرے سے ایسا قرینہ موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں یہ معانی کسی طرح بھی مراد نہیں لیے جا سکتے "نحر" کو مطلق رکھتے ہوئے اگر "نحر فُلان" کہا جائے تو ہر عرب اس سے یہی سمجھے گا کہ "فلاں نے (اونٹ کی) قربانی کی ہے۔" نہ یہ کہ وہ عقل و تجربہ اور بصیرت و مشاہدہ سے کسی معاملے میں حاوی ہو گیا ہے۔ بہرحال پرویز صاحب "مروجہ ترجمہ" کے بعد اپنا خود ساختہ "ماڈرن ترجمہ" پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

”یہ ہے ہماری بصیرت کی رُو سے اس سورہ میں وانحر کا مفہوم اس سے مروجہ قربانی کی سند لینا بعید از کار سی بات ہے۔“(مطالب الفرقان ج3 ص249)

لیکن ہم کہتے ہیں کہ پرویز صاحب، جنہوں نے قربانی کی مخالفت کے جوش میں (بعد میں) ”وانحر“ کے اس ترجمہ کو ”بعد از کار“ قرار دیا، اس سے قبل وہ خود بھی اس کا یہی ”بعد از کار“ ترجمہ کرتے رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو: ”فصل لربک وانحر (108:2) ”لہٰذا اپنے رب کے لیے نماز قائم کرو اور قربانی کرو۔“ (معارف القرآن ج4 ص369)

☆قربانی اور پرویز صاحب کی شروط ثلاثہ:

قربانی کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں: ”اگر وانحر سے مراد بالضرور ”قربانی“ لینا ہے تو قرآن کریم کی رُو سے ان شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہوگا۔“ (مطالب الفرقان ج3 ص249)

اس کے بعد پرویز صاحب نے تین شرطیں بیان کی ہیں۔ ہم ان میں سے ہر شرط کا جائزہ لے رہے ہیں۔

☆پہلی شرط: پرویز صاحب کی پہلی شرط ان الفاظ میں مذکور ہے۔ ”ایک تو یہ کہ نحر صرف اونٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، کسی اور جانور کے ذبح کرنے کو نہیں اس لیے قربانی صرف اونٹوں کی دی جائے گی۔“ (ایضاً)

جائزہ:

یہ درست ہے کہ ”نحر“ صرف اونٹ ذبح کرنے کو کہتے ہیں، لیکن ذبح اونٹ کا بطور خاص حکم دینے سے دوسرے جانور کو ذبح کرنے کی نفی کیسے ہوگئی؟ اگر آپ کسی مہمان سے یہ فرمائیں کہ ”دودھ نوش

فرمایئے"تو کیا اس پر دودھ کی تخصیص سے پانی اور چائے وغیرہ پینے کی نفی لازم آئے گی؟اب اگر "نحر" میں اونٹ کی قربانی، دیگر جانوروں کی قربانیوں کے لیے عدم جواز کی دلیل ٹھہرتی ہے تو اسی بناء پر قرآن میں ممانعت خمر کے حکم کو، دیگر اشیاء کی عدم ممانعت کی دلیل ہونا چاہیے۔ لیکن خود پرویز صاحب، ممانعت خمر اور حرمت شراب کے حکم میں وہ اشیاء بھی داخل کرتے ہیں جس پر سرے سے "پینے کے فعل"کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ حریت خمر کے حکم میں یہ مضحکہ خیز تشریحات بھی ملاحظہ فرمایئے: "خمر وہ ہے جس سے انسان کی عقل و فکر، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مسلوب یا مضمحل ہو جائے، آپ سوچئے کہ اس میں کیا کیا باتیں نہیں آجاتیں؟سب سے پہلے تو"مذہب" ہے جس میں سوچنے سمجھنے کو گناہ اور ابلیس کی روش قرار دیا جاتا ہے۔"(مطالب الفرقان ج3ص 321)

لیکن کسی نے "مفکر قرآن" سے یہ استفسار نہ کیا کہ "جناب! جب نحر کی قربانی میں اونٹ کے سوا کوئی اور قربانی شامل نہیں ہے، تو ممانعت شراب میں "مذہب پینے" کی ممانعت کیسے داخل ہو گئ؟"اور جس طرح آپ شراب پینے کی حرمت کے حکم میں "مذہب پینے" کی حرمت کو داخل کرتے ہیں اُسی طرح اگر کوئی شخص، اونٹ کی قربانی کو"نحر" کی بناء پر اور دیگر جانوروں کی قربانی کو "نسک" کی بناء پر اختیار کرتا ہے تو وہ مورد الزام کیوں ہو۔؟

مصلحت ذبح اونٹ:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ بحث کی روشنی میں اگر "نسک" سے مراد مطلق قربانی ہے، تو آخر سورہ کوثر میں خاص طور پر "نحر" کے لفظ سے "اونٹ" کی قربانی کا ذکر کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب ہم اپنی

طرف سے دینے کی بجائے خود پرویز صاحب ہی کی ایک تحریر سے پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں: ''ہجرت کے بعد، جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار او رمہاجرین دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہود کا بڑا زور تھا۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈتی ہیں اور اس کے لیے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمان کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابل اعتراض سمجھتے تھے۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بناء پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے، قرآن کریم نے عین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں ''اونٹ ذبح کرو''، یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو۔'' (لغات القرآن ص 1592)

یہ تھی وہ مصلحت، جس کے پیش نظر، قرآن نے ''نحر'' کا لفظ بول کر خاص طور پر ''اونٹ کی قربانی'' کا حکم دیا ہے، ورنہ ''نسک'' کے لفظ میں دیگر جانوروں کی قربانی کا حکم پہلے ہی شامل ہے۔

☆ دوسری شرط:

پرویز صاحب نے قربانی کے جواز کو جس دوسری شرط سے مشروط کیا ہے، وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے: ''قرآن کریم نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کا مقام، خانہ کعبہ کو قرار دیا ہے اس لیے یہ قربانی حج کے مقام پر کی جائے گی۔'' (تفسیر مطالب الفرقان ج 3 ص 250)

جائزہ:

ہدی، نسک اور نحر کا باہمی فرق:

افسوس ہے کہ پرویز صاحب، بزعم خویش، عمر بھر قرآن کے تحقیقی مطالعہ میں مستغرق رہنے کے بعد بھی یہ نہ جان پائے کہ قرآن نے کعبہ میں کی جانے والی قربانیوں اور خارج از کعبہ دیگر مقامات پر کی جانے والی قربانیوں میں فرق کیا ہے۔ اوّل الذکر قربانیوں کے لیے قرآن ''ہدی'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ خواہ یہ کسی جنایت کی پاداش کے طور پر ہو یا حج کے لازمی عمل کی حیثیت سے ہو جبکہ ثانی الذکر قربانیوں کے لیے وہ ''نسک'' اور ''نحر'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ البتہ ''نسک'' کے لفظ کا اطلاق خارج از حرم قربانیوں کے علاوہ اُس ''خون'' پر بھی کیا جاتا ہے جو کسی مجبوری کے باعث، سر منڈوا دینے پر بطور شکرانہ کے واجب قرار پائے۔ اگر کوئی قربانی، مرض یا تکلیف رأس کے باعث مجبوراً سر منڈوا دینے کے باعث لازم قرار نہیں پائی تو اس کا مقام خارج از کعبہ ہے جبکہ ''ہدی'' خاص طور پر اس قربانی کو کہا گیا ہے، جس کا مقام و محل بیت العتیق ہے۔ قرآن پاک کی درج ذیل آیات اس پر شاہد ہیں:

1۔ ''فان احصرتم فما استیسر من الھدی ولا تحلقوا رءوسکم حتّٰی یبلغ الھدی محلہ'' ترجمہ: ''اور اگر تم گھر جاؤ تو جو ''ہدی'' (حرم میں کی جانے والی قربانی) میسر آئے، اسے اللہ کے حضور پیش کر دو اور سر نہ منڈواؤ یہاں تک کہ ''ہدی'' اپنے ٹھکانے پہنچ جائے۔'' (البقرہ: 196)

2۔ ''ھم الذین کفروا وصدوکم عن المسجد الحرام والھدی معکوفا ان یبلغ محلہ''۔ ترجمہ: ''وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ''ہدی'' کے جانوروں کو قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔'' (الفتح 25:)

3۔ ''ھدیا بالغ الکعبۃ'' ترجمہ: ''یہ قربانی کعبہ میں پہنچنے والی ہو۔'' (المائدۃ: 95)

ان آیات میں اس امر کی تصریح ہے کہ ''ہدی'' سے مراد وہ ''قربانیاں'' ہیں، جن کا مقام و محل حرم کعبہ ہے۔ ان آیات کے علاوہ یہ لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے ''حرم کی قربانیوں'' ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ الغرض قرآن کریم نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ''ہدی'' کا اطلاق صرف ان قربانیوں پر ہوتا ہے جو حدود حرم میں کی جائیں اور ''نسک'' و نحر'' مطلق قربانی کو کہتے ہیں ''نسک'' کے کعبہ میں کئے جانے کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ یہ قربانی اس رعایت کے شکریے کے نتیجہ میں واجب ہو جبکہ حالت مرض یا تکلیف رأس کے باعث وہ سر نہ منڈوانے کی پابندی پر قائم نہ رہ پائے (یہ بہر حال ایسی مجبوری ہے جو اس کے ارادہ و اختیار سے اس پر وارد نہیں ہوئی)

جب جبکہ قرآن کریم، درون حرم اور بیرون حرم کی جانے والی قربانیوں میں واضح فرق و امتیاز قائم کرتا ہے، تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان فروق و امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر یہ حکم جاری کرے کہ ہدی کی قربانی ہو یا نسک و نحر کی قربانی، ہر ایک کا مقام کعبہ ہی ہے۔ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ لغات عرب بھی ان دونوں قسم کی قربانیوں میں فرق و امتیاز کرتے ہوئے، صرف ''ہدی'' کو مقام حرم سے وابستہ کرتی ہیں۔ خود پرویز صاحب لکھتے ہیں: ''هدی اور هدی اس جانور کو کہتے تھے جو حج کے موقع پر بیت اللہ پر ذبح کرنے کے لیے لے جاتے تھے۔'' (لغات القرآن ص1756)

اور یہ فرق اتنا واضح فرق ہے کہ عرف عام میں بھی اس کو ملحوظ رکھا جاتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''للہ علی الھدی'' (مجھ پر اللہ کے لیے ''ہدی'' لازم ہے) تو ہر شخص یہی سمجھے گا کہ قائل پر ایسی قربانی لازم ہے جو حرم کعبہ میں کی جائے گی، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''للہ علی النسیکۃ'' (مجھ پر خون لازم ہے) تو ہر شخص یہی سمجھے گا کہ جو خون یا قربانی قائل پر لازم ہے وہ جہاں چاہے کر دے، حرم میں ان کا کرنا لازم ہے

اور واجب نہیں ہے۔ لہٰذا پرویز صاحب کا ہر قسم کی قربانی کے متعلق یہ شرط عائد کرنا کہ اسے حرم کعبہ ہی میں کیا جائے، نہ صرف یہ کہ خلاف قرآن ہے بلکہ لغات عربیہ کے بھی خلاف ہے۔

پرویز صاحب کے مؤقف کا باطل اور بے بنیاد ہونا اس امر سے بھی واضح ہے کہ اگر ہر قسم کی قربانی کا مقام و محل کعبہ ہی ہو تو مدینہ میں اہل ایمان کے لیے عین یہودیوں کے گڑھ میں ''اونٹ ذبح کرو'' کا حکم بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ مدینہ میں یہودیوں کا زور تھا اور مدینہ ہی میں اونٹ ذبح کرنے سے ان کی مخالفت لازم آتی تھی۔ مقام حرم میں تو ہر قسم کی قربانی عہد جاہلیت ہی سے ہوتی آئی تھی، اسلیے مسلمان اگر ''وانحر'' کی اطاعت مدینہ میں نہیں کرتے تھے اور صرف حدود حرم میں ہی کرتے تھے تو ایسی مخالفت قطعی بے فائدہ اور بے اثر ہے۔ آپ خود سوچیئے کہ ہندوؤں کے ہاں گائے کی قربانی ممنوع ہے، جبکہ مسلمانوں کے ہاں حلال و جائز ہے، اب اگر مسلمان ہنود کی مخالفت میں گائے کی قربانی بھارت میں کرنے کی بجائے بیرون ہند کرتے پھریں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟

قربانی پر پرویز صاحب کی تیسری شرط اور اس کا جائزہ:

قربانی کو پرویز صاحب نے جس تیسری شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے، وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے: ''قرآن کریم نے بالتصریح کہا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کا گوشت تم خود بھی کھاؤ اور وہاں کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ، لہذا صرف اتنے اونٹ ذبح کئے جائیں گے جن کا گوشت کھانے کے کام آسکے، بنا بریں جس طرح آج کل حج کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں ذبح کر کے زمین میں دبا دی جاتی

ہیں اور تمام دنیا میں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں، قرآن کریم سے اس کی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔" (تفسیر مطالب الفرقان ج3 ص250)

پرویز صاحب کی اس شرط کا جائزہ ہم کئی پہلوؤں سے لے رہے ہیں۔

1۔ سب سے پہلی بات تو یہ غور طلب ہے کہ انہوں نے حج کے عالمگیر اجتماع میں قربانیوں کا مقصد محض "ضیافت خوری" قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کی ساری گفتگو کا مرکزی نقطہ یہی قرار پاتا ہے کہ جب "اجتماعِ حج" "ایک" "گوشت خوری" کی پارٹی ہے تو اس پارٹی میں اتنے ہی جانور ذبح کئے جانے چاہئیں جو افراد، اجتماع کے پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوں۔ انہوں نے اپنے اس نقطہ نظر کی کئی جگہ وضاحت کی ہے: "نمائندگان ملت اسلامیہ کے عالمگیر اجتماع میں ہدی کی قربانی اس لیے ہے کہ وہاں وہ لوگ ایک دوسرے کی دعوت کریں۔" (قرآنی فیصلے ج1 ص138)

(یہ عامۃ المسلمین کا اجتماع ہے یا ان کے نمائندگان کا؟ اس پر بحث پھر کسی موقع پر ہو گی۔ ان شاءاللہ) ایک مقام پر "مشعر الحرام" کی تشریح کرتے ہوئے جناب پرویز صاحب رقمطراز ہیں: "مشعر کے معنیٰ ہیں وہ مقام جہاں عقل و شعور کی رو سے معاملات پر بحث و تمحیص کی جائے۔ اور چونکہ ان معاملات کا تعلق نظامِ خداوندی سے ہو گا اس لیے اسے حرام یعنی واجب الاحترام بھی قرار دیا۔ یہاں یہ نمائندگان حسب ضرورت دو یا تین دن قیام کریں گے، اس پروگرام کی عملی جزئیات اور ان کے سلسلہ میں باہمی تعاون و تناصر کے سلسلے میں بحث و تمحیص بھی ہو گی اور ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی۔۔۔ آج دوپہر کا کھانا نمائندگان پاکستان کی طرف سے، رات کا کھانا اہل افغانستان کی طرف سے (وقس علی ذالک) ان ضیافتوں

کے لیے وہ جانور ذبح ہوں گے جنہیں یہ لوگ اسی مقصد کے لیے ساتھ لائے تھے یا جو دوسرے لوگوں نے تحفۃً بھیجے تھے۔۔۔" (تفسیر مطالب الفرقان ج3 ص 241)

جناب پرویز صاحب کے نزدیک حج کا اجتماع، ''گوشت خوری'' کی ایک ''بین الاقوامی پکنک پارٹی'' ہے۔ جبکہ ہمارے نزدیک یہ اجتماع، سراسر ایک تعبدی امر ہے۔ جس میں دنیا بھر کے مسلمان بیت اللہ کا قصد کر کے آتے ہیں۔۔۔اور یہی بات قرآن کریم نے بھی بیان فرمائی ہے: ﴿وَلِلَّـهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا... ٩٧﴾...آل عمران ''اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔'' نیز فرمایا:

﴿وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾﴾...ترجمہ: ''اور چاہیئے کہ وہ اس قدیم گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔'' الحج

پھر حضرت ابراھیمؑ کی سنت کی پیروی اہل ایمان کو اسی جگہ قربانی کا بھی حکم دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّـهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ... ٣٤﴾...ترجمہ: اور جب یہ قربانی دے لیں تو پھر اس میں سے وہ خود بھی کھائیں اور تنگ دست فقراء کو بھی کھلائیں۔ الحج۔۔

الغرض، قربانیوں کا اصل مقصد، رضائے الٰہی کی طلب میں خلیل اللہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے خدا کی عطا کردہ حیوانی دولت کو اسی کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ کھلانا اور کھانا وہ اولین مقصد نہیں ہے جس کے لیے یہ قربانی لازم کی گئی ہے جیسا کہ پرویز صاحب نے سمجھا ہے۔ یہاں (بیت اللہ میں) آنے کا مقصد ذبیحوں کے ذریعہ اور دیگر مناسک حج کی ادائیگی کے ذریعہ رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی کا حصول ہے۔ لہذا یہاں

اصل اور بنیادی حیثیت اس بات کو حاصل نہیں ہے کہ کتنے لوگوں کے کام و دہن کی لذت کا سامان فراہم کیا گیا؟ بلکہ اس بات کو حاصل ہے کہ طلبِ رضاءالہی میں کتنی قربانیاں دی گئیں اور کس خلوص وللہیت سے دی گئیں؟

2۔حج میں ہر شخص قربانی کرتا ہے۔عام حالات میں اگر ہر شخص ایک ایک قربانی بھی کرے تو بھی گوشت اس قدر ہو جاتا ہے کہ شکم سیری کے بعد بھی بچ جاتا ہے۔اس بچے ہوئے گوشت کو دیکھ کر خدا کے حکم میں ترمیم کرتے ہوئے بعض لوگوں پر سے اس قربانی کو ساقط نہیں کیا جا سکتا، جسے خدا تعالیٰ نے شعائر اللہ قرار دیا ہے،اور جسے توحید فی العبادت اور توحید فی الاعتقاد کا سبب قرار دیا ہے۔قربانی کے گوشت کو شکم سیری کی روشنی میں، معاشی ترازو میں تول کر نہیں دیکھا جائے گا، بلکہ اعتقاد و عبادت کے اس ترازو میں وزن کر کے دیکھا جائے گا جو توحید ربوبیت اور توحید عبودیت کا سبب و ذریعہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے قربانی اور توحید کو مقرون و متحد کر کے پیش کیا ہے: وَلکلِ اُمَّۃٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَكًا لِّيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِيۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ‌ؕ فَاِلٰهُكُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسۡلِمُوۡا..الحج. ۳٤... "ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی (یا طریق عبادت و قربانی) کا ایک طور طریقہ ٹھہرایا تاکہ وہ ان چوپایوں پر اللہ کا نام لے کر ذبح کریں جو اس نے ان کو عطا فرمائے ہیں۔ سو تمہارا الٰہ وہی ایک الٰہ ہے، سو تم اسی کے سامنے جھکو۔" (ترجمہ از غلام احمد پرویز۔ معارف القرآن ج1ص16)

3۔عین حج کے موقعہ پر حرم پاک میں روئے زمین سے آنے والے حاجیوں کا مشغولِ عبادت ہونا اور ان ہی دنوں میں خارج از حرم پوری امت کا نسک و نحر کے ذریعہ ان کا شریک حال ہونا، ان میں ایک ہی دین و ملت اور ایک ہی تہذیب و ثقافت کے علمبردار ہونے کا وہ جذبہ و احساس پیدا کرتا ہے، جس کے مقابلے میں

ہر مادی نقصان ہیچ ہے، صرف اسلام ہی نہیں، ہر قوم کے قومی تہوار، افراد قوم میں وحدت کا وہ شعور پیدا کرتے ہیں جو ان کے قومی تشخص کو اجاگر کرتا بلکہ نشو و نما دیتا رہتا ہے۔ اس قیمتی شعور و احساس کو معاشی اخراجات کے گز سے نہیں ناپا جا سکتا۔ آج مسیحیت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ مسیحی افراد وطنی، لونی، لسانی، نسلی اور معاشی طور پر کئی ایک طبقوں اور حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ شاید ان کے درمیان (مسیحیت کے نام کے علاوہ) کوئی قدر مشترک عملا باقی نہیں ہے، ماسوا اس تہوار جو وہ "کرسمس" کے نام پر مناتے ہیں۔ سال بھر کے بعد، یہ تہوار اگر روئے زمین پر پھیلے ہوئے تمام عیسائیوں میں ایک مذہب و ملت کے افراد ہونے کا احساس پیدا کر دیتا ہے تو ان کے ہاں یہ احساس ایسی نعمت گرانمایہ ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں اس پر اٹھنے والے مصارف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اگر آپ کسی مسیحی سے یہ کہیں کہ۔۔۔ "جناب آپ اس تہوار پر جس قدر رقم خرچ کرتے ہیں اسے آپ رفاہ عامہ کے کام میں صرف کر کے اپنی قوم کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں، لہذا اس تہوار کو منانا چھوڑ دیں"۔۔۔ تو وہ آپ کی معاشی میزان میں تلی ہوئی اس نصیحت کو آپ کے منہ پر دے مارے گا۔ ہندوؤں سے زیادہ زر پرست اور روپے پیسے پر جان دینے والی قوم کون سی ہو سکتی ہے؟ یہ لوگ بھی اپنے تہواروں پر اٹھنے والی رقوم کو اقتصادیات کے ترازو میں تولنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں، کیونکہ یہ تہوار ان میں یکجہتی کا احساس اور وحدت کا شعور پیدا کرتے ہیں، لیکن ہمارے مہربان یہ وعظ فرماتے نہیں تھکتے کہ: "ہر سال جتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں اگر ان کی قیمت حکومت کے حوالہ کر دی جائے تو سینکڑوں رفاہ عامہ کے کام ہو سکتے ہیں۔"

4۔ رہا پرویز صاحب کا یہ فرمان کہ "جس طرح آج کل حج کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں ذبح کر کے زمین میں دبا دی جاتی ہیں۔۔۔" تو یہ بھی ان کی لاعلمی تھی۔ آج ہر شخص حج پر جا کر خود دیکھ سکتا

ہے کہ پرویز صاحب کے اس بیان میں صداقت و حقیقت کا کتنا عنصر پایا جاتا ہے۔ تضیعِ لحم کے بارے میں وہاں سرے سے یہ بات ہے ہی نہیں جو ''مفکرِ قرآن' صاحب نے بیان کی ہے۔ ممکن ہے ماضی میں کبھی ایسا ہوا ہو، مگر اب تو دورِ حاضر کے جدید ترین وسائلِ نقل و حمل نے اس گوشت کو آن کی آن میں دنیا بھر کے مستحقین تک پہنچانے کا بندوبست کر ڈالا ہے۔ گزشتہ سال (1986، یہ تحریر 1987 میں لکھی گئی) جو لوگ حج سے فارغ ہو کر آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حجاج کرام کی ضروریات سے فاضل گوست کو فضائی سروس کے ذریعہ افغان مہاجرین تک پہنچا دیا گیا تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض قربانی کا گوشت وہاں واقعی ضائع ہی ہو رہا ہو، تب بھی ایک مسلمان کے لیے۔۔۔ بشرطیکہ وہ حقیقتا مسلمان ہو۔۔۔ یہ کہاں جائز ہے کہ وہ اس بات کو ''قربانی'' کے عدمِ جواز کا بہانہ بنا ڈالے جس کو اللہ تعالیٰ نے ''شعائر اللہ'' قرار دیا ہے، جس کے متعلق قرآن مجید نے ''لکم فیھا خیر'' (الحج:36) کہا ہے اور جس کے کر ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے قربانیوں اور ذبیحوں کو کہیں بھی عید الاضحیٰ کے ساتھ منتھی نہیں کیا ہے

''قربانی'' پر، پرویز صاحب نے اپنے اس اعتراض کو مختلف انداز میں بہت تکرار کے ساتھ دہرایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: قرآن کریم نے قربانیوں اور ذبیحوں کو کہیں بھی عید الاضحیٰ کے ساتھ منتھی نہیں کیا ہے، پھر آپ ہر گلی کوچے میں عید الاضحیٰ کے موقعہ پر یہ قربانیاں کیوں کرتے ہیں؟ (خلاصہ عبارت قرآنی فیصلے و تفسیر مطالب الفرقان)

اس اعتراض کا جواب تو بہت تفصیل سے دیا جا چکا ہے، مگر یہاں پرویز صاحب کے مزاج کا ایک اور رنگ ملاحظہ فرمائیے اور یہ بھی دیکھئے کہ قربانی کی مخالفت کا جذبہ، ان کے حواس و مشاعر پر کس قدر غلبہ پا چکا ہے؟

ورنہ وہ قرآنی نقطہ نظر سے ''قربانی'' کو ''عید الاضحیٰ'' کے ساتھ وابستہ کرنے میں ہم پر کیا اعتراض کرتے، بلکہ خود ہمارے اس اعتراض کی زد میں آجاتے کہ ''آپ ''عید الاضحیٰ'' کے وجود کو تسلیم کر کے ''اضحیٰ'' کا انکار کیسے کرتے ہیں؟''

غور فرمایئے! پرویز صاحب ''قربانی'' کے تو قائل نہیں ہیں۔ مگر نفس ''عید الاضحیٰ'' کے قائل ہیں۔ جب وہ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ۔۔۔ ''آپ قربانی کو عید الاضحیٰ کے ساتھ مقرون کیوں کرتے ہیں؟''۔۔۔ تو ان کو ''عید الاضحیٰ'' کے وجود پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، مگر ''اضحیٰ'' پر وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسے ''قربانی کی عید'' کے ساتھ وابستہ کیوں کیا جاتا ہے؟ حالانکہ قرآن کریم میں نہ تو عید الاضحیٰ ہی کا وجود ہے اور نہ ہی عید الفطر کا (ملاحظہ ہو قرآنی فیصلے ج 1 ص 85 اور ص 158) اور نہ ہی نفس ''عید الاضحیٰ'' کا وہ انکار کرتے ہیں (حالانکہ ان میں سے کسی کا وجود قرآن کریم سے ثابت نہیں ہے) مگر وہ عیدین کے وجود کو تسلیم کر کے ان کے ساتھ وابستہ ایک عمل (قربانی) کا انکار کرتے ہیں جبکہ دوسرے عمل (صدقۃ الفطر) کا اقرار فرماتے ہیں۔۔۔ آخر اس ثنویت کی کیا قرآنی دلیل ہے؟

فکرِ پرویز سے وابستہ افراد سے ہماری گزارش یہ ہے کہ اگر آپ قرآن کی بنیاد پر قربانی کا انکار کرتے ہیں تو ''قربانی'' سے پہلے ''عید الاضحیٰ'' کا انکار کیجئے، اسی طرح عید الفطر اور صدقۃ الفطر کا انکار کیجئے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی از روئے قرآن ثابت نہیں ہے، لیکن اگر آپ ان کو نومولود کے کان میں اذان دینے، عقیقہ کرنے، ختنہ کرنے اور میت کو غسل دینے اور کفن پہنانے وغیرہ جیسے اعمال کی طرح ''معاشرتی امور'' قرار دے کر برقرار رکھتے ہیں (جیسا کہ قرآنی فیصلے ج اول ص 219 پر لکھا گیا ہے، حالانکہ ان میں سے کسی چیز کا وجود بھی قرآن سے ثابت نہیں ہے) تو اسی طرح ''قربانی'' کو بھی ایسا ''معاشرتی امر''

دے کر برقرار رکھا جا سکتا ہے، جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت میں جاری فرمایا تھا۔۔اور باوجود اس کے کہ اس عمل کا اجراء دورِ نزول قرآن میں ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے کہیں اس کی تردید نہیں فرمائی۔

استفادہ تحریر مسئلہ قربانی قرآن کی روشنی میں از پروفیسر محمد دین قاسمی، ماہنامہ محدث

کیا زمین مچھلی کی پیٹھ پر ہے ؟

منکرین جدید ایک روایت بے بنیاد کو بنیاد بنا کر العیاذ باللہ بخلاف حقیقت کہتے ہیں کہ اسلام بھی ہندو مذہب کی طرح من گھڑت اعتقادات پر مبنی دین ہے اور چند روایت جو

)ن والقلم بما یسطرون(

میں ''نون'' کی تفسیر میں کہیں کہیں مذکور ہیں انکا حوالا دیکر اپنی بگڑی بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

وہ روایات یوں ہیں کہ :

فقد ورد عن ابن عباس رضي الله عنهما أنه قال: (أوّل ما خلق الله من شيء القلم، فجرى بما هو كائن، ثم رفع بخار الماء، فخلقت منه السماوات، ثم خلق ''النون'' 150 يعني الحوت – فبسطت الأرض على ظهر النون، فتحرّكت الأرض فمادت ، فأثبت بالجبال ، فإن الجبال لتفخر على الأرض) ، قال : وقرأ : (ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ)1

ترجمہ:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک نے جو چیز سب سے پہلے پیدا فرمائی وہ قلم ہے، پس وہ اپنے وجود کے ساتھ چل پڑا، پھر پانی کے بخارات بلند ہوئے پس اس سے

تمام آسمان بنائے گئے، پھر نون یعنی مچھلی کو پیدا کیا گیا، پس زمین کو مچھلی کی پیٹھ پر بچھایا گیا تو زمین نے حرکت کی تو پہاڑوں کے ذریعے اسکو تھاما گیا بیشک پہاڑ زمین پر تفخر کی علامت ہیں۔ پھر پڑھا:

)ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ(

اسی طرح سے

ایک روایت کا ترجمہ یوں ہے کہ:

راویوں کا بیان ہے کہ جب اللہ پاک نے زمین کو پیدا فرمایا تو عرش کے نیچے اک فرشتے کو مقرر فرمایا، تو وہ (فرشتہ) زمین کی طرف لوٹ آیا یہاں تک کہ وہ ساتوں زمینوں کے نیچے پہنچ گیا، اور زمین کے کندھے پر رکھ دیا اس طرح کہ ایک ہاتھ مشرق کی طرف ہوا اور ایک مغرب کی طرف، ہاتھوں کو پھیلائے پکڑ کو مضبوط کئے ہوے، پس ایسا کرتے ہوئے فرشتے کے قدموں کو ٹھرنے کی جگہ کوئی میسر نہ ہوئی، تو اللہ تعالی نے جنت سے ایک بیل کو بھیجا جسکے 40 ہزار سینگ ہیں اور چالیس پائے ہیں پس فرشتے کے قدموں کو بیل کے کوہڑ پر اللہ پاک نے ٹھہرایا تب بھی فرشتے کے قدم نہ ٹھہرے (العیاذ باللہ)، تو جنت سے اللہ پاک نے ایک اعلی قسم کا یاقوت لیا اسکو پانچ سو سال تک گاڑھا کرنے کے بعد اسکو بیل کے کوہڑ پر رکھا تب جا کر فرشتے کے قدم ٹھہرے (معاذ اللہ) اور اس بیل کے سینگ قرہ ارض کے قطر سے نکلے ہوئے ہیں، اور اسکے دونوں نتھنے سمندر کے اندر ہیں، اور وہ دن میں ایک بار سانس لیتا ہے، اسکے سانس لینے اور چھوڑنے سے سمندر میں مدو جزر پیدا ہوتا ہے۔ الخ۔۔۔'2

جواب:

1 (مذکورہ روایات من گھڑت اور موضوع ہیں جو دشمنان اسلام نے اسلام کو بدنام کرنے کی سازش کے لئے وضع کی ہیں۔ دیکھئے۔ نمبر: 3

اب اس مدلل اور معقول وآسان سے جواب پر لازماً یہ سوال ہو گا ملحدین کی طرف سے ہو گا کہ پھر اگر یہ روایات اس قدر ناقابل اعتبار ہی ہیں تو انکو تفسیر میں کیونکر جگہ دی گئی؟

لیجئے اسکا جواب بھی مدلل عرض کئے دیتے ہیں:

.ایک تو وہ ایڈیشن ہے جو دشمنان دین یہود و فارس کے زندیق لوگوں نے دین کو ملیامیٹ کرنے کی غرض سے کی، جنگ و قوت اور دلیل واستدلال کے میدان میں جب انکی پیش نا گئی تو انہوں نے مکر وفریب اور تلبیس کے حربے اختیار کر لئے۔

دوسری وہ من پسند خود تراشیدہ روایات ہیں جن کو انتہاء پسندانہ سوچ کے مالک لوگوں جیسے کہ شیعان علی نے انکی طرف منسوب کر لیا تھا حالانکہ وہ اس سے بریٔ تھے یا متقربین کے گروہ کی تراشیدہ روایات جو انھوں نے چاپلوسی اور دنیا طلبی کی غرض سے عباسی خلفاء کی مدح سرائی میں ان سے منسوب کیں۔

تیسرا پہلو صحیح اور غیر صحیح روایات کا باہم مکس اپ ہونا ہے، صحابہ وتابعین سے منسوب اقوال کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جسے بغیر اسناد کہ اور بنا سوچے سمجھے نقل کیا گیا جو بعد ازاں حق و باطل کے گڈ مڈ ہو جانے کا باعث ہوا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کسی نے کوئی رائے اختیار کی اور بنا سند کے اسے بیان کر دیا پھر اس کے

بعد والے نے اس خیال سے کہ اس کی کوئی اصل ہے اسے آگے نقل کر دیا حالانکہ اس کو چاہئیے تھا کہ اسکی تحقیق کرنے کی زحمت کرتا تاکہ معلوم ھوتا کہ دراصل اس قول کا قائل کون ہے۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ یہ روایات اسرائیلیات سے بھری پڑی ہیں جنمیں سے بعض تو ایسی خرافات ہیں جن کے بطلان پر دلیل موجود ہے اور بعض ایسی ظنی و تخمینی بنیاد کی حامل ہیں جن کو عقائد کے باب میں قبول کرنا ہی جائز نہیں۔

التفسير والمفسرون للدكتور محمد السيد حسين الذهبي (ت: 1398ه‍)-مكتبة وهبه (113/1)

اس کے بعد صرف تفسیر کے موضوع پر ایک یا ایک سے زیادہ اجزاء (رسائل) وجود میں آئے مثلا جزء ابی روق جو انکی طرف منسوب ہے، اور وہ تین اجزاء بھی جن کو محمد بن ثور ابن جریج سے روایت کرتے ہیں۔ پھر ان سے آگے تفسیر پر بڑی بڑی ضخیم تصنیفات وجود میں آئیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ وتابعین سے مروی اس تمام تفسیر کا مجموعہ تھیں جس جس تک ان کے مصنفین کی رسائی ہو سکی جیسا کہ تفسیر ابن جریر طبری ہے۔ لیکن قابل نوٹ بات یہ ہے کہ ابن جریر اور جو جو انکی نہج پہ چلے اگرچہ انہوں نے اسانید بھی ذکر کیں لیکن انھوں نے نقل وروایت میں بڑی فراخدلی اور کثرت سے کام لیا یہاں تک کہ اس میں بھی کمزور اور غیر ثابت روایات نقل ہو گئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل نوٹ ہے کہ ابن جریر اور تفسیر پر مستقل تصنیف کرنے والون میں جو انکی طرز پر چلے ان کے بعد بھی محدثین میں سے کچھ ایسے لوگ ہوئے جنھوں نے جہاں دیگر ابواب و موضوعات پہ احادیث جمع کیں وہیں تفسیر پر بھی انھوں نے الگ مستقل ابواب قائم کیئے۔

پھر ان کے بعد متاخرین کا دور آیا جنھوں نے اپنی کتب میں بنا اسناد کے اقوال و روایات جمع کر دیں اور کثرت سے تفسیری اقوال نقل کئے جس میں صحیح و ضعیف کے مابین امتیاز بھی نا برتا جس کے باعث ان کتب کے قارئین کا میلان ان کے مواد کی طرف سے کم ہو گیا کیونکہ اس میں جھوٹ و من گھڑت کا احتمال بہر حال موجود تھا جسکی کثیر مثالیں تفسیر میں مل جاتی ہیں۔

تفسیر روح المعاني للألوسي (ت: 1270ھ)- دار الکتب العلمیہ (27/15)

اور صاحب البحر کہتے ہیں؛ شاید ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں۔ مطلب نون کی تفسیر میں جتنے اقوال مذکور ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ماسوائے اس قول کہ کے وہ اسماء حروف میں سے ایک اسم ہے۔ اگر وہ ان مذکور روایات سے آگاہ ہیں تو گویا کے وہ نا تو حاکم کی تصحیح کو معتبر سمجھ رہے ہیں نا ضیاء کی روایت کو جو صحاح کے قریب تر ہے اور نا ہی ابن عباس سے روایت کرنے والوں کی کثیر تعداد کا اعتبار کر رہے ہیں۔ اور غالب گمان بھی یہی ھے کیونکہ اسکی مراد کی تعیین میں ان سے جتنا کچھ مروی ہے اس میں بہت اختلاف ہے۔ حتی کہ ان سے ایک روایت کے مطابق یہ لفظ الرحمن کا اخیر حرف ہے اور یہ عظیم نام مختلف اجزاء الرحم اور ن کی صورت میں پایا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اس سے مراد مچھلی یا جنت کی نھر لی جائے تو یہ اس قبیل سے ہوگا کم الخلیفہ والف باد نجانہ۔ اور اگر دوات مراد لی جائے تو تنکیر اس کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر جیسا کے زمخشری نے کہا کہ یہ لغت ثابت ہی نہیں، اور اسکی تردید تبھی ممکن ہے جب معتبر اہل فن سے اسکو ثابت کیا جائے جو ممکن نہیں ہے، اور صاحب قاموس کہتے ہیں اس کے معنی لغوی ہونے پر کوئی دلیل نہیں، اور روایات کی صحت میں اختلاف ہے اور جو شعر ابن عطیہ نے پیش کیا ہے وہ عربیت کے اعتبار سے ثابت نہیں۔ اور اسکو مچھلی کا معنی میں لے کر اسکا اطلاق مجازی طور پر دوات

پر کرنااس بنیاد پر کے ان میں مشابہت کا تعلق ہے کیونکہ بعض مچھلیوں سے ایک شدید سیاہ رنگ کا سیال خارج ہوتا ہے جو لکھنے میں کام آتا ہے ایسی توجیہ ھے جسکی رکاکت ظاہر ہے کیونکہ ایسی بعض مچھلیاں اتنی مشہور نہیں کہ انکو مشبہ بہ بنانادرست ہو اور جو اس خاص قسم کا ہی انکاری ہو اس کے لیئے تو اس میں کوئی دلالت سرے سے ہی نہیں۔ اور اسکا بمعنیٰ حرف ہو کر مچھلی سے مجاز بننا اور زیادہ بعید اور دور از کار تأویل ھے، ایسا کہا گیا ہے، اگرچہ بعض میں بحث و تحقیق کی گنجائش ہے اور قصہ گو لوگوں کے لئے اس باب میں بھت سی روایات دستیاب ہیں جن پر اعتماد تو در کنار ان پر کان دھرنا بھی بیکار ہے۔

حوالجات:

1 (أخرجه عبد الرزاق في "تفسيره" (307/2) وابن أبي شيبة (101/14) وابن أبي حاتم 150 كما في تفسير ابن كثير (210/8) 150 والطبري في "جامع البيان" (140/23) والحاكم في "المستدرك" (540/2)، وغيرهم كثير، جميعهم من طريق الأعمش، عن أبي ظبيان حصين بن جندب، عن ابن عباس به . وهذا إسناد صحيح. قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه، وقال الذهبي في التلخيص: على شرط البخاري ومسلم. كما ورد ذلك عن مجاهد ومقاتل والسدي والكلبي. وانظر: "الدر المنثور" (240/8)، وتفسير ابن كثير (185/8) في بداية تفسير سورة القلم.

2 (معالم التنزيل" (186/8) ونحوه في تفسير القرطبي (442/29)، وكلام كعب الأحبار رواه أبو نعيم في "حلية الأولياء" (8/6)، وعلق محققو تفسير القرطبي (385/1): كل من الدكتور عبد الله بن عبد المحسن

التركي، ومحمد رضوان عرقسوسي على هذا الأثر بقولهم: ''خبر إسرائيلي لا أساس له، وكان من الأَولى بالمصنف أن يُنزه كتابه عن مثل هذا'' انتهى

3 (شیخ ابو حیان رحمۃ اللہ علیہ نے ''ن'' کی مختلف تفاسیر ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان روایتوں میں سے ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے ''لعله لا یصح شيء من ذلك. تفسیر البحر المحیط

ہمیں اس روایت کو بیان کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے

جیسا کہ مفتی فرید رحمۃ اللہ علیہ نے فتاوی فریدیہ 485/1 میں اور مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ نے تحفۃ الالمعی 446/6 میں

(ایسی روایات کے بیان کرنے کے بارے) میں کہا ہے

مذکورہ روایت موضوع ہے۔ حوالے نیچے حاشیے میں ہیں 150

(2 /828) موسوعة الإسرائيليات والموضوعات لمحمد أحمد عيسى - دار الغد الجديد

(2 /828) موسوعة الإسرائيليات والموضوعات لمحمد أحمد عيسى - دار الغد الجديد

(4 /239) الإتقان في علوم القرآن للسيوطي (ت: 911هـ) - الهيئة المصرية العامة للكتاب

حضرت ابن عباس سے تفسیر میں تقریبا 100 احادیث ہی ثابت ہیں۔

ص:305)الإسرائیلیات والموضوعات في كتب التفسیر لمحمد بن محمد بن سویلم أبو شُھبة(ت:1403ھـ)
ـمکتبۃ السنۃ

ان روایات کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مضطرب طور پر منقول ہونا ہی ان پر اعتبار کو کمزور بنا دیتا ہے بالخصوص پہلا قول تو من گھڑت لگتا ہے یا شاید وہ اسرائیلیات میں سے ہے جسکو ان پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔

اس حوالہ سے ایک بڑے نقاد عالم امام حافظ ابن قیم الجوزیہ کا قول پیش خدمت ہے جو اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو خالص نقد و پرکھ کے اعتبار سے معروف ہے، وہ موضوع و من گھڑت احادیث پر گفتگو کرتے ہوے فرماتے ہیں''اور اسی قبیل سے وہ حدیث ہے جس میں ہے کہ سبز زمرد سے بنا ایک پہاڑ دنیا کو یوں احاطہ میں لئے ہوئے ہے جیسے کسی گلستان کو چار دیواری اور اس پہ آسمان اپنے کندھے ٹکائے ہوئے ہے۔

اور اسی قسم میں سے وہ حدیث بھی ھے جس میں ہے؛ زمین ایک چٹان پہ ٹھہری ہوئی ہے جو خود ایک بیل کے سینگ پر ٹکی ہوئی ہے تو جب کبھی بیل سینگ ہلاتا ہے تو چٹان میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ سب اہل کتاب کی وضع کردہ باتیں ہیں جو انھوں نے انبیاء کرام کے ساتھ استہزاء کے مقصد سے گھڑ لی تھیں۔

ص:113)الإسرائیلیات والموضوعات في كتب التفسیر لمحمد بن محمد بن سویلم أبو شُھبة(ت:1403ھـ)
ـمکتبۃ السنہ

تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرای میں غلطی کے اسباب

(لقد انتہی بعونہ تعالی)